خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
نومبر 2022
digest novels lovers group

آپ سے کیا پردہ

مجھ سے ملیے

انٹرویو

مکمل ناول

ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,440 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ——— 21000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 24000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

پکوان

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس

واٹس ایپ
03172266944

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com
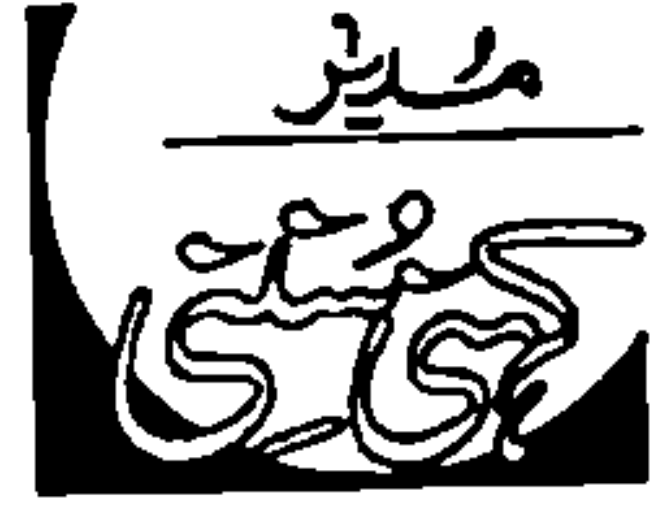
خواتین ڈائجسٹ نومبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

زندگی کی کہانی بھی میں ٹھہراؤ کہاں۔ زندگی ہر آن ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہر عہد کے ساتھ کہانیاں بدلتی ہیں، دریا راستے تبدیل کر لیتے ہیں، موسموں کے مزاج بدل جاتے ہیں۔ معاشرتی قدریں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اسی عہد نے جہاں انسان کو ادراک و آگہی کے نئے پہلوؤں سے روشناس کرایا، وہاں اسے ایک ان دیکھے خوف میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ ہم سب آنے والے لمحے سے لرزاں ایک خوف کی کیفیت میں زندہ ہیں۔

پریشانی، اداسی، مایوسی، ڈپریشن اس دور کا تحفہ ہیں۔ بدلتے موسم ویسے ہی دل کو اداس کرتے ہیں۔ اس پر سے پریشان کن خبریں۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی، ہم اب تک نفرتوں کے جھگڑوں اور لایعنی باتوں سے ہی نہیں نکل پائے ہیں۔

قدرتی آفات کے سامنے تو انسان بے بس ہے لیکن اس وقت جو حالات ہیں، انہیں کسی طور ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارا تو عجیب حال ہے، دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ چار قدم پیچھے چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ ہر تباہ حال معیشت ان حالات کی متحمل ہو سکتی ہے۔ کیا ان حالات میں مہنگائی اور بے روزگاری میں کمی آ سکتی ہے۔ ہمیں وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل سلیم سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول — دانہ پانی،
- نمرہ احمد کا ناول — مالا،
- راشدہ رفعت کا مکمل ناول — آخری پڑاؤ،
- فائزہ جمال طارق کا مکمل ناول — مہک کہ مہکے گلاب سارے،
- ہاجرہ ریحان، مریم انصاری، حمیرا قریشی، سیدہ حمیرا اللہ
  شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ سے ملاقات،
- باتیں یاسر پیرزادہ سے،
- کرن کرن روشنی — احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ازدواجی نفسیاتی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

ایصال ثواب کے مسنون طریقے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مرنے کے بعد انسان کے اعمال (کے ثواب کا سلسلہ) منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے جن کا ثواب میت کو پہنچتا رہتا ہے۔
1۔ صدقہ جاریہ
2۔ لوگوں کو فائدہ دینے والا علم
3۔ نیک اولاد جو میت کے لیے دعا کرتی ہے۔
(صحیح مسلم)

صدقہ جاریہ

دینی بھلائی کے کام "مسجد، دینی مدرسہ، مسافر خانہ یا شفاخانہ کی تعمیر، پانی پلانے کا انتظام، نیز سایہ دار یا پھل دار درخت لگانا۔ یہ سب صدقہ جاریہ ہیں جن کا اجر و ثواب انسان کو مرنے کے بعد از خود ملتا رہتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ فوت ہو گئیں تو سعد نے کہا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میری ماں فوت ہو گئی ہے۔ کیا میں اس کی طرف سے خیرات کر سکتا ہوں۔"
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں" عرض کی "کون سی خیرات بہتر رہے گی؟"
فرمایا۔ "پانی پلانے کا انتظام۔"
(مسند احمد)

اسی طرح دین میں جس نے کسی سنت کو زندہ کیا، اس کے لیے اس کا اپنا اور اس آدمی کا بھی اجر شامل ہوگا جو بعد میں اس پر عمل کرے۔ بعد والوں کے اپنے اجر میں کمی بھی نہیں ہوگی۔
(بحوالہ مسلم)

صدقہ جاریہ کی ایک اور شکل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، کی تلقین کرنا اور اس کی وصیت چھوڑ جانا

بھی ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں خواہشات کی پیروی کرنے والوں کے درمیان عقیدہ اور عمل کو اپنانے والے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے عمل پر پچاس آدمیوں کی طرح ثواب ملنے کی خبر دی تھی۔ اس پر ابو ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔

"اے اللہ کے رسول! کیا پچاس انہی میں سے؟"

آپ نے فرمایا۔

"نہیں، بلکہ تم میں سے کیونکہ (آج) نیکی کرنے میں معاون دستیاب ہیں۔ جوان کو دستیاب نہیں ہوں گے۔"

(سنن ابی داؤد)

لوگوں کو فائدے دینے والا علم

ایسا علم سکھا جانا جس پر بعد میں بھی درس وتدریس اور عمل کا سلسلہ جاری رہے خصوصاً قرآن اور دینی اصلاح کی تعلیم اور تربیت نیز دنیا میں انسانیت کی بھلائی کے امور میں مدد دینے والا علم بھی اس میں شامل ہے جیسے کوئی فائدہ مند سائنسی یا میڈیکل ایجاد وغیرہ جس سے لوگ نسل در نسل فائدہ اٹھاتے رہیں۔

علم کے حوالے سے دین کی نشرواشاعت کے کام بھی بہترین صدقہ جاریہ ہو سکتے ہیں۔ درحقیقت علم ایسا نور ہے جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ ہی وہ کبھی ختم ہونے والا ہے اسی لیے یہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی فائدہ دیتا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا۔

"حصول علم کے راستے پر چلنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔"

(مسلم)

مزید فرمایا۔

"بے علموں کو علم سکھانا صدقہ ہے۔"

(ترغیب)

ایک اور موقع پر علم وہدایت کی باتوں کو سیکھنے اور سکھانے کو زرخیز اور عمدہ زمین سے تشبیہ دی جو خود بھی سرسبز ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی اناج، گھاس، چارہ وغیرہ دیتی رہتی ہے۔ اسی لیے ایک اکیلے عالم کو شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ سخت بتایا گیا۔

عبدالرحمن بن غنم کہتے ہیں کہ مجھ سے دس صحابیوں نے روایت بیان کی ہے کہ ہم مسجد قبا میں بیٹھے علمی مذاکرہ کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہمیں دیکھ کر فرمایا "جتنا چاہو علم حاصل کرو مگر خدا ثواب اسی وقت عطا فرمائے گا جب اپنے علم پر عمل کرو گے۔"

(اسلامی خطبات جلد اول)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا "یا رسول اللہ! اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے علم کی باریکیاں بتا دیں۔" ارشاد ہوا۔

"تو پروردگار کی معرفت حاصل کر چکا؟" عرض کی۔

"جی ہاں۔" فرمایا۔

"پروردگار کے حقوق کہاں تک ادا کیے۔"

عرض کیا۔ "جہاں تک خدا کو منظور تھا۔"

فرمایا "موت کو بھی جان چکا ہے۔"

عرض کیا۔ "جان چکا ہوں۔"

فرمایا۔ "اس کے لیے تیاری بھی کر لی ہے؟"

عرض کیا۔ "جی ہاں جتنی خدا کو منظور تھی۔"

فرمایا۔ "جاؤ پہلے جڑ پختہ کرو (عمل کا آغاز کرو) پھر آنا ہم تمہیں باریک علم سے آشنا کر دیں گے۔"

(اسلامی خطبات جلد اول)

نیک اولاد جو میت کے لیے دعا کرتی ہے

میت کے لیے زندوں کی طرف سے نفع بخش چیز اس کے لیے دعائے استغفار کرنا ہے۔ جس طرح زندہ انسان کھانے پینے کے محتاج ہوتے ہیں اسی

طرح مردے دعا کے انتہائی محتاج ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ عزوجل جنت میں نیک آدمی کا درجہ بلند فرمائے گا تو آدمی عرض کرے گا۔ یا اللہ یہ درجہ مجھے کیسے حاصل ہوا؟ اللہ فرمائے گا "تیرے بیٹے نے تیرے لیے استغفار کیا تھا۔"

(مسند احمد)

اس کے علاوہ نیک اولاد کے اعمال کا ثواب بھی بغیر نیت کیے والد کو پہنچتا رہتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سب سے پاکیزہ تر کھانا جو تم کھاتے ہو اپنی کمائی سے ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی میں شامل ہے۔" (سنن ابی داؤد)

اولاد کو قرآن وسنت کا تابع بنا کر مرنے والا قیامت تک اس کی کمائی کو وصول کرتا رہے گا۔

جس کی اولاد نہیں اس کے لیے دعا کون کرے؟

گھر والے، دوست، پڑوسی، وغیرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہوتے ہیں۔ ان سب لوگوں کے ساتھ دکھ سکھ میں، ہمدردی اور اچھے تعلقات رکھنے چاہیں اور اگر ان میں سے کوئی وفات پا جائے تو انہیں نہ صرف اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں بلکہ ان کے اچھے کاموں کا دوسروں کے سامنے تذکرہ کریں اور ان کے برے کاموں یا زیادتیوں کو بھلا دیں۔ اگر آپ کے دل میں مرنے والوں کے لیے ایسے جذبات ہوں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی موت پر دوسروں لوگوں کے دلوں میں بھی آپ کے لیے ایسے ہی جذبات پیدا فرما دے گا اور یوں ان کی طرف سے آپ کی مغفرت کے لیے دعائیں آپ کی قبر میں، قیامت کے دن اور پل صراط پر فائدہ دیں گی اور جنت میں آپ کے درجات کی بلندی کا باعث بنیں گی۔ بے اولاد لوگوں کے لیے خصوصاً یہ نہایت کارآمد تجویز ہے۔

اہل دنیا کی دعاؤں کے منتظر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مردوں کے حق میں دعا فرمانا بہت سی احادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو بھی دعا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا۔

"ایک مسلمان جب اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کے لیے دعا کرتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے، اس آدمی کے پاس ایک نگراں فرشتہ ہوتا ہے۔ جب بھی آدمی اپنے بھائی کے حق میں دعا کرتا ہے تو نگراں فرشتہ آمین کہتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھے بھی ایسا ہی ملے۔" (نسائی)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قبر میں میت کی مثال ڈوبنے والے اور فریاد کرنے والے کی طرح ہے جو اپنے ماں باپ، بھائی یا کسی دوست کی دعا کا منتظر رہتا ہے۔ جب اسے دعا پہنچتی ہے تو اسے دنیا جہاں کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ بے شک اہل دنیا کی دعا سے اللہ تعالیٰ اہل قبور کو پہاڑوں کے برابر اجر عطا فرماتا ہے۔ مردوں کے لیے زندوں کی طرف سے بہترین تحفہ ان کے لیے استغفار کرنا ہے،" (بیہقی)

دعا سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت

تلاوت قرآن کو قبولیت دعا کا وسیلہ وسبب بنا کر میت کے لیے اللہ رب العزت سے مغفرت ورحمت طلب کرنا فائدہ مند ہوسکتا ہے، مگر قرآن کا "ختم" کرانا اور صرف مخصوص دنوں میں کرانا یا قرآن پہ قرآن ختم کرنے دوڑ میں حصہ لینا اور یہ سمجھنا کہ اس سے میت کو کوئی فائدہ پہنچے گا یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں۔

یہ کتاب ہدایت ہے اور ہدایت وعمل کی زندہ لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ مرنے والے پر عمل ہدایت کا دروازہ زندگی ختم ہونے کے ساتھ ہی بند

ہو جاتا ہے، اب اسے بخشش کے لیے زندوں کی طرف سے دعاؤں کی ضرورت ہے اور دعائیں اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے ناموں، بابرکت کلام اور نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر مانگی جائیں تو اس کے ہاں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ اس لیے قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور اتنی کرنا جتنی آسانی سے سمجھ کر اور عمدہ طریقے سے کی جاسکے۔ دعا کی مقبولیت کے لیے بہتر ہے۔ عبادت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور کثرت کے مقابلہ میں اخلاص کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔ خواہ ان کا تعلق قرآن ختم کرانے سے ہو یا تسبیحات پڑھنے سے۔

حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں گنتی کے ساتھ سوا لاکھ بار آیات کریمہ کا ورد نہیں کیا تھا، ایک ہی بار کہا تھا اور پورے اخلاص اور عاجزی کے ساتھ کہا تھا۔ اس لیے فوراً قبول فرما لیا گیا لہٰذا مسجد سے مولوی صاحب یا ان کے شاگردوں سے اجرت پر یا کھانے کی دعوت پر قرآن کا ختم کرانا بھی مسنون نہیں ہے اپنے قریب ترین اور پیارے عزیز جس چاہت اور اخلاق سے تلاوت اور دعا کر سکتے ہیں، اس جذبے سے یہ کام بھلا کوئی اور کیسے کر سکتا ہے۔

قرض چکانے میں مدد

اپنے اور میت کے لیے ثواب کے طور پر سب سے پہلے تو میت کے قرض کی ادائیگی کا معاملہ صاف کرانا ہے، اگر مرنے والا مقروض تھا اور اس کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ پورا ادا نہیں ہو پا رہا تو یہ اس کے ساتھ بڑی نیکی ہوگی کہ کوئی صاحب استطاعت عزیز یا کچھ وارث اور عزیز مل کر اس کے قرض کی ادائیگی کرا دیں تاکہ اس کی روح قرض کے ساتھ معلق نہ رہے اور اپنے مقدر کیے ہوئے مقام تک پہنچ جائے۔

حج کی نذر اور اللہ کا قرض

اسی طرح شرعی نذر (مرحوم نے اگر زندگی میں کوئی مانی تھی) جسے اللہ کا قرض کہا گیا ہے بھی وارث یا قرابت دار پوری کر دیں، وہ میت کے حق میں ثواب کا باعث ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ "میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی لیکن حج کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی کیا میں اس کی طرف سے حج ادا کروں۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہاں اس کی طرف سے حج ادا کرو۔" (یعنی اسے ثواب مل جائے گا) اور ہاں سنو! اگر تمہاری والدہ پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا کرتیں؟"

اس نے عرض کیا "جی ہاں۔"

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کا قرض (یعنی نذر) ادا کرو کیونکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس کا قرض ادا کیا جائے۔"

(صحیح بخاری)

زندہ والدین کی طرف سے بھی فرض حج یا نفلی نذر مانا ہوا حج (بوجہ کسی عذر وہ خود نہ کرسکیں تو) ادا ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ایسا کرنے والے نے خود اپنا فرض حج پہلے ادا کر لیا ہو۔

فضل (ابن عباس) رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے بوڑھے باپ پر حج فرض ہے لیکن وہ اونٹ پر سوار ہونے کی ہمت نہیں رکھتا۔" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اپنے باپ کی طرف سے حج ادا کرو۔"

(مسلم)

روزے

میت کی طرف سے اگر کوئی فرض روزے رہ گئے ہوں تو اس کی طرف سے ورثا روزے رکھ کر اس

کی مدد کر سکتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر فرض روزے رکھنے باقی ہوں، تو اس کا وارث روزے رکھے۔"

(صحیح بخاری)

قربانی

ایصال ثواب کے لیے میت کی طرف سے قربانی کرنے کی دلیل بھی ہمیں ایک حدیث مبارک سے ملتی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو مینڈھے ذبح کیے جو کہ سینگوں والے چتکبرے اور خصی تھے جب ان کو لٹایا تو فرمایا۔

"ترجمہ:" میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے۔ میں ابراہیم حنیف کی ملت پر ہوں اور مشرکوں میں سے نہیں، بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العزت کے لیے ہے۔ اے اللہ! یہ قربانی جو تیرا ہی عطیہ تھی، جسے تیری ہی راہ میں قربان کر رہا ہوں۔ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کی طرف سے قبول فرمایا۔" پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر دونوں مینڈھے ذبح فرما دیے۔

(امت میں اس وقت وہ لوگ بھی شامل تھے جو مسلمان ہو کر وفات پا چکے ہیں اور جو آنے والے ہیں)

(مسند احمد)

صدقہ و خیرات

میت کے ایصال ثواب کے لیے اس کی طرف سے صدقہ، خیرات کرنا بھی احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا" میری ماں اچانک فوت ہو گئی اور کوئی وصیت نہ کر سکی، ساتھ ساتھ میرا گمان ہے کہ اگر بول سکتی تو صدقہ کرنے کو کہتی، اگر میں صدقہ کروں تو اس کو اجر ملے گا اور ساتھ ساتھ مجھے بھی اجر ملے گا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہاں۔" تو اس نے اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کیا۔"

(صحیح بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا باپ فوت ہو گیا ہے، کوئی وصیت بھی نہیں کی، اگر میں اس کی طرف سے خیرات کروں تو کیا یہ اس کی کوتاہیوں کا کفارہ بنے گی؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں۔"

(صحیح مسلم)

عاص بن وائل سہمی نے وصیت کی کہ اس کی طرف سے سو غلام آزاد کر دیے جائیں اس کے بیٹے ہشام نے پچاس غلام آزاد کر دیے اس کے دوسرے بیٹے عمرو نے باقی پچاس غلام آزاد کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے سوچا کہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لوں چنانچہ اس نے حاضر ہو کر دریافت کیا کہ" میرے بھائی نے پچاس غلام آزاد کر دیے، اب میرے ذمے پچاس باقی ہیں کیا میں اپنے والد کی طرف سے ادا کر دوں؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اگر وہ مسلمان تھا پھر تم چاہے اس کی طرف سے غلام آزاد کرو، صدقہ کرو یا حج کرو، سب کا اجر اسے مل جائے گا۔"

☆☆

دو لفظ سے حوالات میں

انشاجی

جنگ میں گزشتہ ہفتے ہمارے عزیز دوست جمیل الدین عالی (دوہوں والے، تماشا مرے آگے والے) نے اپنے ناطقہ کو سر بہ گریباں کرتے ہوئے ایسا رقت انگیز کالم لکھا ہے کہ جدھر جایئے خلقت زار و قطار رو رہی ہے۔ سارا شہر دیوار گریہ بنا ہوا ہے۔ لیاری کی جھگیاں بہ گئی ہیں اور محرم کی مجلسیں ماند پڑ گئی ہیں۔ ہم دوسروں کو کیا کہیں، ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ یہ مضمون ہم لکھ نہیں رہے۔ ایک کرم فرما سے لکھوا رہے ہیں کیونکہ ہمارے ہاتھ خالی نہیں۔ ایک تولیہ اس ہاتھ میں ہے، ایک اس میں۔ بولتے جاتے ہیں اور اپنی اشک شوئی کرتے جاتے ہیں۔ ہم دوآبے کے رہنے والے ہیں لیکن ایسا دوآبہ نہ دیکھا تھا۔

اس میں کچھ تاثیر موضوع کی بھی ہے۔ ان کا یہ کالم علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں ہے اور خود علامہ مرحوم کے متعلق سب ہی وقائع نگار متفق ہیں کہ بات بات پر رو دیا کرتے تھے۔ جہاں قوم کا نام آیا، ان کی آنکھوں سے اشکوں کا چشمہ رواں ہوا۔ عالی صاحب کا کالم جواب کے ذرا دھندلا دھندلا چھپا ہے۔ اس کی وجہ بھی مشین کی خرابی نہیں، لکھنے والا کاتب بھی صاحب دل تھا۔ اس کے آنسو لکھتے میں کاغذ پر ٹپکتے گئے اور سیاہی پھیلتی گئی۔ مشین مین نے اسے درست کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی پڑھا لکھا تھا۔ قوم کا درد دل میں رکھتا تھا۔ سیاہی کو مزید پھیکا کرنے میں کچھ حصہ اس کا بھی سمجھیے۔

عالی صاحب پہلے سیدھا سیدھا کالم لکھا کرتے تھے۔ مطلب اخذ کرنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن پڑھنے والوں نے کہا کہ جناب آج کل اتنی فرصت کسے کہ پڑھے بھی اور اس کا مطلب بھی سوچے۔ آج کل تو کالجوں، یونیورسٹیوں تک میں خلاصوں کے ذریعے اور امتحان گیس پیپروں کی مدد سے دیے جاتے ہیں۔ آپ بھی اپنی بات کا خلاصہ آخر میں ایک دو تین نمبر ڈال کر لکھ دیا کیجیے۔ آخر حکایات لقمان والے لقمان اور گلستان سعدی والے سعدی بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ آج تک کسی نے اعتراض نہ کیا کہ قارئین پر کند ذہنی کا گمان کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کے عالی صاحب نے اپنے کالم کے آخر میں ضروری نکات مفید مشوروں کی صورت میں رقم کر دیے اور یہ کام ایسا ہے کہ اس میں ان کا حریف کوئی نہیں۔ ان کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے، مفت مشوروں سے خالی نہیں ہوتی۔ گھوڑے پر سوار مولوی صاحب کی طرح مشورہ دیا اور آگے چل دیے۔ ہم نے کئی بار عرض بھی کیا کہ رک کر دیکھ لیا کیجیے۔ آپ کے مشورے کا نتیجہ کیا ہوا، کیا گل کھلا لیکن۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کراچی کے یوم اقبال کی عدیم المثال کامیابی سے خوش ہو کر انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ جس طرح آج کل بینکوں والے آئے دن قصبوں اور قریوں میں ایک دوسرے کی ضد میں شاخیں کھول رہے ہیں۔ خواہ وہاں کوئی اکاؤنٹ کھولنے والا ہو یا نہ ہو، اسی طرح آئندہ یوم اقبال کی بھی شاخیں قائم کی جائیں۔ یعنی آئندہ یوم اقبال ہر ڈویژن، ہر ضلع، ہر تحصیل، ہر تھانے اور ہر گاؤں میں منایا جائے۔ اس سے قطع نظر کہ وہاں اقبال کو جاننے اور سمجھنے والا کوئی ہے کہ نہیں۔ یہ وغیرہ رضا کارانہ طور پر منانے کی عملی دقتوں سے واقف ہونے کی وجہ سے انہوں نے فرمایا ہے کہ یوم اقبال منانا ہر مقامی حاکم کا ایک غیر سرکاری فرض قرار دے دیا جائے۔ بس اتنا سا سرکاری مراسلہ جاری کر دیا جائے کہ مقامی حکام تقریبات اقبال کی ہمت افزائی کریں پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

یہ بات ہمارے بھی تجربے میں آئی ہے، جہاں کوئی کمشنر یا ڈپٹی کمشنر ادب سے دلچسپی رکھنے والا آیا، سارا ضلع اشعار اور استعاروں میں باتیں کرنے لگا، بنیادی جمہوریتوں والے بھی غزلیں کہنا اور رسالے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہر روز کسی نہ کسی کا یوم ہے۔ چونکہ سال میں صرف تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں، لہٰذا بعض شاعروں اور ادیبوں کے نام تھم زد بھی کرنے پڑتے ہیں کیونکہ ایک دن میں ایک سے زیادہ آدمیوں کا یوم منانا کچھ بھلا نہیں لگتا۔ ایک ضلع میں ہم ایک کام سے گئے۔ دیکھا کہ ایک گاؤں میں جھنڈیاں لگی ہیں اور لوگ دیگیں پکا رہے ہیں۔

ہم نے کہا کہ کسی کی شادی یا عرس ہے، کیا ہے؟

معلوم ہوا۔ نہیں، حضرت ملنگ گڑ گانوی کا یوم ہے۔ ایک صاحب جو پیش پیش تھے، ہم نے روک کر پوچھا کہ "یہ کون صاحب تھے۔ کیونکہ ہم گڑ گاؤں میں رہے ہیں، ان کا نام نہیں سنا۔"

کہنے لگے۔ "سنا تو ہم نے بھی نہیں لیکن اوپر سے حکم آیا ہے۔ سنا ہے ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیگم کے ماموں تھے۔ کلام ان کا چھپا نہیں۔ رسالوں والے متعصب تھے۔ چھاپتے ہی نہ تھے۔ ورنہ شاعر سنا ہے اچھے تھے۔ آج ہم ان کی یاد تازہ کریں گے۔ قوالوں سے ان کی غزلیں گوائی جائیں گی اور جو چندہ گاؤں والوں نے تھانیدار صاحب کو رضاکارانہ طور پر دیا ہے۔ اس سے ملنگ مرحوم کا دیوان چھاپا جائے گا۔"

اندریں حالات ہماری سفارش ہے کہ اگر ادب کی ترقی مطلوب ہے تو آئندہ کسی کو یہ گرضلع مقرر کرتے ہوئے دیکھ لیا جائے کہ وہ شاعر ہے۔ شاعر نہیں ہے تو نہیں۔ بیوی شاعرہ ہو۔ نہ ہو تو بیچے۔ اب میں تو بہار آتی ہے سب لوگ کچھی پاڑی آپ پٹی وغیرہ چھوڑ کر پڑھنے میں لگ جائیں گے۔

آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر یہ ہے کہ ضلع مراد پور میں نیا ڈی سی چارج لیتا ہے۔ فوراً اہل معاملہ سراغ لگا لیں گے کہ آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہو۔

اگر موصوف گھوڑوں کے شوقین ہیں تو گھوڑوں اور مویشیوں کا میلہ کیا جائے اور میونسپلٹی سے ریس کورس قائم کرنے کے لیے جگہ الاٹ کرائی جائے۔

اگر مزاج میں تصوف ہے تو عرس کیے جائیں اور داڑھیاں رکھی جائیں۔

اگر شاعر ہیں تو فوراً مشاعرہ ہونا چاہیے اگر نمازی ہیں تو نماز سیکھی جائے کیا عجب کبھی پڑھنی پڑ جائے آخر پتا چلتا ہے کہ حضرت آفتاب اکبر آبادی کا شاگرد ہے۔ سب ہی اپنا قبلہ راست کرا لیتے ہیں لیکن جونہی حضرت کا تبادلہ ہوا، ہم نے سنا کہ دوسرے ہی روز بزم ادب کے دفتر میں گھی بنولوں کی دکان کھل گئی۔

ہفت روزہ آفتاب عالمتاب کے دفتر میں کوڑے لکھنے کا ڈپو قائم کیا گیا کیونکہ تحقیق کرنے والوں نے تحقیق کر لیا کہ نیا ڈی سی شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ تھانے میں شعر کہنے والوں کی فائل کھلوا دیتا ہے۔

خیر اقبال تو قومی شاعر ہے۔ تصور پاکستان کا خالق ہے۔ تاہم یہ بعید از امکان نہیں کہ گاؤں کی یونین کونسل میں سرکلر پہنچے کہ اب کے یوم اقبال منایا جائے تو اس قسم کی گفتگو ہو۔

"ایہہ کیہڑا اقبال بھئی؟"

"ڈاکٹر اقبال"

"کون ڈاکٹر اقبال؟"

ڈاکٹر اقبال نہیں جانتے۔ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال

"یہ ڈی سی صاحب ہیں یا سول سرجن جو ڈاکٹروں، حکیموں کے دن منائے جانے لگے۔ یہ کیا لگتے ہیں ڈی سی صاحب کے؟"

"کچھ بھی نہیں لگتے۔ شاعر تھے بہت بڑے۔ 1937 میں مر گئے۔"

"مر گئے تو پھر یوم منانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں اتنا خرچ کیا جائے۔ جب کہ وہ ڈی سی صاحب کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ کہاں کے رہنے والے تھے؟"

"سیالکوٹ کے۔"

"سیالکوٹ کے۔۔؟ پھر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہماری بیگم سیالکوٹ ہی کی ہیں۔ یہ بھی ضرور کوئی تگڑے آدمی ہوں گے۔"

بعد ازاں رپورٹیں طلب کی جائیں گی۔ کس کس گاؤں میں یوم اقبال منایا گیا، کہاں نہیں۔ کوئی نمبردار عذر کرے کہ جناب کوئی قوال ہی خالی نہیں ملا۔ ہم یوم اقبال کیسے مناتے۔ کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ تھانے والا باندھ کے لے جائے گا کہ بدمعاش! یوم اقبال نہیں مناتے۔ ڈی سی صاحب کے حکم کی سرتابی کرتے ہو۔ دو جی اسے حوالات میں، پڑھواؤ اسے بانگ درا، صبح خود ہی بانگ دیتا ہے کہ حضور غلطی ہوئی، بال بچوں والا ہوں، آج ہی جا کے مناتا ہوں یوم اقبال۔

☆☆

باتیں یاسر پیرزادہ سے

شاہین رشید

1۔ ”اصلی نام؟“

”محمد یاسر پیرزادہ۔“

2۔ ”پیار کا نام؟“

”پیار کے بہت سے نام ہیں جس کا جو دل چاہتا ہے، وہ اسی سے پکارتا ہے۔“

3۔ ”تاریخ پیدائش / سال؟“

”28 دسمبر / 1985۔“

4۔ قد / ستارہ؟“

”5 فٹ 11 انچ / کیپری کورن۔“

5۔ ”مادری زبان؟“

”اردو۔“

6۔ بہن بھائی / آپ کا نمبر؟“

”چار بہن بھائی۔ یعنی تین بھائی اور ایک بہن ہے / میرا نمبر پہلا ہے۔“

7۔ ”شادی / بچے؟“

”جی شادی شدہ ہوں اور ایک بہت ہی پیاری بیٹی سے اللہ نے نوازا ہے جس کا نام ”حرم“ پیرزادہ ہے۔ جو ہمارے گھر کی رونق ہے۔

8۔ ”تعلیم؟“

”ماسٹرز آف انٹرنیشنل ریلیشن۔“

9۔ ”اس فیلڈ میں آمد / گھر والوں کا ردعمل؟“

”ریڈیو پاکستان کے پروگرام بزم طلبہ سے کیریئر کا آغاز کیا اور چونکہ مائیک کا عادی تھا کیمرہ فیس کرنے میں کبھی مشکل نہیں ہوئی اور سب گھر والوں اور دوست احباب نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ حوصلہ افزائی بھی کی۔“

10۔ ”بچپن میں کس سے ڈر لگتا تھا؟“

”بچپن میں اندھیرے سے بہت ڈر لگتا تھا اور جب بڑا ہوا تو کتابوں میں پڑھا اندھیرے سے مت ڈرو کہ اندھیرے میں ہی ستارے چمکتے ہیں۔“

11۔ ”پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟“

”ریڈیو پاکستان سے ایک چیک ملا تھا پانچ ہزار کا جو میں نے امی کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔

12۔ ”بچپن کا پہلا پیار؟“

”پہلے دوسرے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ میں چونکہ گھر میں بڑا تھا تو مجھے سب نے بہت زیادہ پیار دیا اور اب تک دیتے ہیں۔

13۔ ”گھر میں کس کے ہاتھ میں ذائقہ ہے؟“

”امی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اور اب بیگم کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ چھٹی کے دن میری ہی پسند کے کھانے بنتے ہیں۔

14۔ ”صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں / صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟“

”جی بالکل جلدی اٹھنے کا عادی ہوں...... اور صبح چائے نہ ملے تو لگتا ہے، ابھی صبح نہیں ہوئی

ہے۔

15۔ ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''

''بھوک بالکل بھی برداشت نہیں، ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا وقت پر کھانے کا عادی ہوں۔''

16۔ ''سیاست میں کون پسند ہے؟''

''فاروق ستار سے بہت متاثر ہوں۔''

17۔ ''پاکستان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟''

''یہی کہ بہت قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے اور کوئی یہ نہ سوچے کہ ہمارے بدلنے سے کیا ہوگا۔ سب کو اپنے حصے کا کام کرتے رہنا چاہیے..... کیونکہ قطرہ قطرہ ہی دریا بنتا ہے۔

18۔ ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

''کینیڈا کی۔''

19۔ ''کن چیزوں پر پیسہ اڑا کر پچھتاتے ہیں؟''

''پیسہ خرچ کر کے پچھتانے کی عادت نہیں ہے۔ ہمیشہ کھلے دل سے خرچ کرتا ہوں، خواہ کوئی بھی موقع ہو۔''

20۔ ''میڈیا میں کیا اچھا ہے، کیا برا ہے؟''

''ہر فیلڈ میں اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں اور ہر طرح کے لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کس کا اثر قبول کرتے ہیں۔''

21۔ ''اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ/ کون سا کھیل پسند ہے؟''

''جی جی..... بہت لگاؤ ہے اور کرکٹ بہت پسند ہے۔''

22۔ ''کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟''

''جب کوئی بات میری مرضی کے خلاف ہو۔''

23۔ ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''

''پہلا خواب کہ ایسا اسپتال بناؤں جہاں ان لوگوں کا علاج ہو جو صاحب حیثیت نہیں ہیں...... دوسرا یہ کہ ایک اسکول کھولوں اور تیسرا یہ کہ ایسا پلیٹ فارم بناؤں جہاں صرف فلاحی کام ہوں۔''

24۔ ''کس کی خاطر یہ فیلڈ چھوڑ سکتے ہیں؟''

''نہیں فیلڈ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس سے میرا روزگار وابستہ ہے میں اس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ کام بھی کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔''

25۔ ''کون سا کام جو پہلے بھی نہیں کیا تھا اب کرنے لگے ہیں؟''

''اس کا جواب کچھ الٹ ہے۔ یعنی شادی سے پہلے اپنے لیے چائے اور انڈا بنا لیتا تھا مگر اب بیگم یہ فرائض انجام دیتی ہیں۔''

26۔ ''تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟''

''اپنے والد صاحب کو یاد کر کے۔''

27۔ ''گھر میں کچھ خراب ہو جائے تو ٹھیک کرنے کی ذمہ داری کس کی ہوتی ہے؟''

''میری ہی ہوتی ہے اور کوشش کرتا ہوں کہ گھر کی ہر چیز ٹھیک ہو۔''

28۔ ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گے؟''

"اپنا بچپن۔"

29۔ "گھر میں آپ کے فیصلے کی مخالفت کون کرتا ہے؟"

"کوئی مخالفت نہیں کرتا۔"

30۔ "بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟"

"اپنے معاملے میں بہت لاپرواہوں۔"

31۔ "اپنی زندگی کا کون سا دور دوبارہ جینا چاہتے ہیں؟"

"بچپن کا دور۔"

32۔ "فیملی میں کون فراخ دل ہے؟"

"بیگم۔"

33۔ "ادب سے آپ کا لگاؤ کس کس کو پڑھا ؟"

"ادب سے خاصا لگاؤ ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ سب کو ہی پڑھوں۔"

34۔ "کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟"

"ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔"

35۔ "کچن سے لگاؤ/ کبھی شیف بننے کا سوچا؟"

"کچن سے لگاؤ بالکل بھی نہیں ہے...... بس انڈا بنا لیتا ہوں۔ وہ بھی شادی سے پہلے ہی بناتا تھا۔ شیف بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

36۔ "کبھی سوچا کہ سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟"

"سوشل میڈیا اچھا پلیٹ فارم ہے۔ آپ پابند نہیں ہوتے کوئی خبر پہنچانے میں...... لیکن سچ اور حقیقت پر مبنی خبریں ہی پہنچائی جائیں۔"

37۔ "کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں نکال سکتے؟"

"جس شخصیت کے لیے دل میں عزت اور قدر ہو، وہاں غصے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

38۔ "لکس (Looks) بدلنے کا موقع ملے تو کس کی طرح نظر آنا چاہیں؟"

"فی الحال تو اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ میں جیسا بھی ہوں بہت اچھا ہوں۔"

39۔ "ایک نصیحت جو سب کو کرتے ہیں؟"

"کوشش کریں کہ کبھی کسی کا دل نہ دکھائیں۔"

40۔ "ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے حکمران یا عوام؟"

"ففٹی ففٹی۔"

41۔ "کبھی غربت میں وقت گزارا؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ایسا وقت بھی نہیں دکھایا الحمداللہ۔"

42۔ "طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون سے نفرت تھی؟"

"ہیتھس سے۔"

43۔ "ڈاکٹر، ہومیوپیتھک اور حکیم کس پر یقین ہے؟"

"ڈاکٹرز پر زیادہ یقین ہے۔"

44۔ "دنیا کا سب سے بورنگ کام؟"

"بیگم کو شاپنگ پر لے جانا۔"

45۔ "کیا دل سے اترا ہوا شخص دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟"

"بہت مشکل ہے۔"

46۔ "اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتے ہیں؟"

"اپنے ان تمام محسنوں سے جنہوں نے مجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے۔"

47۔ "موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟"

"تیس فیصد مطمئن ہوں۔"

48۔ "گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں؟"

"بیگم جب اپنے میکے جاتی ہیں تو ان کی عدم موجودگی میں ناشتا بنانا پسند نہیں۔"

49۔ "غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے؟"

"اس وقت کوشش ہوتی ہے کہ لانگ ڈرائیو پر نکل جاؤں تاکہ کم سے کم سامنا ہو۔"

50۔ "ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر پرسن؟"

"شاہد مسعود، وسیم بادامی، کرن ناز اور پارس جہاں زیب بہترین اینکر ہیں۔"

51۔ "آپ کا راز دار کون ہے؟"

"دوست۔"

52۔ "فیملی پر کتنا رعب ہے؟"

"بہت زیادہ۔"

53۔ "کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟"

"گھر میں سب کی سالگرہ کی ڈیٹس مجھے یاد رہتی ہیں۔"

54۔ "ایک کھانا جو کسی بھی وقت کھایا جاسکتا ہے؟"

"میری پسندیدہ بریانی۔"

55۔ "کیا اپنے پروگرام بار بار دیکھتے ہیں؟"

"جی بالکل۔"

56۔ "ایک غلطی جس پر کبھی معافی نہیں مانگتے؟"

"جہاں میری غلطی ہوتی ہے، میں خود ہی معافی مانگ لیتا ہوں۔"

57۔ "پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟"

"فلم؟ کچھ کچھ ہوتا ہے۔"

58۔ "بچپن میں کس وجہ سے مار کھاتے تھے؟"

"زیادہ مار نہیں کھائی اور یقیناً شرارتوں کی وجہ سے ہی کھائی ہوگی۔"

59۔ "گھر کو جنت بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

"محبت، احترام اور درگزر۔"

60۔ "ایک گانا جو اکثر گنگناتے ہیں؟"

"پہلی پہلی بار محبت کی ہے۔"

61۔ "فیلڈ کا کوئی کام جو کرنے سے انکار کیا ہو؟"

"ایسا اب تک ہوا تو نہیں کہ انکار کیا ہو۔"

62۔ "کس سیاست دان کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں؟"

"عمران خان۔"

63۔ "چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟"

"چاند پر پہنچ کر تو وہاں کی دنیا میں کھو جانے کو دل چاہے گا۔"

64۔ "علم نجوم پر کتنا یقین ہے۔ کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"

"علم نجوم پر یقین نہیں...... اس لیے کبھی ہاتھ بھی نہیں دکھایا۔"

65۔ "کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟"

"کیریر کے حوالے سے کوئی قدم اٹھانا ہو تو بہت سوچتا ہوں۔"

66۔ "تقریب میں جانے کے لیے کس کی مرضی سے تیار ہوتے ہیں؟"

"بیگم کی مرضی سے۔"

67۔ "ادھار کس سے بلا جھجک مانگ لیتے ہیں؟"

"صرف دوستوں سے مانگ سکتا ہوں۔"

68۔ "اپنا فیوچر کیسا دیکھتے ہیں؟"

"مجھے اللہ کی ذات پر خود سے زیادہ بھروسا ہے۔ وہ جو میرے لیے کرے گا، بہتر ہی کرے گا۔"

69۔ "سگنل پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟"

"ٹریفک پولیس کو شاباش دیتا ہوں کہ جس طرح دھوپ میں محنت کر کے کھڑے ہوتے ہیں۔"

70۔ "بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟"

"قاضی واجد، بشریٰ انصاری وغیرہ۔"

71۔ "خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟"

"عمیرہ احمد۔"

72۔ "بچپن میں کون سے گیمز کھیلے؟"

"میں کرکٹ زیادہ کھیلتا تھا۔"

73۔ "شاپنگ کے لیے جاتے ہیں تو پہلے کس

کا خیال آتا ہے؟"

"اپنی بیٹی کا۔"

74۔"اپنی تعریف سن کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

"بہت اچھا لگتا ہے۔"

75۔"اپنی کمائی کس پر خرچ کرتے ہیں؟"

"جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں خرچ کرتا ہوں۔"

76۔"کس طرح کے کام کرنے مشکل لگتے ہیں؟"

"جب بیگم کہیں گئی ہوں اور غلطی سے گھر کا کام کرنا پڑ جائے تو۔"

79۔"یوٹیوب میں آپ کا پسندیدہ چینل؟"

"وسیم بادامی کا یوٹیوب زیادہ دیکھتا ہوں۔ دیگر ایکٹرز کے چینل بھی دیکھتا ہوں مگر زیادہ نہیں۔"

80۔"آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ سے ہے یا آنا چاہتا ہے؟"

"گھر میں میڈیا میں صرف میں ہی ہوں باقی کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی بینکر۔"

81۔"بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟"

"گولڈ کی شکل میں۔"

82۔"شادی میں کون سی رسموں کے خلاف ہیں؟"

"میں تمام رسموں کے خلاف ہوں اس پیسے سے آپ کسی غریب کی مدد کر دیں۔"

83۔"کون سا کھانا زہر مار کر کے کھاتے ہیں؟"

"کھانے میں کبھی ناپسندگی کا اظہار نہیں کیا۔"

85۔"صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟"

"درود شریف پڑھتا ہوں۔"

86۔"آپ کی کس بات سے آپ کے والدین ناراض ہو جاتے ہیں؟"

"اپنا خیال نہ رکھنے پر۔"

87۔"بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟"

"شکر گزار ہوں والدین کا کہ انہوں نے میرے سب ہی خواب پورے کیے۔"

86۔"پسندیدہ جانور؟"

"مور۔"

87۔"کن باتوں سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟"

"جو بات مزاج کے خلاف ہو، یا وہ کام جو میں نہیں چاہتا کہ ہوں ان باتوں پر۔"

88۔"کون سی چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"

"چائے۔"

89۔"مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟"

"دو یا تین بار۔"

90۔"کھانا کہاں کھاتے ہیں بیڈ پر، ڈائننگ ٹیبل پر یا چٹائی پر؟"

"آفس سے آ کر اتنا تھک جاتا ہوں کہ کوشش ہوتی ہے کہ بیڈ پر ہی کھانا کھا لوں۔ مگر بیگم کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ کھانا ڈائننگ ٹیبل پر کھاؤں۔"

91۔"گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتے ہیں؟"

"اپنی بیٹی کے لیے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔"

92۔"اپنی بڑی خوشخبری سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟"

"اپنی بیگم کو۔"

93۔"اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"

"عروج و زوال ہر فیلڈ میں آتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارنی چاہیے کوشش کرتے رہنا چاہیے۔"

☆☆

معروف مصنفہ

سدرۃ المنتہیٰ سے ملاقات

شاہین رشید

سدرۃ المنتہیٰ ہمارے قارئین کی پسندیدہ مصنفہ ہیں

بہت سارے لکھنے والوں میں سدرہ کی ایک الگ پہچان ہے۔ ان کے موضوعات عام مصنفین سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ انسان کے اندر کی کیفیات پر زیادہ لکھتی ہیں۔ انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں اس کے رویے، اس کی سوچ ان کا موضوع ہوتے ہیں۔ سدرہ کو زبان و بیان پر پورا عبور ہے جبکہ ان کی مادری زبان سندھی ہے۔ وہ بہت سے اہل زبان سے اچھی اردو لکھتی ہیں۔

اس ماہ ہم سدرۃ المنتہیٰ کا انٹرویو پیش کر رہے ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمد للہ"

"یونیک نام..... کیا بیک گراؤنڈ ہے؟"

"اصل میں یہ نام سعودی عرب سے لیا گیا تھا۔ میری بڑی کزن، جو میری ماں کی جگہ ہیں وہ جب حج کے لیے سعودی عرب گئیں۔ وہاں ان کی دوست کی بچی کا نام سدرۃ المنتہیٰ تھا۔ جب وہ پاکستان آئیں تو میں پیدا ہوئی، انہوں نے ہی میرا نام رکھا تھا۔

تو مجھے زیادہ تر لوگ سدرہ پکارتے ہیں اور منتہیٰ بھی پکارتے ہیں۔ اس کا مطلب "مقام انتہا" ہے۔ "شدت" ہے اس انتہا کا اور شدت کا مجھ پر اثر ہے اور بہت زیادہ اثر ہے نام کا اثر شخصیت پر ہوتا ہے

"شدت اور انتہا سے کیا مراد ہے۔ مزاج کی گرم ہو یا نرم ہو؟"

"مزاج تو اتنا گرم نہیں ہے لیکن شدت بہت زیادہ ہے کسی کام کو کرنا تو بہت شدت کے ساتھ کرنا، بہت سوچنا اور لگن کے ساتھ کرنا۔ منتہیٰ مقام منتہیٰ سے لیا گیا ہے، جہاں جبرائیل پاک ٹھہر گئے تھے۔ وہ ان کا مقام منتہیٰ تھا اور سدرہ بیری کا ایک درخت تھا۔ تو نام کا اثر ہے۔ محبتیں بھی شدت کے ساتھ اور کام کی لگن بھی شدت کے ساتھ...... اعتدال بہت کم ہوتا ہے۔"

"اب آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

"حیدرآباد کے نواحی علاقے "ٹنڈو محمد خان" سے تعلق ہے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے والد "زمین دار" تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے تقریباً چھ سات سال قبل۔"

تعلیم کا آپ نے پوچھا تو آپ کو بتاؤں کہ اصل میں ہمارا تعلق ایک گدی نشین خاندان سے تھا۔ پیری مریدی تھی۔ خاندان میں بڑے عبادت گزار اور عجز و انکساری والے لوگ تھے۔ اسکول میں پڑھنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہماری بڑی چچی نے تین نسلوں کو قرآن پاک پڑھایا تھا۔ قرآن پاک کی کلاس صبح ہوتی تھی، کبھی دوپہر تک تو کبھی شام تک کلاس چلتی تھی وہی ہماری درس گاہ تھی، جہاں پر ہم نے گھریلو امور بھی سیکھے۔

قرآن پاک کی تعلیم برابر ملتی رہی۔ گھرانہ بہت مذہبی تھا۔ خانقاہی ماحول تھا۔ ہمارا باہر جانا کم ہوتا تھا لیکن میری امی دوسرے خاندان سے ہیں تو اسکول والا ماحول میں نے ننھیال میں دیکھا اور اپنے گھر میں بھائیوں کو کہ وہ اسکول جاتے تھے۔ میں اپنے بھائیوں کی پرائمری کی کتابیں پڑھتی تھی ساتھ ڈکشنری لے کر بیٹھتی تھی۔ میں قاعدہ پڑھتی تھی۔ بھائی پکی کلاس میں تھا میں اس کا سبق پڑھ لیتی تھی اور کبھی کبھار اسے سبق یاد بھی کروا دیتی تھی۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے خاندان میں خواتین کے پاس کوئی

نصابی ڈگری نہیں تھی لیکن ماحول اور تربیت سے سب
ہی پڑھی لکھی لگتی تھیں بہت سمجھدار اور ذہین تھیں ہماری
خواتین۔

مجھے بھی شوق تھا۔ میں بچوں کو پڑھاتی تھی۔

میری ایک کزن ہیں کنیز نبوی وہ بہت اچھی رائٹر
ہیں۔ میری استاد ہیں۔ امی ہماری پڑھی لکھی تھیں
۔ کافی بڑی عمر میں (میٹرک کے لحاظ سے) میں نے
میٹرک کا امتحان دیا اب میری تعلیم انٹر تک ہے۔ اتنی
تعلیم حاصل کرنے میں میری دوستوں کا بھی بہت
تعاون رہا۔

میری دوست اور بہت اچھی رائٹر راحت جبیں
مجھے اکثر ڈانٹ دیتی تھیں کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ
تمہارے پاس نصابی ڈگری نہیں ہے مگر میں سمجھتی
ہوں کہ اس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مگر کبھی بھی اس
کی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس لیے نہیں ہوتا
تھا کہ میں بچپن سے اپنے بھائیوں کی کتابیں پڑھتی
تھی۔ پرائمری اسکول کی کتابیں ہوتی تھیں اور میرا
سب سے چھوٹا بھائی، جو مجھ سے بارہ سال چھوٹا ہے تو
میں نے اس کی پرورش کی پڑھایا جب وہ چار سال کا
تھا تو میں نے اسے نرسری تک پڑھا دیا تھا۔ جب وہ
نرسری میں داخل ہونے گیا تو اسکول والوں نے اسے
کے جی میں نہیں بٹھایا بلکہ کلاس ون میں داخلہ دیا۔
ایک ماہ بعد جب امتحان ہوئے تو اس نے "اے ون"
گریڈ لیا۔ تو یہاں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں باقاعدہ
اسکول نہیں گئی "بس گھر میں بیٹھ کر ہی پڑھنا سیکھ گئی
تھی۔"

"شادی ہوئی؟"

" جناب شادی نہیں ہوئی۔ آگے کیا ہوگا۔ یہ
اللہ بہتر جانتا ہے اور نہیں ہونے کی وجہ کاسٹ وغیرہ کا
بھی عمل دخل ہوتا ہے کہ سیدوں سے باہر کہیں اپنی
لڑکی نہیں دیں گے۔ تو میں نے اس چیز کی پرواہ نہیں
کی کہ ہو جاتی ٹھیک تھا۔ نہیں ہوئی تو بھی کوئی بات
نہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ لڑکیوں کی شادی نہ ہو تو وہ
اسٹریس میں آجاتی ہیں۔ مگر میں نے شادی کو کچھ
سیریس نہیں لیا کہ بس زندگی اچھی گزرنی چاہیے۔
اچھی زندگی شادی کے بغیر بھی گزر جاتی ہے۔ بس
اپنے اندر کام کی لگن ہو بے کار نہ بیٹھیں۔ شادی کو
زندگی اور موت کا مسئلہ نہ بنائیں۔"

"بچپن کیسا گزرا؟"

"بچپن اچھا گزرا۔ ہر طرح کے کھیل کھیلے،
لڑکوں والے کھیل بھی کھیلے اپنے بھائیوں کے ساتھ۔
گڈے گڑیاں بھی کھیلیں اپنی دوستوں کے ساتھ۔
بچپن میں لڑاکا نہیں تھی لیکن تھوڑی شریر تھی۔ حس
مزاح بچپن سے ہی مزاج کا حصہ ہے۔ تحمل مزاج
تھی، لڑائی جھگڑے والی نیچر نہیں تھی۔ کم گو تھی لیکن
جب بہت زیادہ پڑھنا شروع کیا تو پھر بہت زیادہ
بولنا بھی آگیا۔"

"لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟"

"میں نے اپنی کہانی "یہ جہاں اور ہے" میں
لکھا تھا کہ ایک رائٹر سے صحافی سوال پوچھتی ہے کہ
آپ لکھتے کیوں ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میں جب کچھ نہیں
کرتا تب بھی میں لکھتا ہوں اور جب میں کچھ کرنا
کرنا چاہتا ہوں تب بھی میں لکھتا ہوں میں بھی ان
دونوں وجوہات کی بنا پر لکھنا چاہتی تھی کچھ کرنا چاہتی
تھی۔ کیونکہ اسکولنگ بھی نہیں ہوئی تھی میرے اندر
بڑی خلش تھی نہ پڑھنے کی میں اپنے ننھیال جاتی تھی تو

اعتذار

سمیرا حمید ناسازی طبع کے باعث مشک بام کی قسط نہیں لکھ پائیں۔ اس ماہ مشک بام کی قسط شامل اشاعت نہیں۔

وہاں بچیوں کو اسکول جاتے ہوئے دیکھتی تھی۔ پڑھتے ہوئے دیکھتی تھی تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا میرا بھی دل چاہتا تھا کہ لڑکیوں کو وہ میدان ملے جہاں وہ کچھ کرسکیں۔

جبکہ ہمارے یہاں ایک خاندانی ماحول تھا۔ پردہ اور محدود ماحول کے اندر رہنا اور وہ بھی گھر کے اندر رہنا۔ تو میں ہی کیا ہمارے خاندان کی جتنی بھی ہونہار لڑکیاں تھیں ان کے اندر یہ احساس تھا کہ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔

ایک تو کچھ کرنے کی لگن تھی۔ پھر گھر میں کنیز اور دیگر کزنز جو کہ مجھ سے بڑی تھیں، وہ اور امی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھتی تھیں۔ اس وقت میں نو دس سال کی تھی، مجھے کتابوں سے محبت تھی تو میرے ابو مجھے بچوں کے میگزین لا کر دیتے تھے۔ میں پڑھتی تھی مجھے بہت مزہ آتا تھا۔ میں کنیز آپا کے ساتھ کہانیاں ڈسکس کرتی تھی۔ انہیں بھی لکھنے کا شوق تھا اور انہوں نے بڑے خفیہ انداز میں لکھا۔

میں جب گیارہ بارہ سال کی تھی تو میں کہتی تھی کہ میں تو رائٹر بنوں گی، میں لکھوں گی۔ میں نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں بچوں کے رسالوں میں کہانیاں لکھ کر بھیجنا شروع کر دی تھیں اور وہ چھپنا بھی شروع ہو گئیں۔ کبھی کہانیاں تو کبھی شاعری، کبھی لطیفے بھیجتی رہتی تھی۔ شاعری کی پیروڈی بھی کرتی تھی۔ تو نونہال بچوں کی دنیا اور سندھی میں بھی بچوں کے رسالوں میں نے لکھا تھا۔

ڈائجسٹ کے لیے میں نے 2003 یا 2004 میں لکھنا شروع کیا۔ میری پہلی کہانی ''ساز ہستی'' شائع ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد دوشیزہ اور ایک نیا میگزین اس زمانے میں نکلا تھا۔ ''ست رنگ'' اور نازنین وغیرہ میں لکھنا شروع کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری پہلی کہانی شائع ہوئی تھی تو میں نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔

میں نے شروعات افسانے سے کی لیکن میں بنیادی طور پر اپنے آپ کو ناول نگار سمجھتی ہوں۔ لمبی کہانیاں سوچتی تھی اور لمبی کہانیاں لکھتی تھی اور ابتدا بھی ڈائجسٹ سے ہوئی اور ڈائجسٹ میں میں نے پہلی کہانی راحت جبیں کی پڑھی تھی اور دوسری ''پیر کامل'' پڑھی تھی اور پیر کامل کے بعد ہی میں نے باقاعدہ طور پر ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔

پھر 2008 سے میں ادبی دنیا کی طرف مائل ہو گئی۔ میرے افسانے ادبی ٹائپ کے ہوتے تھے اور ڈائجسٹ والے معذرت کر لیتے تھے کہ یہ ادبی رنگ کا افسانہ ہے۔ تو پھر میں نے سوچا کہ جب میں نے ادبی رنگ کی طرف جانا ہے تو پھر میں کیوں نہ سندھی ادب کی طرف آ جاؤں، ڈائجسٹ کے لیے تو میں ڈائجسٹ کے مزاج کے مطابق لکھ ہی رہی ہوں۔ تو پھر میں نے سندھی ادب کے کچھ میگزین پڑھے اور اس کے بعد ادبی کہانیاں سندھی ادب کے لیے لکھنے لگی۔ ادبی رنگ ڈھنگ کے افسانے سندھی میگزین میں شائع ہوتے تھے۔

کچھ بھی ہو۔ ڈائجسٹ میں لکھنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے اپنی ہی ایک کشش ہے۔ ''خواتین ڈائجسٹ'' میں میری تحریریں 2010 یا 2011 سے چھپنا شروع

ہوئی ہیں اور میرا مکمل ناول "مسلسل اور پرہ" خواتین ڈائجسٹ میں لگا تھا۔ 2011 میں ایک ناولٹ چھپا تھا "پربت نگر کا شہزادہ" عام قاری خواتین نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا لیکن کچھ رائٹرز جن کے ساتھ میرا رابطہ تھا، وہ بہت خوش ہوئی تھیں اور انہوں نے کہا کہ تم نے کمال کر دیا ہے۔ تم نے بہت اچھا لکھا ہے۔ مجھے ہمیشہ بڑی عمر کے ریڈرز نے پسند کیا اور جو میری ہم عمر لڑکیاں تھیں جو کہ خاندان کی ہی تھیں وہ مجھے ناپسند کرتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ بڑا مشکل لکھا ہے ہمیں سمجھ میں نہیں آتا تو میں حیران ہو جاتی تھی کہ ایسا بھی کیا مشکل لکھ دیا۔

اور آپ نے معاوضے کا پوچھا تو ڈائجسٹ سے بہت اچھا معاوضہ نہیں ملتا لیکن ادبی پرچے معاوضہ تو کیا پرچے بھی نہیں دیتے۔ اور میں تو لڑ کر ان سے پرچہ لیتی تھی کہ بھئی معاوضہ نہیں دیتے تو پرچہ تو دو...... یہ تو رائٹر کا حق ہے۔ اور جو دیگر سندھی رائٹر تھیں، وہ خرید کر اپنی تحریریں پڑھا کرتی تھیں۔

تمام ڈائجسٹوں میں خواتین ڈائجسٹ اچھا معاوضہ دیتا ہے۔ اس میگزین کا معیار بھی بہت اچھا ہے، خواتین ڈائجسٹ رائٹر کو تراشتا ہے۔ رائٹر بناتا ہے اور میں اکثر سوچتی ہوں کہ آج تک جتنی بھی رائٹرز ڈائجسٹ کی دنیا میں راج کر رہی ہیں اور ڈراموں کی دنیا میں جن کا ایک نام ہے وہ سب خواتین ڈائجسٹ اور امت العبور کی مرہون منت ہیں۔"

"کہانی یا پلاٹ کس طرح ذہن میں آتا ہے؟"

"کہانی سوچ سے خیال سے اور حرکت سے ذہن میں آتی ہے آپ کے اندر جو خوشیاں اور محرومیاں ہوتی ہیں وہ کہانی کو جنم دیتی ہیں۔ میری نیچر میں شروع سے ہی بہت شدت تھی۔ میں اپنے والد کے بہت قریب تھی ان کی محبت میں بہت شدت تھی اور مجھے لگتا تھا کہ وہ انہیں ورثے میں ملی ہے۔ ہمارے یہاں سندھی میں بیٹیوں کو "اماں" بولتے ہیں تو جب والد مجھے "اماں" کہتے تھے تو ایک عجیب قسم کی طاقت آجاتی تھی۔

تو مجھے والد صاحب کی محبت، کتابوں کی محبت اور لکھنے کے جنون نے رائٹر بنا دیا...... خیر کہانی ایک خیال بھی ہے اور ایک حقیقت بھی ہے، کبھی کبھار کوئی واقعہ بھی کہانی کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن میرا خیال کہ میں نے اپنی سوچ کو زیادہ پیش کیا ہے۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مجھے کافی رائٹرز نے کہا کہ آپ وہ کیوں نہیں لکھتیں جو آپ کے ماحول میں ہو رہا ہے، ہوتا ہے۔ آپ وہ کیوں لکھتی ہیں جو آپ کو لگ رہا ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ بندہ یا تو وہ لکھتا ہے جو ہو رہا ہوتا ہے یا وہ پھر وہ لکھتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ تو جب وہ لکھ رہا ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے تو دراصل وہ اس کی دریافت ہوتی ہے۔ میں نے اتنے سال خود کو ڈھونڈا ہے اور اب میں وہ لکھنا چاہتی ہوں جو میں نے دیکھا ہے۔ وہ المیے، وہ ناانصافیاں اور اس سے پہلے وہ لکھتی تھی جو مجھے اچھا لگتا تھا، جو میں سوچتی تھی۔

"اک جہاں اور ہے" میرا وہ واحد ناول ہے جس کو میں نے اپنی روح کے ساتھ لکھا ہے۔ اپنے دل کے ساتھ لکھا ہے جس کے اندر میں نے سوال کیے ہیں اور جن کے مجھے جواب ملے ہیں۔ میرا یہ ناول "حنا" ڈائجسٹ میں سلسلہ وار چھپا تھا اس میں ایک لفظ کی بھی ایڈیٹنگ نہیں ہوئی تھی تو میں بڑی مطمئن تھی کہ یہ میری مرضی سے چل رہا ہے تو ایسا ہو تو پھر رائٹر کھل کر میدان میں کھیلنے لگتا ہے۔ کودتا ہے۔ اچھلتا ہے چھلانگیں مارتا ہے اور وہ ہر طرح کا کھیل کھیلتا ہے۔

جب اسے پتا چلتا ہے کہ وہ آزاد ہے مجھے بڑا اچھا لگتا تھا جب میری تحریر بغیر کانٹ چھانٹ کے چھپ رہی ہوتی تھی۔ یہ میرا وہ واحد ناول ہے جس میں میں نے کھل کر لکھا اور اس کے جتنے بھی کردار تھے ان میں آدھے کردار "میں" تھی تو لکھتے لکھتے میں نے خود کو پایا ہے۔ اپنے خدا کو پایا ہے اس انسیت کو پایا ہے جس کے لیے وہ جی رہا ہوتا ہے۔"

"ہر انسان کے اندر لاتعداد کہانیاں بن رہی ہوتی ہیں لیکن لکھنے کا ہنر الگ تعلق ہوتا ہے۔ جب میں ٹین ایج میں تھی تو زیادہ تر رات میں لکھا کرتی تھی۔ مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور میں پانچ چھ کتابیں جو کہ مختلف موضوعات کی ہوتی تھیں، اپنے سرہانے ضرور رکھتی تھی جو پڑھنے کو دل چاہتا تھا وہ پڑھنے لگی تھی۔ تو میں پڑھتی بہت زیادہ تھی۔ لکھتی بہت زیادہ تھی آج سے دس سال پہلے بہت زیادہ لکھا اور بہت زیادہ "ردی" میں پھینک دیا۔

کافی کہانیاں ایسی ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔ کافی ایسی ہیں جو گم ہوگئی ہیں اور کافی ایسی ہیں جو ادھوری رہ گئی ہیں اور انہیں اب میں مکمل نہیں کرسکتی کیونکہ اگر کہانیاں وقت پر مکمل نہ ہوں تو بہت مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ آپ کی فیلنگ سفر کرلی ہیں۔

بہت تبدیلیاں آئیں ہیں وقت کے ساتھ ساتھ پہلے میں بہت مشکل سا لکھتی تھی پھر آسانی کی طرف آئی۔ پہلے میں گاڑھا لکھتی تھی پھر ہلکا لکھنا شروع کیا، آہستہ آہستہ اپنے آپ کو کھولنا اور ہلکا کرنا شروع کردیا۔

پہلے رومینس نہیں ہوتا تھا کہانیوں میں پھر آہستہ آہستہ آیا جب محبت کی سمجھ آئی۔ اور جب پتا چلا کہ رومینس کسی ایک جنس کے ساتھ منسلک نہیں ہوتا۔ والد کے ساتھ بہت زیادہ محبت کی۔ میری ایک سندھی دوست تھیں وہ افسانے لکھتی تھیں بڑے علامتی اور تجریدی انداز کے ان کا نام سندھیا شاہ تھا 2008 میں وہ مجھ سے ملیں دوران کے آنے کے بعد مجھ میں بہت چینج آیا پھر 2012 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

وہ روزانہ ایک افسانہ لکھتی تھیں اور مجھے سناتی تھیں انہوں نے اپنے کمرے کی دیوار پر کوئلے سے کچھ چیزیں لکھی ہوئی تھیں جو وہ مجھے پڑھ کر سناتی تھیں۔ ان سے باتیں کرکے میرے اندر کا فنکار زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔

انہوں نے مجھے بہت سراہا۔ ایک دفعہ کہنے لگیں، "تم کبھی چاند پر گئی ہو؟" تو میں نے کہا کہ "روز جاتی ہوں۔" تو ہنستے ہوئے بولیں "آج تک حیدرآباد تو گئیں نہیں چاند پر کیسے جاسکتی ہو۔" وہ ایسی ہی مزے مزے کی باتیں کرتی تھیں۔

2011 میں سائرہ غلام نبی کا ایک افسانہ "سفر کہانی" پڑھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ کاش یہ افسانہ میں لکھتی۔ 2011 میں مجھے ٹرانسلیشن کا بھی شوق ہوا تو سائرہ کا افسانہ سندھی میں ٹرانسلیٹ کرنے کے لیے سائرہ سے اجازت لی اور پھر میں نے ان کے کچھ اور افسانوں کو بھی سندھی میں ٹرانسلیٹ کیا۔

سائرہ کا جب پہلا افسانہ میں نے ٹرانسلیٹ کرکے ایک میگزین کے ایڈیٹر کو بھیجا تو انہوں نے کہا کہ تم نے اس افسانے پر کسی دوسری رائٹر کا نام کیوں لکھا یہ تو تمہارا لکھا ہوا ہے تو میں نے اصل کہانی جو کہ اردو میں لکھی ہوئی تھی، ان کو بھیجی کہ یہ میری کہانی نہیں ان کی کہانی ہے تو وہ بہت حیران ہوئے کہ یہ تو "روح کی زنجیر ہے۔ میں تو سمجھا کہ تم نے لکھا ہے ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ دو رائٹرز ایک جیسا لکھیں۔"

"میں ڈائجسٹ کے رائٹرز کو سندھی ادب میں متعارف کرانا چاہتی تھی اور وہ میں نے کیا سندھی میں ترجمہ کرکے اور سندھی کے اردو میں ترجمہ کرکے۔ مجھے دونوں زبانوں کے رائٹرز سے بہت لگاؤ ہے۔"

"عموماً بچپن میں بچوں کی کہانیاں، نوجوانی میں رومینٹک کہانیاں اور بڑی عمر میں تصور کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ یعنی رائٹر کا مزاج آہستہ آہستہ بدلتا جاتا ہے۔ ایسا ہے کیا؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔ جو کیفیت آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے وہ خواہ کسی عمر میں بھی آپ لکھ سکتے ہیں۔ میں نے شروع سے ہی تصوف کی فیلنگ کو سمجھنا چاہا تھا۔ میں نے اپنے ماحول میں ہر طرح کے لوگوں کو دیکھا ہے۔ سخت خاندانی ماحول، روایات کے پیچھے چلنے والے...... اپنے اصولوں پر ڈٹ جانا۔ بڑی سختیاں دیکھی ہیں اپنے ماحول کے اندر۔ سنا کیت بھی دیکھی۔ اور شاید اس نے مجھے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ تو جو احساسات ہوتے ہیں۔ خواہ کسی بھی عمر میں ہوں اسے ہی قلم لکھتا ہے۔

"ڈرامے کی طرف کیوں نہیں آئیں تم؟"

"آپ نے پوچھا کہ ڈرامے کی طرف کیوں نہیں آئیں تو آپ کو بتاؤں کہ 2011 میں عمیرہ احمد علیس تو میں نے ان کا ایک افسانہ ترجمہ کیا تھا اس کی اجازت لینے کے لیے میں نے ان کو کال کی تھی اور ہماری کافی لمبی بات ہوئی تھی اور مجھے خوشی تھی کہ میں اتنی معروف رائٹر سے بات کر رہی ہوں۔ تو انہوں نے مجھے ڈرامے کی طرف راغب کیا اور کہا کہ "آؤ میں تمہیں اسکرپٹ لکھنا سکھاتی ہوں ان کے اسکرپٹ سے میں نے سیکھا۔ میں نے ان کی معاونت میں ایک سیریل لکھا جو بدقسمتی سے چار سال سے شوٹ نہیں ہوا۔

الیکٹرونک میڈیا میں، میں نے بہت سی چیزوں کو نوٹ کیا ہے کہ کچھ اچھی چیزیں ہیں تو کچھ بری بھی ہیں۔ یہاں بہت مشکلات دیکھی ہیں میں نے۔ یہاں رائٹر بہت مشکل سے اپنی جگہ بناتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب "ہم ٹی وی" وجود میں آیا تو عمیرہ احمد اور نورالہدیٰ شاہ لکھنے کے لیے آئی تھیں تو میں نے عمیرہ احمد اور نورالہدیٰ شاہ سے زیادہ اسٹرونگ لکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ زیادہ تحمل والا اور سکھانے والا کوئی نہیں دیکھا۔

وہ لکھنے والے کی صلاحیتوں کو بھانپ لیتی ہیں اور پھر ان کو تراشتی ہیں۔ وہ تراشنا جانتی ہیں۔ میں نے عمیرہ احمد کے ساتھ ایک مکمل سیریل لکھا ہے۔ ان شاء اللہ وہ ضرور اسکرین پر آئے گا۔ نورالہدیٰ شاہ آپا سے بھی بہت سیکھا ہے ان کے ساتھ بھی میری کافی نشستیں رہی ہیں تو نور آپا تو نور آپا ہیں۔ وہ بڑی خاندانی رائٹر ہیں۔

ڈرامہ کے حوالے سے اسکرپٹ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ میری کافی میٹنگز بھی ہوئی اور کافی آئیڈیاز لکھ کر دیے لیکن میں کمپرومائز نہیں کرتی تھی تو رائٹر کو شروع شروع میں کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ تو کافی کام ہوتے ہوتے رہ گیا شاید چار پانچ سال میرے نصیب میں نہیں تھا الیکٹرونک میڈیا کے ساتھ کام کرنا۔ لیکن مجھے آفرز آتی رہی ہیں۔ آج کل ایک سیریل لکھ رہی ہوں۔ دیکھیں کہ اس کا کیا بنتا ہے۔"

"اب تک کیا کیا نمایاں کام کر چکی ہیں تراجم کے حوالے سے اور کتابوں کے حوالے سے؟"

2011، 2012 میں نے ٹرانسلیشن کا کام شروع کیا اور مجھے لگا کہ یہ بہت ضروری ہے اور جو کام مجھے مشکل لگتا ہے، وہ میں ضرور کرتی ہوں۔ یہ کام مجھے مشکل لگا تو اس پر ہاتھ ڈالا اور افسانہ لکھنا مشکل لگا تو پھر افسانہ بھی لکھا۔ تو اب تک میں 65 افسانے سندھی سے اردو میں اور بارہ افسانے اردو سے سندھی میں ترجمے کیے ہیں۔

پانچ میری اپنی ذاتی کتابیں ہیں۔ سندھی کا مشہور ناول "منتظر جورہ گیا" وہ 2018 میں ترجمہ کیا جو کتابی شکل میں آیا ہے۔ ایک ناول "دوام آخر سحر ہے" وہ زیر طبع ہے دو افسانوں کے مجموعے ہیں۔ "محبت کی شام" اور "ریت نگر کا شہزادہ" ہے۔ "ایک جہاں اور ہے" اور "شریک حیات" تو ٹوٹل چھ کتابیں ہیں میری۔ دو کتابیں زیر طبع ہیں اٹرانسلیشن کی اور ایک ناول ہے۔

جاری ہے

اعتذار

گزشتہ ماہ نایاب جیلانی کے انٹرویو میں ایک جملہ کہ "میری دوسری شادی بھی ناکام ہوگئی" غلطی سے شائع ہوگیا۔ نایاب جیلانی نے تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ الحمدللہ میری شادی ناکام نہیں ہوئی۔ میں خوش ہوں اپنی زندگی میں۔

ہمیں افسوس ہے کہ نایاب جیلانی کو تکلیف ہوئی۔ اس کے لیے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

گوشی جمال.....منڈی بزمان

شمارہ کب آیا؟ کچھ یاد نہیں لیکن میرے گھر کی الماری کے کسی کونے میں پڑا ہے۔ کون لایا؟ شاید میرا کزن گلاب کے پھول لینے گیا۔ اس وقت اخبار فروش نے دیا کیونکہ دونوں دکانیں پاس ہی ہیں لیکن آج جب میں نے الماری کھولی تو سامنے ہی تو پڑا تھا۔ تب یاد آیا کچھ الفاظ جواب بے ترتیب سے ہیں آپ سب کے ساتھ بانٹتے ہیں۔ شاید تم میں کچھ کمی محسوس ہوا، نہیں نہیں یہ غم تو ساری زندگی کا ہے۔ بس خسارہ ہی خسارہ۔ ہر طرف افسردہ فضائیں، سکوت سے جان لیوا غم ہے، آنکھیں پتھرائی ہوئی، گھر کے جس فرد کو چاہیں با آسانی اس کا چہرہ پڑھا جا سکتا ہے۔

13 اکتوبر بروز جمعرات شام اماں نے تیاری کر لی۔ قیامت صغریٰ برپا ہوا، جمال ہاؤس پہ۔ اماں کی روح آسمان کی طرف اپنے اصلی مقام پر جا پہنچی۔ کوئی مداوا کوئی نعم البدل کچھ بھی تو نظر نہیں آرہا۔

ماں! میری اماں چلی گئیں۔ یہ رشتہ اس دنیا کا سب سے خوب صورت رشتہ اس کے متبادل کچھ ہے کیا؟ بے شک انتظام قدرت ہے مگر غم بلا کا ہے۔ ان شاءاللہ صبر آئے گا کچھ دیر ہے۔ اماں سے جڑے یادگار لمحات زندگی کا اثاثہ ہیں۔ 13 اکتوبر شام چار بجے اماں نے مجھے آخری بار دیکھا۔ میں ان کی چارپائی پہ بیٹھی تھی صبح سے اماں خاموش تھیں۔ ڈرپ بھی رکی ہوئی تھی۔ کھانا پینا بند۔ بس خوراک کی ڈرپ ابھی صرف تین دن ہی لگی اور اماں اللہ میاں کے پاس۔

ان کی اس آخری نظر میں حسرت بے پناہ۔ بے کراں میری طرف بار بار دیکھنا مجھ سے برداشت نہ ہوا، اٹھ کر اسٹور میں پناہ لی۔ آج تو ہم واقعی یتیم ہو گئے۔ ابا نے بچپن میں ساتھ چھوڑ دیا اور اب اماں بھی۔

تہجد کے ٹائم اماں کو غسل دے کر سفید کپڑے پہنا دیے کچھ دن پہلے ہی تو اماں اپنے دونوں بھائیوں کو جو دنیا سے چلے گئے تھے یاد کر رہی تھیں۔ دونوں آپا پاس بیٹھی تھیں۔ "سب انتظام ہے۔ سفید کپڑا، سفید کیس پیٹی میں پڑے تھے۔ کڑیو دہ دیکھ لو۔ مہمان آنے ہیں۔ چیخ و پکار نہ کرنا۔ صبر کا دامن پکڑے رکھنا۔" دونوں آپا دہل گئیں اماں..... ایسی ہولناک باتیں نہ کریں۔ اور کانپتے وجود سے میں دروازے کی اوٹ سے زمین پر بے یقینی سی تھی یقین نہیں۔ ایسا نہ ہو اللہ میاں مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

نائلہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

ج: پیاری گوشی! موت سے بڑی اذیت ناک حقیقت کوئی نہیں۔ اپنے پیاروں کی ابدی جدائی۔ یہ اذیت، دکھ کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ دل کو کاٹتا ہے۔ انسان جانے والوں کو بھولتا نہیں، دنیا کے جھمیلوں میں الجھ جاتا ہے لیکن جب جب تنہا ہوتا ہے۔ جانے والوں کی باتیں ان کے ساتھ گزارے لمحے یاد آتے ہیں۔ کیا کہیں انسان بہت بے بس ہے، اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے۔ آمین

اپنی والدہ کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

آپ لوگوں سے محبت، خلوص اور اپنائیت کا ایسا گہرا رشتہ ہے کہ ادارے سے منسلک ہر فرد کی خوشی غمی سب بڑی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ عابد حسین صاحب کے انتقال پر بہت دکھ ہوا۔

اکتوبر کے شمارے کا سرورق حسین لگا سوائے ہیئر اسٹائل کے۔ کہنی سنی میں بہت خوب صورت الفاظ میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کی گئی باشبہ۔ "کرن کرن روشنی" مفید اور معلوماتی ہے، اگر دم کرنے والی آیتیں بھی بیان کردی جاتیں تو اور بھی اچھا رہتا۔

بہنوں کی محفل میں پہنچے تو تمام ہی خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ آپی آپ ہمیں اور تمام بہنوں کو اس قدر محبت سے اہمیت دیتی ہیں کہ خود پر رشک آنے لگتا ہے سچ بتاؤں اپنے خط سے زیادہ آپ کے جواب سے خوشی ملتی ہے۔ اور یہ جو آپ نے صدف عمر کو جواب دیا کہ چھ صفحات کا پڑھ کر لطف آیا ذرا ہمیں بھی یہ خط پڑھوا کر لطف اندوز ہونے کا موقع دیں۔ صدف ناصر آپ اس ماہ شعاع میں نظر آئیں جناب آپ کو وعلیکم السلام خوش رہیے۔

داتہ پانی کے بارے میں لگتا ہے ہمارے اندازے درست ہونے جا رہے ہیں کہ اختتام ٹریجڈی ہی ہوگا۔ کردار تو تمام ہی عمیرہ نے اچھے لکھے ہیں لیکن گاموکا کردار بہت خوب صورتی سے نبھایا ہے۔

سچ یہ ہے کہ مالا کی تعریف کے قابل ہمارے پاس الفاظ نہیں، ماہر اور بیربل کی نوک جھونک پر بہت مزہ آتا ہے، نمرہ کی ایک ایک سطر کے پیچھے کوئی نہ کوئی انکشاف چھپا ہوتا ہے مالک کے بے فیلے اور بے حس چہرے کے پیچھے کیا کہانی ہے، یہ سب جاننے کا بے صبری سے انتظار ہے ویسے اس ماہ مالا کی قسط کے ابتدائی چار صفحات پچھلی قسط والے ہی کیوں لگا دیے۔ مشک بام بڑی پیاری کہانی ہے، اس پر میرا کا خوب صورت انداز بیاں۔ لگتا تو یہ بھی ہے کہ چراغ اور شمس کو آگے جا کر کئی آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔

مال غنیمت آنکھیں کھول دینے والی سبق آموز تحریر تھی، انسان کی اپنی فطرت بھی ہوتی ہے لیکن شاید ثانیہ اور رانیہ پر ماں کی عادات اور خصائل کا اثر اس درجہ تھا کہ ان کی اپنی عقل وشعور پیچھے رہ گئی، سمجھ میں آئی بھی تو اس وقت جب ناقابل تلافی نقصان ہو چکا تھا۔

"وہ جو پیچھے رہ گئے" آسیہ رئیس خان کی تحریروں میں ایک اور زبردست اضافہ ہے۔ اگر ماں کو بھی بیٹے سے ملنے کی خوشی ملتے دکھایا جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا، بہرحال کہانی لاجواب تھی۔

قرۃ العین سکندر کا ناولٹ اچھا لگا شادی شدہ بیٹیوں میں احساس جگانے کے لیے ایسی تحریریں آتی رہنی چاہئیں۔ سیما بنت عاصم کی تحریر کافی عرصے بعد نظر آئی۔

سونیا ربانی نے مختصر اور اچھا لکھا مگر یہ بھی کہیں گے کہ ناپاپ کا سکے آ بیٹھنا غلط نہ سہی لیکن چھ سالوں میں صرف ایک فرمائش اور اس پر رضوان کا اتنا سخت رویہ کچھ عجیب اور برا لگا۔ افسانوں میں قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ ناپ پور ہا کول کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

رائٹرز کے انٹرویوز کا سلسلہ ہمارا پسندیدہ ہے نایاب جیلانی سے ملاقات اچھی لگی۔ شاندار باتیں اچھی لگیں سوائے سوال نمبر 47 اور 68 کے جوابات کے۔ انشا جی کی غزل فقیر بن کر... خاص طور پر یہ مصرع ہمیشہ ہی ہم پر ایک الگ ہی اثر کرتا ہے کہ جبیں کے لکھے کو کیا کرو گے، جبیں کا لکھا مٹا کے دیکھو۔ واہ بہت خوب۔

بشریٰ طارق کا باورچی خانہ اچھا لگا پرانے تولیے کے ٹکڑے والی ٹپ پر ہمیں یاد آیا کہ یہ ٹپ ہم نے اسکول کے زمانے میں کرن کتاب میں پڑھی تھی اور باقاعدگی سے اس پر عمل بھی کرتے تھے لیکن اس میں کوئی بھی فالتو پرانے کپڑے کے پیس لکھے تھے تولیہ کی شرط نہیں تھی، کیا پیارا دور تھا وہ بھی جب، ڈائجسٹ میں دی گئی ایک ایک ترکیب اور نسخے پر عمل کر کے داد وصولتے تھے، اب یہ دن ہیں کہ آئینے میں روز دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ ہاں اس بار بہت عرصے بعد کھجور، کھویا حلوہ کی ترکیب ٹرائی کی اور محض آٹھ منٹ میں تیار ہو جانے والا یہ حلوہ لذیذ اور منفرد

ڈالتے کا تھا۔

ہیوٹی بکس کے مشورے مفید تو ہوتے ہی ہیں لیکن ان میں اصل آپی کا خلوص بھی جھلکتا ہے پوری سچائی سے کہوں گی کہ آپ لوگ اپنے قارئین کے ساتھ ہر معاملے میں جتنے مخلص ہیں، اتنا کسی اور ادارے کو نہیں دیکھا۔ کوثر بہن کو بالوں کے مسئلے پر جو مشورہ دیا اس پر ایک یاد آپ سے شیئر کروں گی، کسی دور میں میرے بال سنہرے ہوا کرتے تھے اور میری کزنز اور ان کی مائیں ڈراتی تھیں کہ تمہارے بال کچھ دنوں میں سفید ہو جائیں گے، تم بوڑھی ہو جاؤ گی، عمر میری کم تھی بے وقوف بھی بہت کہ کسی کو بتانے کے بجائے عجیب ڈر دل میں بٹھا لیا بس ہم نے ہیوٹی بکس میں ریٹھے سکا کائی اور آملے کا نسخہ دیکھ کر استعمال کیا اور مسلسل استعمال سے ہمارے بال سیاہی مائل براؤن ہو گئے۔

ج: پیاری ناہید! خط تو آپ کا بھی بہت پر لطف ہوتا ہے۔ کہانی کے کرداروں پر آپ کا تبصرہ ہمیں بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ اس سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے جو مقصد سامنے رکھ کر کہانی کو منتخب کیا تھا وہ آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہیں لیکن خط زیادہ اور صفحات محدود، اس لیے ہمیں آپ کا خط بھی ایڈٹ کرنا پڑتا ہے تاکہ زیادہ قارئین کے خطوط شامل ہو سکیں۔

آپ نے صحیح لکھا کہ تربیت کے ساتھ انسان کی اپنی سوچ اور فطرت بھی ہوتی ہے۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ انسان فطرتاً آرام طلب اور سہل پسند واقع ہوا ہے۔ ماں کو لاپروا دیکھا تو بیٹیوں نے بھی وہی روش اپنا لی۔ ام ایمان قاضی کے ناول میں یہی دکھایا گیا ہے۔

بیاض کے اشعار آپ کو پسند نہیں آئے۔ ہم اس سلسلے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

نوشی مغل ....جلال پور بھٹیاں

ماڈل کے بالوں کا ڈیزائن پیارا تھا لیکن ایئر رنگز تھوڑے پینڈو ٹائپ لگے (معذرت)۔ "کبھی سنی" پر نظر ڈالی عابد حسین صاحب کو اللہ اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ کرن کرن روشنی سے دل منور کیا۔ باتیں "ثنا نادر سے" میں ان کو جانتی ہی نہیں۔ نایاب جیلانی اس بات کی آپ کو داد دینی پڑے گی کہ آپ نے اتنے اچھے طریقے سے بچوں کی پرورش کی۔

دانہ پانی" تاجور نے غریب کی بیٹی کی عزت رول دی۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ مسز خورشید میں مجھے اپنا بڑھاپا نظر آیا۔ اس کے بعد "فیصلہ" پڑھا۔ مطلب نایاب کی ماں نے صرف نایاب کو سنانے کے لیے یہ سب کہا تھا۔ اس کے بعد "سیما بنت عاصم" کا افسانہ پڑھا۔ پڑھ تو لیا لیکن معذرت کے ساتھ مجھ کم عقل (ہی ہی) کو کم ہی سمجھ میں آیا۔ پھر اس کے بعد (اکلوتے / لاڈلے) ناولٹ کو پڑھا۔ ہائے بڑا مزا آ گیا۔

اب بات ہو جائے آسیہ رئیس خان کے ناول کی۔ سپر کمال تھی اسٹوری۔ جب اسیر اپنے بھائی کی ڈیتھ اسٹوری سنا رہا تھا تو نجانے کیوں میری آنکھوں میں اتھرو (آنسو) آ گئے کیونکہ آج سے پندرہ سال پہلے (میری کزن نے بھی غلطی سے ایکسپائرڈ دوائی کھالی اور وہ دوائی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی ان کی شادی کو صرف دو ہفتے رہ گئے تھے لیکن یہ خوشیاں اس کو نصیب ہی نہ ہوئیں۔ پھر دنیا والوں نے وہ وہ باتیں کیں کہ توبہ (لڑکی کو عشق تھا اس لیے اس نے گولیاں کھائیں) ایسے ایسے الفاظ تک بولے خیر) اختتام اچھا تھا۔

ج۔ پیاری نوشی! آپ کا خط پڑھنے میں بہت دشواری ہوئی آپ نے صفحہ کی دونوں سائڈ پر لکھا اور پھر سطر بھی نہیں چھوڑی آئندہ خط لکھیں تو سطر ضرور چھوڑیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نصرت زاہد......لاہور

السلام علیکم۔ کرن کرن روشنی سے مستفید ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ نایاب جیلانی صاحبہ سے ادھوری ملاقات پوری ہوئی۔ بلاشبہ وہ بہت اچھی رائٹر ہیں۔ ہمارے نام ایک خوب صورت سلسلہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری بہنیں میکہ میں اکٹھی ہو گئی ہوں اور آپ کا سب کو پیار سے مخاطب کرنا دل میں ٹھنڈک سی بھر دیتا ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ عمیرہ احمد بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ موتیا کے ساتھ بہت برا ہوا۔ ایک عورت کے رعونت بھرے فیصلے سے ایک پورا گھرانہ دکھ

اور اذیت کی انتہا تک پہنچ گیا۔ کہانی ایسے موڑ پر لا کر آپ ختم کرتی ہیں کہ بس اب آگے کیا ہوگا یہ سوال پورا مہینہ بے چین رکھتا ہے۔ "چکر" میں نازش کو اس کے صبر کا بڑا اچھا صلہ ملا۔ قرۃ العین سکندر نے اینڈ خوش گوار کیا جو محبت بھرے دل ایک ہوگئے۔ سیما بنت عاصم بہت عمدہ لکھا آپ نے۔ دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ ان کہے دکھ آپ نے اپنے قلم کی زینت بنالیے۔ آسیہ رئیس صاحبہ نے اچھا لکھا۔ سونیا ربانی کا افسانہ مختصر لیکن اچھا تھا۔ ام ایمان قاضی کی تحریر پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

ج: پیاری نصرت! غرور و تکبر اور حسد انسان کو اندھا کردیتا ہے وہ اس غرور میں مبتلا ہو کر غلطیاں کرتا ہے اور دین و دنیا کا خسارہ مول لیتا ہے۔ تاجور بھی غرور میں اندھی ہوچکی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خواتین آپ کو پسند آیا۔ تہ دل سے شکریہ۔

منال بٹ......... گوجرانوالہ

کئی ماہ سے شمارہ بہت دیر سے ملتا ہے۔ شائع ہی لیٹ ہوتا ہے یا پھر ٹرانسپورٹ کی خرابی کی وجہ سے لیٹ آرہا ہے۔ صدف عمر نے ناول بھیجا ہے نومبر میں ان کے ناول کا انتظار رہے گا۔

اس ماہ مالا کو پڑھا لو جی یہ کیا اب اے۔ آر وائے والوں کی طرح آپ نے بھی آدھی قسط تو پچھلی والی لگادی اور آدھی نئی ہے......؟ مالا میں نمرہ احمد کو اب کیف (ماہر) اور مالا کی ایک رومینٹک سی ملاقات کروا دینی چاہیے اور دوسری بات یہ کہنی تھی کہ نمرہ ماہر کیف کی بہن کو بھی سامنے لے ہی آئیں کہ وہ کہاں ہے کس کے پاس ہے۔ دانہ پانی، عمیرہ احمد نے موتیا کی حالت ایسی بناڈالی ہے یقیناً اب وہ اللہ والی بن جائے گی لوگ اس سے دعا کروانے آیا کریں گے اور اس طرح گدی سیدوں سے گاموں ماچھی کے گھر آجائے گی۔ نایاب جیلانی سے ملاقات مکمل ہوگی، مزہ آیا پڑھ کر لمبا انٹرویو۔ ثنا نار بیس سال کی لگتی تو نہیں۔ خیر انہوں نے تو اگلے پانچ سال بھی بیس کی رہنا ہے۔ عدنان بھائی کے مشورے ہمیشہ کی طرح اچھے ہی تھے سب سے پہلے پڑھتی ہوں بشریٰ طارق کا باورچی خانہ اور ان کا کھٹا میٹھا آملیٹ اچھا لگا اور مہمانوں کی اچانک آمد کا تو مت پوچھیں۔

اس ماہ بھابھی اور امی اچانک صبح دس بجے ہی آگئیں۔ گھر بکھرا پڑا۔ ہم آنکھیں مل رہے تھے نیند سے۔ بچوں کو اسکول بھیج کر سو جو گئے تھے۔ بس جی پھر کیا تھا جو صلواتیں اماں سے سننے کو ملیں۔ "دس بج گئے ابھی تک سو رہی ہو گھر بکھرا پڑا ہے اتنے بجے تک لوگ کتنے کام نپٹا لیتے ہیں۔" بہت صفائیاں دیں اماں کو کہ یہ شہر ہے، لوگ لیٹ اٹھتے ہیں آپ کے گاؤں میں جلدی اٹھ جاتے ہیں مگر اماں نے کانوں کو ہاتھ لگوائے ایک ہفتہ رہ کے گئیں اب ان کے جانے کے بعد بھی میں اس دن سے صبح جلدی اٹھ کر سب کام کرلیتی ہوں۔

"مشک بام" سمیرا حمید کے بارے میں اکثر قاری بہنوں کا کہنا کہ لگتا نہیں یہ سمیرا حمید لکھ رہی ہیں تو یہ ہے کہ اس بار واقعی وہ ذرا ہٹ کر لکھ رہی ہیں مگر انداز وہی ہے ان کا لکھنے والا، ویسے سمیرا آپ کے اس ناول کو پڑھتے لگتا ہے جیسے کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔

"وہ جو پیچھے رہ گئے۔" آئمہ رئیس خان اچھی اسٹوری تھی مگر خاص مزہ نہ آیا وہی آپ کا ہمیشہ کی طرح پرانا ٹاپک تھا آپ کے ہر ناول میں ہیرو کرایہ دار ہی کیوں ہوتا ہے ہیروئن کے گھر میں ادارے والے بھی ذرا غور کریں میری اس بات پر ایک وہ لاسٹ منتھ ان کی اسٹوری چلی تھی نام تو یاد نہیں مگر وہ دادی پوتی والی جس میں کتھارسس باکس تھا جس کے پاس لڑکی بیٹھ کر اپنے دل کی تمام باتیں کرتی ہے۔ جبکہ اسے علم بھی ہے کہ گھر میں ایک کرایہ دار ہے جس کے کمرے کے پاس وہ بیٹھی ہے اب پھر ایک کرایہ دار "مال غنیمت" ام ایمان قاضی آپ کی اس تحریر کے لیے سو فیصد نمبر دوں گی میں۔ بہت عرصہ بعد ایسی تحریر ملی پڑھنے کو جو مجھے ساری زندگی یاد رہے گی، اتنی اچھی بات سمجھادی آپ نے کہ ہمیں اپنی بیٹیوں کو مال غنیمت نہیں بننے دینا۔ اپنی بیٹیوں کی انگلی ہر وقت تھام کر رکھیں جہاں بھی جائیں۔

"تیرے جیا کوئی اور نہ" قراۃ العین سکندر اچھی تھی بس بہت زیادہ پسند نہ آئی۔

"چکر" قرۃ العین خرم ہاشمی آپ کی تحریر بہت پسند

Scanned with CamScanner

آئی، حالات کی ماری نازش کو صبر کا پھل مل گیا۔" محبت ریت جیسی تھی" "سیما بجت عاصم" دل کو لگی آپ کی تحریر، پڑھ کر کہیں دور ہی کھو گئی میں بھی، اچھی لکھی آپ نے محبت ریت جیسی بہت پسند آئی۔

"فیصلہ" "سونیا رہانی" آپ نے جو لکھا ٹھیک ہی لکھا۔ ایک ماں کو ایسا ہی ہونا چاہیے جیسی نایاب کی ماں تھی۔ ایسی کہانیاں جو زندگی میں ہماری رہنمائی کریں زیادہ سے زیادہ شامل کیا کریں۔

صدف عمر کا خط پڑھ کر اس بار بہت مزہ آیا تمام خطوط میں بیسٹ لگا اور دوسرا کوشی کا۔

ج۔ پیاری مثل آپ کی امی کا آنا آپ کے لیے بابرکت ثابت ہوا۔ اب آپ صبح جلدی اٹھ جاتی ہیں۔ صبح کے وقت میں برکت ہوتی ہے۔ صبح خیزی بہت اچھی عادت ہے۔ پچھلے دو ماہ حالات کی وجہ سے پرچا لیٹ ہوا اب اس ماہ سے آپ کو پہلے کی طرح پرچا جلدی ملے گا۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ کوشش کریں گے اس ماہ آپ کی کہانیاں پڑھ لیں۔

عمیرہ احمد کے ناول میں موتیا کے بارے میں آپ کے اندازے کتنے درست ہیں۔ یہ آپ خود ہی پڑھ لیں گی۔ صدف عمر کا ناول اس ماہ کے شعاع میں شائع ہوا ہے۔

انجم وجاہت.........جلال پور جٹاں

میاں صاحب جتنی بار بھی بازار گئے میں یاد کروانا نہیں بھولی بالآخر پرسوں شام چار بجے جب میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی تو وجاہت نے شاپر لا کے پکڑایا کہ یہ لو اپنے دونوں رسالے۔

ٹائٹل پہ بچی مسکراتی ہوئی ماڈل دل کو اچھی لگی اس دفعہ دونوں رسالوں پہ سرخ سوٹوں میں ماڈلز اچھی لگیں اس کے بعد نایاب جیلانی کے بارے میں جان کے بہت اچھا لگا اور ان کی شادیوں کے بارے میں سن کے افسوس بھی ہوا بچوں کو تو ہمیشہ ماں اور باپ دونوں ساتھ چاہیے ہوتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ جان کے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ نایاب میرے میکہ شہر لالہ موسیٰ سے ہیں کبھی موقع ملا تو نایاب آپ سے ضرور ملاقات ہوگی ان شاء اللہ۔

ناہید بہن آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا بہت شکریہ اب بات ہو جائے اپنے دونوں فیورٹ ناول، مالا اور دانہ پانی کی، یہ مراد نے کیا کیا موتیا کے ساتھ، تاجور کا تو ٹھیک علاج ہوا کہ اس کو پانی کڑوا لگ رہا ہے لیکن ماہ نور کا کیا قصور پلیز پلیز عمیرہ آپی موتیا کو مت ماریے گا پلیز۔

مال غنیمت ایک بہت ہی اچھی اور سبق آموز تحریر تھی ماؤں کی ایسی غفلت بیٹیوں کی زندگی برباد ہی کرتی ہے اور آج کل کے زمانے میں تو ماؤں کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

وہ جو پیچھے رہ گئے بہت سے لوگوں کو پچھتاوے سے نکالنے والی بہت اچھی تحریر۔ صائبہ کے صبر کا پھل اسے بہت اچھا ملا اور شکر ہے اس کا بھائی زندہ سلامت واپس مل گیا۔ تیرے جیا کوئی اور نا اپنی طرز کی بہت ہی اچھی تحریر نلین بھی کسی حد تک ٹھیک تھی۔ کہ بیاہی بیٹیاں یوں میکے والوں کو پریشان کریں، اب بات ہو جائے افسانوں کی تو چکر بہت اچھی تحریر تھی، کومل نے جو بویا وہی کاٹا۔ شادی شدہ لڑکیوں کے لیے ایک اچھا سبق تھا، سیما بجت عاصم نیا نام لگا مجھے بہت اچھی اور اداس کر دینے والی تحریر۔

نیمہ ناز خواتین اور شعاع دونوں میں ہی نظر نہیں آئیں خیریت ہے نا، باقی سارے سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔

ج۔ پیاری انجم بال سیاہ کرنے کے بارے میں آپ کا سوال ہم نے بیوٹی بکس کو دے دیا ہے۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی اور بہت اچھے تبصرے کے لیے شکریہ۔

سونیا رہانی.........قاضیاں محلہ بالا

آج کافی زمانے کے بعد میں خواتین میں خط لکھ رہی ہوں۔ اور مجھے بالکل بھی خبر نہ تھی کہ میرے پہلے افسانے کی خوشی مجھے خواتین میں ملے گی؟

میں ولید اور اشعر کے اسکول کے کپڑے استری کر رہی تھی جب نعمان خواتین لے کر آیا۔ تو افسانوں میں اپنا نام نظر آیا۔ میں وہ خوشی بیان نہیں کر سکتی ہوں۔ سب میرے لیے دعا کریں جیسے مجھے میرا نام واپس مل گیا ہے ویسے ہی میں خود کو پا لوں اور بالکل ٹھیک ہو جاؤں۔

اکتوبر کے شمارے کی ماڈل کے بال بہت پیارے
لگے۔ نایاب جیلانی سے ملاقات کا دوسرا حصہ بہت اچھا
لگا۔ رائٹر کیسے خود سے ہٹ کر اتنا خوب صورت لکھ لیتی
ہیں۔ ناول عمیرہ احمد کا "دانہ پانی" میں یہ کیا سوچ رہے
ہیں موتیا کے ماں، باپ؟ مراد کے کمرے سے موتیا کی
خوشبو؟ کیا سچ مچ عشق جادو بن جاتا ہے۔

مکمل ناول میں آسیہ رئیس کا، وہ جو پیچھے رہ گئے،
دوسرے نمبر پہ۔ پہلے نمبر پر تو مالا ہے۔ کیونکہ نمرہ میری
فیورٹ ہیں کاش وہ قراقرم کا تاج محل جیسا پھر سے کچھ
لکھتیں۔ جو پیچھے رہ گئے مگر سب کو ڈاکٹر اسیر زماں کہیں مل
پاتے ناں۔ میرے ماموں طارق محمود بھی اک زمانے
سے بیمار ہیں اور ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ نانی اماں
کے گزر جانے کے بعد وہ بچوں سے پتھر کھاتے اور
بازاروں میں گھومتے ہماری اماں کی عید روتے گزر جاتی۔
پھر دس برس پہلے میرے بھائی ان کو تلاش کر کے لے
آئے۔ اب وہ اماں کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وقت پہ
روٹی، پانی مل جاتا ہے، کوئی بات نہیں کرتے آرمی میں
جاب کر رہے تھے مگر اچانک چھوڑ آئے۔ دماغ نے کام
کرنا چھوڑ دیا۔ وہ پاگل ہو گئے اور یہ پاگل پن عشق کی
ناکامی کی وجہ سے ہوا۔ اور اب جب میں بیمار ہوئی تو اماں
بہت روتی تھیں کہ پہلے بھائی تھا اب بیٹی کا بھی حال ہوتا
جا رہا ہے۔ شاید سچ ہی ہے کہ محبت ہار کر جینا دشوار ہوتا
ہے۔

خیر میں بھی کہاں نکل گئی۔ قرۃ العین کا تیرے جیا،
کیا کہوں یار۔ میں تو خود بھی پکی اماں کے گھر پڑی ہوں
مگر نگین کی بہنوں والا سین نہیں ہے۔ ہم کام مل جل کر کرتے
ہیں اور کھانا بھی مل کر بناتے ہیں اور اپنے بچوں کی فرمائش
خود پوری کرتی ہوں، ہاں میری دوائی اور علاج ابو کے سر
ہے اللہ ان کو صحت اور زندگی دے۔ آمین۔

پہلے نمبر پہ سیما بنت عاصم، محبت ریت جیسی تھی۔
ایسی ریت تو ہر مٹھی میں پائی جاتی ہے اور کبھی کبھار کوئی لمحہ
ایسا آ جاتا ہے کہ ہم ہو کر بھی موجود نہیں ہوتے۔ (راز کی
بات بتاؤں تم سب کو؟) میں جون کی گرمی میں کچن میں
کھڑی ہوتی تھی اور میری روح، میرا دل میرا دماغ مری
کے ٹھنڈے برف والے پہاڑوں پہ ٹھنڈی ہواؤں میں
ہوتا تھا۔ دوسرے نمبر پہ "چکر" رہا بہت اچھا ہوا کومل کے
ساتھ۔ اور تیسرا نمبر رہا سونیا ربانی کے فیصلہ کا۔ اب آپ
سب کو فیصلے کا انتظار ہے؟

اچھا جی اجازت دیں ہمارے سسرال میں ہماری
دعوت ہے اصل میں وہاں پہ کسی کی دعوت ہے اور اس
دعوت کی خاطر ہم کو دعوت دی گئی ہے۔ (سمجھ تو گئے ہوں
گے ناں) ہاں یاد آیا۔ 26 نومبر کو احمر رضوان دونوں باپ
بیٹے کی سالگرہ ہے وش کر دیں۔

ج: پیاری سونیا! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا
فرمائے صحت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں ہے۔
آپ کے والد کو اللہ سلامت رکھے۔ وہ آپ کا خیال رکھ
رہے ہیں۔ آپ ان کی خاطر ٹھیک ہونے کی کوشش
کریں۔

اپنی سوچوں کو مثبت رکھیں۔ کسی کی خاطر ہی سہی
آپ کے سسرال والوں نے آپ کو بلایا، آپ کو یاد رکھا۔
یہی بڑی بات ہے۔

محبت ہار کر جینا مشکل سہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے
کہ دنیا میں کوئی بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کے لیے دنیا
تیاگ دی جائے۔ محبت مل جائے۔ بہت اچھا ہے لیکن نہ
ملے تو اس کو روگ نہیں بنانا چاہیے۔ کچھ وقت گزر جانے
کے بعد سب بھول جاتے ہیں۔

احمر رضوان کو سالگرہ مبارک..... اللہ تعالیٰ زندگی
صحت کے ساتھ بہت ساری خوشیوں سے نوازے۔ آمین

صدف ناصر........ گوجرانوالہ

ماہ اکتوبر کا ٹائٹل بہاروں سا کھلا کھلا خوب صورت،
لگا۔ "کبھی سنگی" میں شامل ہوئے تو بہاروں سے بڑھ کر ہی
سماں لگا آمد رسول کا۔ ماشاء اللہ

"کرن کرن روشنی" بہترین سلسلہ۔ ہر بات شان
دار اور مفید۔

"نقیر بن کر" جب جب پڑھو تب تب پہلی دفعہ جتنا
ہی مزا آتا ہے۔ جناب عابد صاحب اور محمود بابر فیصل کے
لیے خصوصی دعا گو ہیں۔

"ہمارے نام" ولی تسکین کا بہترین سلسلہ۔ تمام

تبصرے جان دار اور اچھے۔ "کوثر جمال" دوستی اور محبتوں میں کوئی شکریہ نہیں ہوتا۔ "ناہید اسماعیل" بہت ہی نفیس اور نرم دل ہیں۔ ہر بہن کے ساتھ محبت سے پیش آتی ہیں۔ "مقدس" طوبیٰ، صدف، دو ماہ سے غیر حاضر ہیں۔ ہماری ایک شان دار سی رائٹر تھیں۔ "رفعت ناہید سجاد" وہ کیوں لکھنا چھوڑ گئیں۔ "ثمرہ بخاری" کا نیا ڈراما "قلندر" دیکھا بہت دل اداس ہوا۔ ایک گھنٹہ نہیں لگتا ایک افسانہ لکھا جاتا ہے۔ چلیں مرضی ہے سب رائٹرز کی۔ خوش رہیں۔ "دانہ پانی" کیا ہی زبردست تحریر ہے "عمیرہ احمد" کی۔ "تاجور" پے در پے غلطیاں کر رہی ہے۔ اپنی مرضی سے بھاگی تو بیاہ لائی۔ اب آگے دیکھیے موتیا کی خوشبو کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ "مکمل ناول" یک نہ شد چار چار شد۔ (ہاہاہا) "ماہ" "الجھتے الجھتے بہت حد تک سلجھ گئی ہے۔ "ماہ" "زیاد" کے چنگل میں نہ ہی پھنسے تو بہتر ہوگا۔ "تمینہ سرکار" کے داؤ الٹے لگ گئے خود اسی پر بگڑ باز نہیں آ رہی۔ "بیربل" کا کردار بہت مزے کا ہے۔ "مال غنیمت" ام امان قاضی کی اس سال کی بہترین اسٹوری۔ تمام ماؤں اور بیٹیوں کو سبق دیتی ہوئی اور آنکھیں کھولنے کو کافی تحریر۔

ہر ماہ خطوط میں پڑھنے کو ملتا ہے ہمارے گھر والے ڈائجسٹ کو اچھا نہیں سمجھتے، پھاڑ دیتے ہیں۔ یہ تحریر "مال غنیمت" پڑھا دیجیے۔ سب تماشہ ہوتا کہ انہیں پتا چلے آپ کی بیٹیاں اور بہنوں کو کیا کیا بتایا اور سکھایا جا رہا ہے۔

"وہ جو پیچھے رہ گئے" آسیہ رئیس نے بے حد رلایا۔ اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ "نایاب" کا رونا بھی غلط نہیں لگا مجھے۔ تحریر پڑھ کر دل پھٹنے کو ہے۔ "دولت تیرے جیا کوئی اور نا" اچھا لگا۔ پلاٹ اگرچہ پرانا مگر نہ سمجھنے والوں کے لیے بار بار بھی ایسی تحریریں آئیں تو کم ہیں۔ "نگین" نے اچھا کیا کھری کھری سنا دیں ورنہ "عاقب" سے شادی کر کے تاعمر بڑی بہنوں کے پیچھے ہلکان ہوتی۔

"افسانوں" کی مختصر ترین نگری میں گئے۔ "چکر" ہمیں دیا "قرۃ العین خرم" نے ایک شکوہ ہو رہا ہے کہ قرۃ العین اب افسانے کو طویل کر دیتی ہیں۔ سات آٹھ صفحات پر مشتمل افسانہ گراں گزرتا ہے (معذرت) مگر بلاشبہ بہترین افسانہ نگار ہیں۔ یہ تحریر بھی زبردست۔ "سونیا ربانی" کو سب سے پہلے تو افسانہ نگار بننے پر دلی مبارک باد۔ سونیا نے اچھا "فیصلہ" سنایا ہمیں۔ "سیما بنت عاصم" "محبت ریت جیسی تھی" سنا رہی ہیں۔ جو کہ محبت نہیں تھی محض وقتی اٹریکشن تھی۔ پیچھے محترمہ نے اچھی خاصی خوشحال زندگی خواہ مخواہ کی "فرسٹریشن" میں گزار دی۔ بہرحال اچھا افسانہ ہے۔

"آپ کا باورچی خانہ" بشریٰ طارق کی دو عدد "ریسپیز" کے ساتھ اچھا لگا۔ ان کے مہمان بھی میرے مہمانوں کی طرح منہ اٹھائے آ دھمکتے ہیں۔ مہمان سو مرتبہ آئیں مگر بتا کر آیا کریں تاکہ کوکنگ پہلے سے کی ہو تو مل کر بیٹھنے کا زیادہ سے زیادہ ٹائم ملے۔ (یہ پیغام اپنی سسرز کے لیے۔ ہما سیرا کے لیے) ہاہاہا!

پیاری صدف! ہر ماہ آپ کا تبصرہ اتنا بھرپور اور جان دار ہوتا ہے کہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ ہر تحریر، ہر سلسلہ کو پوری توجہ سے پڑھتی ہیں اور درست تبصرہ کرتی ہیں، بہت شکریہ صدف۔

زرینہ خانم بخاری ۔ مظفر گڑھ

ستمبر کا خواتین ملا گلابی کپڑوں والی معصوم سی ماڈل دل کو بھائی۔ آگے بڑھے "کرن کرن روشنی" پڑھی دل کو روحانی سکون ملا۔ انشاء جی کی باتیں دل میں کھب جاتی ہیں پڑھ کر مزا آتا ہے۔

نایاب جیلانی سے ملاقات کی۔ ان کی کہانیاں افسانے منفرد اور دل چسپ ہوتے ہیں اور بلاشبہ ان کی لمبی لمبی تحریریں ہوتی ہیں چھوٹے چھوٹے افسانے نہیں ہوتے، ہمارے نام والا سب سے اوپر اوپر میرا خط تھا ہم نے اپنے آپ کو نمبر ون سمجھ لیا۔ پیاری مدیرہ میرے خط لیٹ اس لیے ہوتے ہیں کہ سب پڑھنے والیاں پہلے خود قبضہ کر لیتی ہیں مجھے لیٹ پڑھنا نصیب ہوتا ہے۔ دانہ پانی بڑی عجیب پوزیشن میں آ گیا۔

منزل مراد نعیمہ ناز کا بہترین ناول تھا صحیح ہے

بقیہ صفحہ نمبر 219

عمیرہ احمد

دانہ پانی

پچھلی قسط کا خلاصہ

مراد کی بارات حویلی نکلتی ہے، ڈھول تاشوں کا شور اور سکوں کی برسات میں برات موتیا کے گھر کے سامنے پہنچتی ہے۔ گامو استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ تاجور کہتی ہے بارات کا راستہ صاف کراؤ بارات نے دوسرے گاؤں جانا ہے۔ گامو کے علم میں آتا ہے کہ چوہدری شجاع نے مراد کا رشتہ اپنے سالے کی بیٹی کے ساتھ کردیا ہے۔ موتیا پر سکتے کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

ماہ نور بیاہ کر حویلی آجاتی ہے، مراد گھونگھٹ اٹھاتا ہے تو اس کے منہ سے بے اختیار موتیا کا نام نکل جاتا ہے۔

شکوراں، بتول کی شادی سے ایک رات پہلے اسے بتاتی ہے کہ کس طرح تاجور نے موتیا کی بے عزتی کی۔ وہ

اسے موتیا کی ذہنی حالت کے بارے میں بھی بتاتی ہے۔ بتول دل میں ڈرتی ہے کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے کہ اس کی ذمہ دار بتول ہے۔ گامو، موتیا کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتا ہے تاکہ انہیں اپنی بیٹی کی حالت دکھا سکے جس کی ذمہ دار ان کی بیٹی تاجور ہے۔ پیر ابراہیم موتیا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کے خاندان کو بد دعا نہ دے۔ اس دن ماہ نور پہلی بار موتیا کو دیکھتی ہے اور اس کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔

پیر ابراہیم تاجور سے کہتے ہیں کہ وہ گامو اور اس کے خاندان سے معافی مانگے۔ وہ انکار کر دیتی ہے مراد واپس انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ حویلی میں نئے مہمان کی خوش خبری ہے۔ مراد فون پر بھی ماہ نور سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ اس کا دھیان اکثر موتیا کی طرف چلا جاتا ہے۔
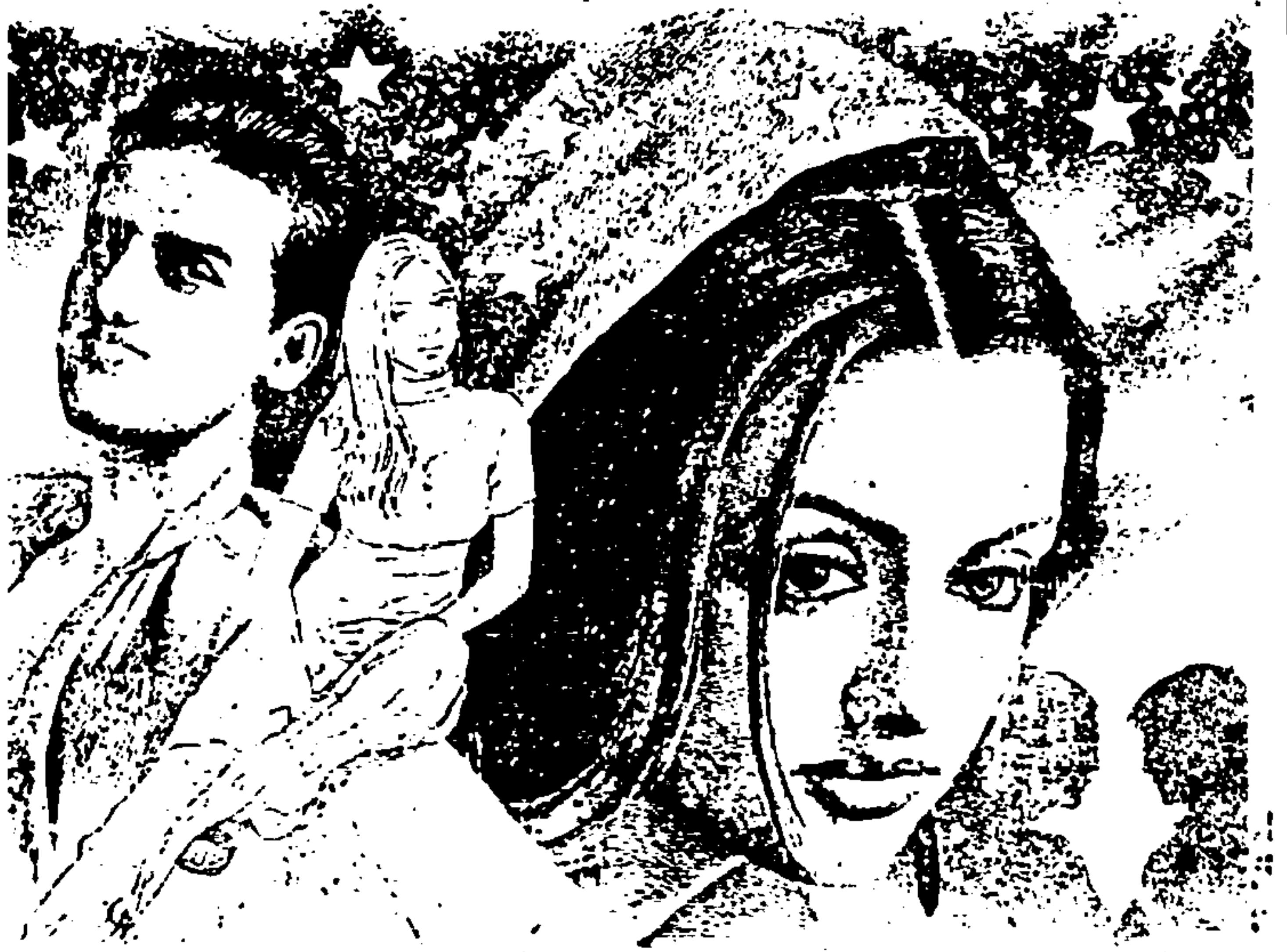
موتیا گاؤں میں پاگل مشہور ہو جاتی ہے۔ گامو اللہ سے شکوہ کرتا ہے کہ حویلی میں خوشیاں آرہی ہیں جبکہ اس کی بیٹی اب تک زندگی کی طرف نہیں لوٹی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے۔

اللہ وسائی اور وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے پھر اللہ وسائی نے اس سے کہا۔

''موتیا کو کون مارے گا؟'' گامو اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا

''تو!''

آٹھویں قسط

مٹی دا توں مٹی ہونا کاہدی بلے بلے
اج مٹی دے اُتے بندیا کل مٹی دے تھلے

اللہ وسائی بے یقینی کے عالم میں گاموکا چہرہ دیکھتی رہی پھر اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گاموسے کہا۔

"نہ گامو! یہ نہیں کر سکتی میں۔ جس اولاد کو منتوں مرادوں سے لیا ہے، اُسے اپنے ہاتھوں سے مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" اُس نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا تھا۔

"اور تو بھی کیوں سوچ رہا ہے مرنے کا؟ گاموست سوچ ایسا کچھ بھی...... یہ شیطان ہے جو تجھے بھٹکا رہا ہے۔"

اللہ وسائی نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر جیسے اُسے سنبھالا دینا چاہا تھا اور وہ گیلی آنکھوں کے ساتھ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا تھا۔

"شیطان کو کیا پڑی ہے اللہ وسائی کہ وہ جھوک جیون میں آئے...... یہاں اس کا کیا کام...... یہاں تو انسان کافی ہیں اُس کا کام کرنے لیے۔"

وہ ہنس رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ اللہ وسائی کا بھی دل بھر آنے لگا تھا۔

"نہ رو گامو نہ رو! مونتیا ٹھیک ہو جائے گی۔ تجھے یاد ہے جب اولاد نہیں تھی تو کتنے سال اولاد کے انتظار میں گزارے تھے ہم نے۔ کبھی زبان پر شکوہ نہیں لائے...... پھر رب سوہنے نے اپنی رحمت کر دی تھی۔ اب پھر کر دے گا۔ ٹھیک ہو جانا ہے مونتیا نے۔ دیکھنا تو۔"

اللہ وسائی شوہر کو تسلیاں دینے لگی۔ گاموا س کا چہرہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں اس بار دل کو تسلی کیوں نہیں ہوتی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ اُٹھ کر صحن کے چکر کاٹنے لگا۔ اللہ وسائی بے بسی سے بیٹھی شوہر کو دیکھتی رہی۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ شوہر کے لیے کچھ کر سکتی تھی، نہ بیٹی کے لیے۔ بے بسی سی بے بسی تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی اور اس کیفیت میں وہ بس رب سوہنے کو ہی پکار سکتی تھی اور پکار رہی تھی۔ غم تھا کہ سینہ چیر رہا تھا اور آنسو تھے کہ سیلاب بن کر سب کچھ بہالے جانے کے لیے کھڑے تھے اور دل کا بوجھ تھا کہ بھاری سے بھاری ہی ہوتا جا رہا تھا۔ نہ رونے سے گھٹ رہا تھا، نہ رب کو پکارنے سے۔ وہ بس گامو کو دیکھ رہی تھی جو ننگے پاؤں اُس صحن میں پھر رہا تھا جس کے فرش کو اب اللہ وسائی نے لیپنا بند کر دیا تھا۔

جھوک جیون میں اُس سال بارش نہیں ہوئی۔ اُس گھر میں دو انسانوں کی آنکھوں سے ہونے والی برسات نے جھوک جیون میں بارش لانے والے بادلوں کا سارا پانی پی لیا تھا۔

گاؤں میں پریشانی کی لہر دوڑی تھی۔ بڑے سالوں کے بعد یہ پہلا سال تھا جب جھوک جیون کے آسمان پر بدلیاں اُمڈ کر برسے بغیر گزر رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں کی طرح چوہدریوں کو بھی فکر ہوئی تھی۔ چوہدری مراد کا بیٹا پیدا ہو، اور گاؤں میں سوکھا پڑ جائے۔ یہ کم از کم تاجور کو تو برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن پھر اُس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ یہ اتفاقاً ہوا ہوگا، اس بار نہیں تو اگلے سال تو ضرور ہی بارشیں ہوں گی۔

مراد بیٹے کو دیکھنے تین مہینے کے بعد گاؤں آیا تھا اور اُسے گود میں لیے وہ بہت دیر اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"ہے نا خوب صورت تیرا بیٹا؟"

تاجور نے اُسے یوں بیٹے کو دیکھتے دیکھ کر جیسے فخریہ انداز میں کہا تھا۔ مراد نے جواب دینے کے بجائے بیٹے کا ماتھا چوما تھا اور اُسے ماہ نور کی گود میں دے دیا تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی بار پاکستان آیا تھا اور بالکل بدلا ہوا تھا۔ مختصر بات کرتا اور مسکرانا بھول گیا تھا۔ تاجور کو اُس کے رویے نے پریشان کیا تھا اور ماہ نور کو دل شکستہ۔ سارا سال تاجور اُسے

یہی کہہ کہہ کر بہلاتی رہی تھی کہ اولاد ہوتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا اور بیٹا ہونے پر تو مراد نے واقعی سب کچھ بھول جانا تھا، پر مراد کچھ بھی نہیں بھولا تھا نہ بدلا تھا۔ اُس کے لہجے کی ٹھنڈک میں کوئی شبنم نہیں اُتری تھی۔

وہ دس دن کے لیے آیا تھا اور چلا گیا تھا اور ان دس دنوں میں گاؤں کی ایک گلی میں اُسے موتیا کی یاد آئی تھی اور اُس کا دل چاہا تھا، وہ لوگوں سے اُس کا پوچھے پر اُس نے جیسے اپنے زبان اور دل پر قفل ڈال لیے تھے۔ اب کیا نام لینا موتیا کا...... کیا یاد کرنا اُس کو...... وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ شہر میں ڈاکٹر بن رہی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی اور سے شادی کر چکی ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو کر اُس پر ہنستی ہو۔ پتا نہیں مراد کو کیا کیا خیال آتے تھے اور سارے ہی خیال پل بھر میں غائب ہو جاتے تھے۔

دل موتیا موتیا کرتا تھا اور وہ اُس دل کو کوڑے مارتا تھا پھر بھی وہ مرتا نہیں تھا، ڈھیٹ تھا۔ موتیا کے پیار میں اُس سے بھی ڈھیٹ تھا۔ دماغ اچھا تھا اس معاملے میں اُس کی سنتا تھا۔ اس سے جب کہتا وہ موتیا کے بارے میں سوچنا بند کر دیتا۔

وہ دل اور دماغ کی یہ جنگ لے کر پاکستان آیا تھا اور پاکستان سے جاتے ہوئے ماہ نور کو ساتھ لے گیا تھا۔ یہ بھی تاجور کی ضد تھی، اُسے لگتا تھا بیٹا وہاں اکیلا رہتا تھا اس لیے بدل گیا تھا۔ ماہ نور اور اُس کا بچہ ساتھ رہیں گے تو مراد پھر وہی پہلے والا مراد ہو جائے گا۔ وہی ماں باپ پر قربان جانے والا، خوش مزاج، خوش گفتار جس کی چھیڑ خانی تاجور کو اچھی لگتی تھی اور جس کے بلند و بانگ قہقہوں پر وہ قربان جایا کرتی تھی۔

مراد نے کوئی ضد نہیں کی تھی۔ تاجور نے جیسے کہا تھا، اُس نے ویسے ہی کیا تھا۔ وہ ماہ نور کو لے کر لندن آ گیا تھا۔ ماہ نور بڑی خوشی اور ولولے کے ساتھ لندن آئی تھی۔ تاجور نے اس سے یہی کہا تھا کہ اکیلا رہ رہ کر ایسا ہو گیا ہے مراد، اب تم اور بچہ پاس رہو گے تو دیکھنا کیسے نثار ہوتا ہے وہ تم پر۔

تاجور غلط تھی اور ماہ نور بے وقوف۔ مراد کے پاس لندن میں رہ کر بھی ماہ نور اُس کا دل جیت پائی نہ اُس کی چپ توڑ پائی تھی، پر اُسے لگتا تھا وہ کالے پانی کی سزا کاٹنے وہاں اُس کے ساتھ آ گئی تھی، جہاں وہ سارا سارا دن دو کمروں کے اُس چھوٹے سے فلیٹ کی دیواروں کو دیکھتی رہتی تھی یا پھر کھڑکیوں سے باہر نظر آنے والے لوگ اور گاڑیاں جو اُسے چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اُس فلیٹ کے اندر اُس کی اور مراد کی خاموشی کو اگر کوئی توڑتا تھا تو وہ اُس کا بیٹا تھا، مگر اُس کا رونا دھونا، ہنسنا کھیلنا بھی کئی بار ماہ نور کو غصہ دلاتا۔ اُسے لگنے لگا تھا وہ وہاں پاگل ہو رہی تھی اور پاگل ہو جانے سے بچنے کے لیے اُس نے مراد سے واپس جانے کا اصرار کیا تھا جو مراد نے خاموشی سے پورا کر دیا تھا۔

ماہ نور ایک بار پھر امید سے تھی۔ جب وہ پانچ مہینے واپس گاؤں آ گئی تھی اور تاجور بہو اور پوتے کو واپس دیکھ کر جہاں نہال ہوئی تھی، وہاں وہ یہ جان کر پریشان بھی ہوئی تھی کہ وہ اب مراد کے پاس دوبارہ لندن نہیں جانا چاہتی تھی۔

''تیرا خیال نہیں رکھا اُس نے؟'' اُس نے پریشان ہو کر ماہ نور سے پوچھا تھا جس کے چہرے پر رونق تھی نہ آنکھوں میں چمک۔

''رکھتا تھا پھوپھو! جو چیز مانگتی تھی بغیر کہے لا کر دیتے تھے پیار کے سوا۔ بس اُن کے پاس میرے لیے پیار کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔'' ماہ نور غم زدہ تھی اور اُس نے اپنا غم اسی طرح تاجور کو سنایا تھا۔

''مرد ایسے ہی ہوتے ہیں، بیویوں سے کہاں پیار محبت کی باتیں کرتے ہیں؟ کہاں اُن کے قصیدے پڑھنے بیٹھتے ہیں۔ تو نے تو پریشان ہی کر دیا مجھے ماہ نور! میں بھی پتا نہیں کتنا ستایا ہے مراد نے۔''

تاجور نے ہنس کر ماہ نور کو بہلایا تھا جو چپ چاپ تاجور کو دیکھتی رہی، پھر جب وہ خاموش ہو کر اُس کا بیٹا گود میں لے کر اُس کے ساتھ کھیلنے لگی تو ماہ نور نے کہا۔

''پر مراد میرے لیے گونگا بنا ہے، اُس کے لیے تو نہیں۔''

Scanned with CamScanner

تاجور نے اُس کا چہرہ چونک کر دیکھا تھا۔ ماہ نور کی آنکھوں میں عجیب سی آگ تھی، آنسو نہیں تھے۔

"وہ نیند میں اُس کا نام لے لے کر باتیں کرتے ہیں اُس کی۔ اُس کے حسن کے قصیدے پڑھتے ہیں۔"

وہ اب وہ نظم سُنا رہی تھی تاجور کو جو اُس نے نیند میں مراد کو کئی بار پڑھتے سنی تھی۔ وہ اُس کے پہلو میں نیند کی وادیوں میں بھی موتیا کے ساتھ پھرتا اُسے پکارتا اور اُس کے حسن پر مٹنے کی باتیں کرتا اور ماہ نور بستر پر بیٹھی اُس کا چہرہ دیکھتی، اُس رقیب کے قصیدے سنتی جو اُن دونوں کے بیچ سے کبھی ہٹی ہی نہیں تھی۔

اُس کے نین غزالی دلبر
اُس کے گال گلابی

تاجور نے ساکت بیٹھے ماہ نور کی زبان سے داستانِ امیر حمزہ کی طرح داستانِ موتیا و مراد سنی تھی اور وہ بھی ماہ نور کے سامنے گونگی ہو گئی تھی۔ اُسے اب کیا تاویل اور توجیہہ دیتی، اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب تو دو سال گزرنے کو تھے۔ اب تو اُن دونوں کے درمیان کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔ اب تو وہ ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ دوسرا اُس کے گھر آنے والا تھا۔ اُس کے پاس بہت سارے "اب تو" تھے اور کوئی بھی مراد کے لیے رتی نہیں بنا تھا۔ اُس نے موتیا کو کھرچ کھرچ کر اُس کے دل سے اُتارا تھا۔ اُس کی کوئی پرچھائیں تک نہیں رہنے دی تھی پر مراد پر اس کا سایہ ہی کیسے ہو گیا تھا۔

"لوگ جادو ٹونے کر دیتے ہیں۔ بڑا کاری وار کرتے ہیں۔ تجھے یاد ہے نا آدم کی دفعہ تجھے خوشبو آیا کرتی تھی ہر طرف موتیا کی۔ اُن لوگوں نے ہی ٹونے کیے ہیں مراد پر۔ دل باندھ دیا ہے اُس کا۔"

تاجور نے لمبی چپ کے بعد وہی سب کچھ کہنا شروع کیا جو اُس کی سمجھ میں آیا تھا۔ پیار محبت کی طاقت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، جادو ٹونے کا اثر اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ اُس نے ماہ نور کے سامنے وہی راگ الاپا تھا جو اُس نے ہمیشہ سنا تھا۔

"پھوپھو اُس کا کوئی توڑ نہیں؟" ماہ نور نے عجیب بے بسی کے ساتھ اُس سے پوچھا تھا۔

تاجور کے پاس اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہر دُعا اُس نے کر چھوڑی تھی۔ ہر وظیفہ اُس نے آزمالیا تھا۔ پیر ابراہیم سے اُن کی ناراضی کے باوجود دعائیں کروائی تھیں، پر کوئی دُعا، کوئی جتن مراد کے دل کا بند تالا نہیں کھول پائے تھے اور اب ماہ نور اُس سے ایک بار پھر وہی سوال کر رہی تھی۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہوتا جائے گا۔ ابھی تو دو سال ہی گزرے ہیں نا۔ کتنے اور سال رہے گا یہ جادو؟ بھول جائے گا مراد موتیا کو! ہو جائے گی کاٹ...... تو نہ گھبرا ماہ نور۔ دیکھنا اس بار بھی بیٹا ہو گا اور جب دو بیٹوں کی ماں ہو جائے گی تُو تو مراد کو عزت دینی ہی پڑے گی تجھے۔"

تاجور کو جو تاویلیں، جو طفل تسلیاں آ رہی تھیں، وہ اُسے دے رہی تھی اور ماہ نور تھی کہ بہلنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

"عزت کا مسئلہ نہیں ہے پھوپھو...... عزت تو بہت کرتا ہے وہ، پر پیار نہیں کرتا...... خیال کرتا ہے، قدر نہیں کرتا...... سر پر بٹھاتا ہے، دل میں نہیں بٹھاتا۔" ماہ نور اب پہلی بار روئی تھی۔

"عزت کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے میرے اور مراد کے درمیان...... عزت ہی عزت رہ گئی ہے۔ پیار تو ہے ہی نہیں۔"

وہ روئے جا رہی تھی اور تاجور کو لگا تھا کسی نے رسّی سے اُس کے وجود کو لپیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اتنی ہی بے بس ہو گئی تھی ماہ نور کے آنسوؤں کے سامنے جو اُس کی بھتیجی تھی اور جس کے وجود سے اُس کے خاندان کی اگلی نسل چل رہی تھی۔

"بس تھوڑا صبر دھیئے! بس تھوڑا صبر...... وہ تیرا ہو گیا ہے، اُس کا دل بھی تیرا ہو جائے گا۔" تاجور نے اُسے اپنے ساتھ لپٹایا تھا اور تسلی دی تھی۔ اُس کا بیٹا ماں کو روتے دیکھ کر منہ بسورنے لگا تھا۔

"میں اُس سے بات کروں گی۔" تاجور نے اُسے ایک اور تسلی دی تھی، یہ جاننے کے باوجود کہ اُس کے پاس ایسے کوئی الفاظ نہیں تھے جو اُس کے بیٹے کا دل نرم کرتے۔

موتیا کو اُس نے بس مراد کی زندگی سے نکال دیا تھا، اُسے وہم ڈال کر۔ پر مراد کے دل سے اُس کا پیار نکالنے کے لیے اُس کے پاس کوئی حل، کوئی چلتر، کوئی جنتر منتر نہیں تھا۔ بس دعائیں اور وظیفے تھے اور تاجور کو پتا نہیں کیوں اب لگتا تھا جیسے اُس کی دعاؤں میں کچھ مسئلہ ہونے لگا تھا۔ نہ اُس کی دعاؤں سے مراد پگھلتا تھا، نہ پانی برستا تھا۔

وہ آج بھی کڑوا پانی پیتی تھی جو اُس کے علاوہ کسی کو کڑوا نہیں لگتا تھا۔ اُس کے گھر کے ایک کمرے سے آج بھی راتوں کو موتیا کی خوشبو پھوٹتی تھی اور اُس خوشبو کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں کر پائی تھی سوائے مراد کے کمرے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کے کیونکہ اُسے لگتا تھا وہاں جادو کیا گیا تھا، وہاں اثر تھا۔ پر وہ اثر اب اُن کی پوری زندگیوں پر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

چوہدری شجاع اب پہلے کی طرح اُس کی عزت نہیں کرتا تھا۔ اُس سے روکھا بولتا تھا۔ اُس کا باپ پیر ابراہیم اب اُس کے آنے پر چادر نہیں بچھاتا تھا، اُٹھ کر کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ اُن سے مختصر بات کرتا تھا۔ تاجور اب اپنے تکبر اور غرور سے باہر نکل کر کھڑی ہوتی تو اُسے یہ سب کچھ محسوس ہونا شروع ہو جاتا اور پھر وہ ایک بار پھر اپنی "میں" کی چادر اوڑھ لیتی، اور ایک بار پھر وہ بے حس ہو جاتی۔ وہ جیت تو گئی تھی نا موتیا سے...... بس اتنا کافی تھا اُس کے لیے۔ باقی سب کچھ وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ وہ ضمیر کے ہر چابک کی چوٹ کو ان ہی لفظوں سے سہلاتی۔

"مراد! تو ماہ نور سے پیار کیا کر۔" فون پر چند دن بعد بالآخر تاجور نے بیٹے سے وہ ذکر چھیڑ ہی دیا تھا جس کے لیے لفظ ڈھونڈتے اُسے کئی دن لگے تھے۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

مراد نے بنا رکے پوچھا تھا۔ تاجور کو سمجھ نہیں آئی وہ کیا جواب دے۔ موتیا کا ذکر کیے بغیر مراد کو پیار کیسے سمجھائے۔

"وہی پیار جو تو موتیا سے کرتا تھا۔" اُس نے بالآخر یہ بات کہنے کی ہمت کر لی۔

"اُس پیار کو تو اسی رات گاؤں کے قبرستان میں دفن کر آیا تھا، جس رات آپ نے مجھے کنویں پر بھیجا تھا موتیا کی بے وفائی کے ثبوت دیکھنے۔"

پتا نہیں اُس کے لہجے کی ٹھنڈک میں وہ کون سی آگ تھی جس نے تاجور کو جھلسایا تھا۔

"غلط کیا تھا کیا تجھے اُس رات وہاں بھیج کر؟" تاجور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہاں نہ بھیجتیں تو پیار پر سے میرا اعتبار نہ اُٹھتا۔ وہ میری زندگی کا پہلا پیار تھا۔ آپ نے اُسے ختم نہیں کیا، آپ نے اُسے ذبح کر کے مارا ہے۔ اب مجھے ماہ نور سے پیار کرنے کو نہ کہیں۔ یہ میں کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔"

مراد نے فون بند کر دیا تھا، پر تاجور بہت دیر فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی تھی۔ پھر اُس نے سوچا تھا وہ اس بار بڑا بھاری وظیفہ کرے گی مراد کے دل سے موتیا کو نکالنے اور بھلانے کے لیے۔ ایسا وظیفہ کہ مراد کو موتیا کے نام سے بھی نفرت ہو جاتی۔ تین مہینے ہر رات کی لمبی پڑھائی تھی، پر تاجور تیار تھی۔ اُس نے عبادت ہی کرنی تھی، اللہ کا نام ہی لینا تھا، نیکی ہی کرنی تھی۔ وظیفہ کامیاب ہو جاتا تو بھی ٹھیک تھے، نہ ہوتا تو بھی آرام تھا۔ مراد دور رہتا تب بھی اللہ تو پاس ہی رہتا۔ تاجور نے اللہ کو منانا اور راضی رکھنا مراد کو منانے سے بھی زیادہ آسان سمجھ لیا تھا۔

بے شک انسان اپنے گمانوں سے مارا جاتا ہے اور بدگمانیوں پر پچھتاتا ہے۔ بے شک انسان خسارے اور شر کا سودا بڑے ہی فخر سے کرتا ہے۔ بے شک غرور اللہ کی صفت ہے اور اُس کے علاوہ کسی کو نہیں جچتی۔

☆☆☆

گاؤں والوں نے اُس صبح گامو کو بڑی حیرانی سے دیکھا تھا جو کھیتوں کے بیچوں بیچ اپنے ایک چھوٹے سے کھیت میں لگی سبزیاں اُکھاڑ کر وہاں بھٹی بنا رہا تھا۔ وہ قطعہ اراضی چھوٹا تھا اور گاؤں والوں کی زمینوں کے بیچوں بیچ تھا۔ گامو اُس پر تھوڑی بہت سبزی لگا دیتا جو اُس کے گھر میں استعمال ہوتی، اور اب اُس چھوٹے سے کھیت کے بیچوں بیچ اُس بھٹی کی سمجھ کسی کو تب تک نہیں آئی تھی جب تک گامو نے بھٹی بنا کر اُس میں آگ جلا کر ایک کڑاہی میں ریت ڈال کر دانے بھوننا شروع نہیں کر دیے تھے۔ وہ کڑکتی دھوپ کے بیچوں بیچ اُس بھٹی پر دانے بھون رہا تھا، خریدار کا انتظار کیے بغیر۔

"گامو! کیا کر رہا ہے تو؟"

گاؤں کے لوگوں نے کچھ دیر تک آپس میں کھسر پھسر کی، پھر انہیں لگا کسی نہ کسی کو جا کر گامو کو سمجھانا چاہیے اور اب وہ اُسے سمجھانے آئے تھے۔

"دیکھ نہیں رہے، دانے بھون رہا ہوں!"

گامو نے اسی روکھے انداز میں بغیر اُن لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے کہا تھا۔

"ہاں۔ دیکھ رہے ہیں، پر کس کے لیے دانے بھون رہے ہو؟" اُس آدمی نے اس بار کچھ تشویش سے استفسار کیا، جو اُس سے بات کر رہا تھا۔

"کوئی نہ کوئی تو خریدے گا..... نہیں خریدا کسی نے تو پرندوں کو ڈال دوں گا۔" گامو اسی لاپروائی سے بولا تھا۔

"پر تُو تو پانی پلاتا تھا گامو..... تو پانی نہیں پلائے گا تو گاؤں والوں کی پیاس کون بجھائے گا؟"

اُس آدمی نے بڑی فکرمندی سے اُس سے کہا تھا۔ گامو جس درانتی سے ریت میں دانے بھون رہا تھا، وہ پھیرتے پھیرتے رُک گیا۔

"پانی کسی کو نہیں چاہیے..... سب کو دانے چاہیے..... گامو نے پیاس بجھا کر کیا پایا..... دیکھتا ہوں اب آگ لگا کر کیا ہوتا ہے۔" وہ اُسی انداز میں بولا تھا۔

"کھیتوں کے درمیان بھٹی لگا کر بیٹھا ہے..... تیری آگ کی کوئی ایک چنگاری اُڑ کر کسی کی تیار فصل پر گر گئی تو پورے گاؤں کے دانے جل کر راکھ ہو جائیں گے۔"

ایک دوسرے آدمی نے جیسے اُس کی بھٹی کی آگ کے ممکنہ خطرات سے اُسے آگاہ کیا۔

"گامو کی آگ نے کسی کو کیا جلانا ہے..... وہ تو خود راکھ بنا ہوا ہے۔"

گامو نے جواباً کہا تھا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کا کہا تھا۔ وہ لوگ ناخوش وہاں سے چلے گئے تھے لیکن وہ گامو کی شکایت چوہدری شجاع کے پاس لے گئے تھے۔ ہر ایک کو گامو سے ہمدردی تھی، مگر اُس ہمدردی میں وہ اپنے کھیتوں میں لگی فصل کو تباہ ہوتے دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

چوہدری شجاع حقہ پیتے ہوئے اُن کی بات سنتا رہا۔ جب گاؤں والوں نے اپنے سارے خدشات کا اظہار کر دیا تھا حقہ گڑگڑانا چھوڑ کر چوہدری شجاع نے کہا۔

"گامو کے کھیت کے ساتھ کس کے کھیت ہیں؟" دو آدمیوں نے ہاتھ اُٹھائے۔

"تم دونوں گامو کے کھیت کے ارد گرد ایک ایک پیالی خالی چھوڑ دو..... وہاں فصل نہیں لگے گی۔ گامو کی

بھٹی سے کوئی چنگاری اُڑی بھی تو بس اتنی دور ہی جائے گی۔"

چوہدری شجاع نے عجیب فیصلہ دیا تھا۔ گاؤں والے اُس کا منہ دیکھنے لگے تھے۔

"چوہدری صاحب آپ اُس کو بلا کر سمجھائیں۔"

"میں نہیں سمجھا سکتا..... نہ وہ میرے کہنے پر آئے گا نہ میں اُسے سمجھانے اُس کے سامنے جاؤں گا۔ بس اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ کبھی نہ کبھی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ غصہ میں ہے۔ لگانے اور بھڑکانے دو آگ..... کتنی بھڑکائے گا؟"

چوہدری شجاع نے جیسے فیصلہ دے دیا تھا۔

گاموسارا دن اُس بھٹی میں بیٹھ کر دانے بھونتا رہا۔ پہلے پہل گاؤں والوں نے اُس سے دانے نہیں لیے، پھر آہستہ آہستہ لوگ گزرتے ہوئے اُس سے دانے بھنوانے لگے۔ کبھی کوئی بھنے ہوئے دانے بھی لے لیتا۔ کبھی کوئی عورت آٹا لے کر روٹی لگوانے آجاتی۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ وہ چھوٹا سا کھلیان اب سبزی نہیں اُگاتا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے، چلنے پھرنے کی وجہ سے وہ بنجر ہو گیا تھا اور وہاں سے اُٹھتا دھواں گاؤں والوں کو ناخوش کرتا اور متفکر بھی، لیکن کوئی گامو کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

"دعا کر گاموا مینہ برسے..... ورنہ سوکھا پڑ جانا ہے۔" لوگوں نے اس سے کہنا شروع کر دیا۔

"کیا کرنا ہے پانی کا تم لوگوں نے..... دانے کماؤ..... دانے بیچو..... دانے کھاؤ۔" وہ جواباً ہنستا کہتا۔ لوگ اُس کے ہنسنے پر خفا ہوتے، وہ پاگل نہیں تھا پر غصہ دلانے والی باتیں کرتا تھا۔

"پانی نہیں ہوگا تو دانہ کہاں سے آئے گا گامو؟" کوئی نہ کوئی اس سے کہہ دیتا اور گامو ہنستا ہوا دانے بھونتے بھونتے اُنہیں جلا کر راکھ کر دیتا۔

چوہدری شجاع نے سوچا تھا، وہ بھٹی گامو کے غصے کی آگ کو بجھا دے گی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو جائے گا۔ پھر ماشکیوں والے کام پر چلا جائے گا۔ اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ گامو کی بھٹی سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں نے آسمان کے بادلوں کا پانی پینا شروع کر دیا تھا۔ جھوک جیون کے کھیت پانی سے بھری بدلیوں سے برسنے والی ایک ایک بوند کے لیے ترستے رہے۔ کھیتوں نے سوکھنا شروع کر دیا تھا اور گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ چوہدریوں کو بھی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ دعائیں، خیرات، صدقہ جو کر سکتے تھے انہوں نے کیا تھا بارش نہیں برسی تھی مگر اس سب ہی کے دوران چوہدریوں کے ہاں مراد کا دوسرا بیٹا آ گیا تھا۔

دھوم دھڑکا اب بھی پہلے ہی کی طرح ہوا تھا بارش ہوتی نہ ہوتی، فی الحال چوہدریوں کے بھڑولے اناج سے بھرے ہوئے تھے اور وہ پیسہ لٹا سکتے تھے، جتنا بھی لٹانا چاہتے۔ گامو اور اللہ وسائی کے دل پر ایک بار پھر چھریاں چلی تھیں، جب مٹھائی کے ٹوکرے پورے گاؤں کے ساتھ ساتھ اُن کی گلی میں بھی ڈھول باجے اور ہیجڑوں کے ناچ گانے کے ساتھ بانٹے گئے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا جب اُنہیں موتیا کی ذہنی کیفیت کے خراب ہونے پر اطمینان ہوا تھا۔ وہ ٹھیک ہوتی تو یہ سب کیسے سہتی؟ بولتی نہیں تھی پھر بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے تو تھی۔ نہ ہوتی تو وہ کدھر جاتے۔

☆☆☆

"تو آئے گا نہیں اپنے بیٹے کو دیکھنے؟" تاجور کو یقین نہیں آیا تھا جب اُس نے فون پر مراد سے یہ سنا تھا کہ وہ پاکستان نہیں آ سکتا۔

"امی پریکٹس شروع کی ہے میں نے..... میرے بہت سارے اہم کیسز کی سماعت ہے یکے بعد دیگرے ..... ممکن نہیں ہے میرے لیے چھٹی لے کر نکلنا۔" مراد نے وضاحت دی۔

"پہلے بیٹے کی دفعہ بھی تین مہینے کے بعد آیا تھا...... تو اب چھ مہینے بعد بھی نہیں آسکتا؟" تاجوراب ناراض ہونے لگی تھی۔

"نہیں آسکتا۔" مراد کا جواب دوٹوک تھا۔

"آپ ماہ نور کو بھیج دیں دو، تین مہینے بعد...... وہ کچھ دیر رہ کر چلی جائے۔" مراد نے جیسے حل پیش کیا۔

"لوگ کیا کہیں گے مراد؟ تجھے خوشی نہیں ہے اپنے دوسرے بیٹے کی؟ حویلی کے دو، دو وارث آگئے ہیں۔ اکلوتے وارث کا سلسلہ ٹوٹا ہے پہلی بار...... تیسری نسل میں دو وارث آگئے ہیں۔ کیسی قسمت والی بیوی ہے ماہ نور اور تو پھر بھی نہیں آسکتا۔" مراد کو تاجور کے کلمات نے جیسے بُری طرح سلگایا تھا۔

"لوگوں کی پروا کبھی آپ نے نہیں کی تو میں کیوں کروں؟ مجھے کون سا اُن لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔"

وہ پہلا جملہ تھا جس نے تاجور کو سانپ کی طرح ڈسا تھا۔ وہ کیوں کہہ رہا تھا کہ اُسے اُن لوگوں کے پاس آکر کبھی رہنا ہی نہیں تھا۔ وہ پڑھنے باہر گیا تھا۔ پڑھ کر پریکٹس کر رہا تھا اور پھر تاجور اور چوہدری شجاع نے ہمیشہ ہی یہ سوچا تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ پاس والے شہر میں اپنا لاء چیمبر بنائے گا اور ساتھ زمینیں سنبھالے گا۔ شہر اور گاؤں میں اب فاصلے کم ہونے لگے تھے۔ پکی سڑکیں بن رہی تھیں۔ تانگوں کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں اب گاڑی بھی آگئی تھی۔ گاؤں میں بجلی بھی آگئی تھی اور گیس آئندہ آنے والے چند سالوں میں آجاتی، پر وہ کہہ رہا تھا کہ اُسے واپس ہی نہیں آنا تھا۔

"اور جہاں تک بات ہے ماہ نور کی، تو میں مداری کا بندر نہیں ہوں کہ ہر وقت ناچ ناچ کر ثابت کروں کہ میں بہت خوش ہوں اور مجھے واقعی بیوی بچوں سے محبت ہے۔"

اُس نے بڑی تلخی سے بات جاری رکھی تھی اور تاجور اُس کی بات کاٹ نہیں سکی۔ وہ اب اُس سے دبتی تھی۔ سوچ سمجھ کر بات کرتی تھی۔ وہ جانتی نہیں کیوں پل بھر میں بھڑک اُٹھتا، پل بھر میں کڑوا ہو جاتا۔ وقت بھی گزر رہا تھا اور گزر گیا تھا۔ اگر کوئی زخم تھا تو بھر کیوں نہیں رہا تھا۔ اُس کا اگر کوئی نقصان ہوا تھا تو صبر کیوں نہیں آرہا تھا ابھی بھی اُسے۔

لوگ تو اتنے عرصے میں مرنے والوں کو بھی رو دھو کر بھول جاتے ہیں۔ تاجور سوچتی ہی گئی تھی اور اُسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ لوگ مرنے والوں کو بھولتے ہیں، پر موتیا ابھی زندہ تھی اور مراد ہر بار گاؤں آنے کا تصور کرکے ہل جاتا تھا۔ یہ جیسے اپنے آپ کو دودھاری تلوار پر چلانے جیسا تھا۔ یادوں کی بے رحم دودھاری تلوار جو باہر سے نہیں اُس کو اندر سے کاٹتی تھی۔ تہہ تیغ کردیتی تھی اور وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا مگر ماں چاہتی تھی۔ وہ نہ بچے وہ آتا رہے اور لہولہان ہوتا رہے۔

☆☆☆

"مراد کے ابا! آج مراد نے بڑی عجیب بات کی ہے مجھ سے۔" اُس رات تاجور نے چوہدری شجاع کے سونے سے پہلے اُس سے ذکر چھیڑا تھا، وہ اپنی پگ اُتار کر رکھ رہا تھا۔

"مجھ سے تو وہ ہمیشہ ہی عجیب باتیں کرتا ہے، تجھے عادت نہیں ہوئی ابھی تک؟"

چوہدری شجاع نے ہنس کر جیسے اُس کا مذاق اُڑایا تھا۔

"وہ کہتا ہے، اُس نے گاؤں میں نہیں رہنا۔" تاجور نے مزید تمہید باندھے بغیر کہا۔

"ہاں تو گاؤں میں کیوں رہے گا؟ شہر والی کوٹھی میں رہے، وہیں کرے اپنی وکالت...... آتا جاتا رہے گاؤں، پر یہاں بیٹھ کر کیا کرنا ہے اُس نے۔" چوہدری شجاع نے نیم دراز ہوتے ہوئے جیسے اُس کی بات پر غور کیے بغیر اُسے ہوا میں اُڑایا تھا۔

Scanned with CamScanner

"وہ کہتا ہے کہ اُس نے پاکستان میں ہی نہیں رہنا۔" تاجور نے جیسے اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے چوہدری شجاع کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہوا تھا۔

"یہ تجھے کب کہہ دیا اُس نے؟" وہ لیٹتے لیٹتے اضطرابی انداز میں اُٹھ کر بیٹھا تھا۔

"آج ہی کہا ہے۔"

"تو نے کوئی بحث کی ہوگی، کوئی جھگڑا کیا ہوگا...... اُس نے غصہ میں کہہ دیا ہوگا۔" چوہدری شجاع نے جیسے مراد کی بات کی کوئی تاویل، کوئی جواز ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔

"اُس سے بحث اور جھگڑے کرنا چھوڑ دیا ہے میں نے اب چوہدری صاحب۔ اتنا غصہ کبھی آپ نے پوری زندگی مجھ پر نہیں کیا، جتنا وہ کرتا ہے۔ پر میں بتا رہی ہوں آپ کو، اُس نے اب یہاں نہ رہنے کا دل بنا لیا ہے۔" تاجور نے جیسے اُسے خبردار کیا تھا۔

"میں خود بات کروں گا اُس سے...... تو خوامخواہ فکریں پال کر بیٹھ جاتی ہے...... اور ایسی باتیں فون پر نہیں ہوتیں...... آنے دے اُسے بیٹے کو دیکھنے، میں کروں گا بات۔"

"وہ نہیں آ رہا بیٹے کو دیکھنے، اُس نے کہہ دیا ہے مجھ سے کہ اُس کے پاس وقت نہیں ہے نہ اب نہ تین مہینے بعد، نہ چھ مہینے بعد۔" تاجور نے اُس کی بات کو من و عن چوہدری شجاع کے سامنے دہرا دیا تھا۔ وہ چپ کا چپ ہی ہو گیا۔

چوہدری مراد اکلوتا بیٹا تھا تو خاندان میں پہلی بار دوسرا وارث آیا تھا، اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ آئے گا ہی نہیں۔

"سو جا تاجور! اس وقت پریشان نہ کر مجھے...... صبح اُٹھ کر بات کرتے ہیں۔" اُس نے مزید بات کیے بغیر تاجور سے کہا تھا۔

تاجور نے بھی لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر اُس رات اُس نے چوہدری شجاع کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔ ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ سب کچھ فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔ ایک بار پھر اُسے گامو، اللہ وسائی اور موتیا کا خیال آیا تھا۔ وہ گاؤں کا چوہدری تھا، گاؤں میں کسی سے بھی بے خبر نہیں رہ سکتا تھا یا اور بات تھی کہ وہ کسی کے لیے کچھ کر پاتا یا نہ کر پاتا، چوہدری شجاع روز اپنے کھیتوں میں جاتے ہوئے گامو کی بھٹی سے اُٹھتا دھواں دیکھتا جو کھیتوں کے بیچوں بیچ سے یوں ہوا میں بلند ہو رہا ہوتا جیسے وہاں کسی کا دل تھا اور چوہدری شجاع آنکھیں پھیر لیتا۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وقت کبھی بھی اُلٹی چال نہیں چلتا اور چلتا بھی تو چوہدری شجاع تب بھی اُتنا ہی بے بس ہوتا۔

☆☆☆

"موتیا کیسی ہے اماں؟"

شکوراں نے حیران ہو کر بتول کی شکل دیکھی تھی۔ وہ کئی مہینوں کے بعد اُس کے پاس رہنے آئی تھی اور شکوراں کو اُس کا رنگ روپ پہلے جیسا نہیں لگا تھا۔ کریدنے پر بھی وہ کچھ نہیں بولی تھی اور اُس نے یک دم موتیا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔

"موتیا کیسے یاد آ گئی تجھے؟ تو تو بڑی دیر ہو گئی، کبھی اُس کا پوچھتی ہی نہیں۔ میں تو کئی دفعہ سوچتی ہوں کہ تو کیسی سہیلی ہے، تجھے کبھی اُس کا خیال ہی نہیں آیا۔" شکوراں بھی آج کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

"اماں! تجھے لگتا ہے مجھے اُس کا خیال نہیں آتا ہوگا؟ دن رات اُس کا خیال آتا ہے۔" وہ عجیب انداز میں بڑبڑانے لگی تھی۔

"ویسی ہی ہے موتیا...... نہ کچھ بولتی ہے، نہ کچھ کرتی ہے۔ بس بیٹھی رہتی ہے...... جھولی میں کچھ سکے لے

کر..... اُنہیں رگڑتی رہتی ہے زمین پر۔ اللہ وسائی زبردستی کھانا کھلادے تو کھالیتی ہے، ورنہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں۔ کوئی ڈاکٹر، حکیم، پیر نہیں چھوڑا اُن دونوں نے، جہاں لے لے کر نہیں پھرے۔ کہیں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں دل کو کیسا روگ لگا ہے کہ دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں نظر ہی لگ گئی ہے موتیا کو تو۔ ایسا روپ تو سات گاؤں میں کسی کا نہیں تھا۔ اس پورے علاقے میں پہلی لڑکی تھی جو ڈاکٹر بن رہی تھی۔ بس چوہدرائن نے بڑا ظلم کیا۔ اللہ وسائی تو منہ بھر بھر کر بددعا دیتی ہے اُسے، اُجڑنے اور برباد ہونے کی جس نے موتیا کے ساتھ یہ ظلم کیا۔"

شکوراں اپنی بیٹی کے تاثرات سے بے خبر اُسے موتیا کے بارے میں اطلاع دے رہی تھی اور بتول کا رنگ اُڑ رہا تھا۔

"اللہ وسائی تتلاتی ہے اور زبان کالی ہے اُس کی..... بڑے بوڑھے بڑا ڈرتے ہیں اِن لوگوں کی آہ لینے سے۔ وہ جب کہتی ہے نا کہ جو کچھ موتیا کے ساتھ ہوا، وہ اُس کے ساتھ بُرا کرنے والوں کی اولادوں کے ساتھ ہو، اُن کی بیٹیاں اُجڑیں، روئیں..... بیٹے مریں..... نسل ہی ختم ہو جائے......"

بتول کے کلیجے پر جیسے کسی نے ہاتھ ہی ڈال دیا تھا۔

"بس کر اماں! نہ سُنا مجھے یہ ساری باتیں۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور عجیب بے چینی کے عالم میں ادھر سے اُدھر پھرنے لگی تھی۔

"لے تجھے کیا ہوا بتول؟ تو کیوں پریشان ہو رہی ہے؟ یہ سب کچھ تو چوہدرائن اور اُس کے بیٹے کی اولادوں کے لیے کہہ رہی ہے وہ..... تجھے تھوڑی کچھ کہہ رہی ہے۔" شکوراں نے کچھ حیران ہو کر بیٹی کو دیکھا تھا جو اُسے ہی دیکھتی جا رہی تھی۔

اولاد اپنے بعض گناہ اللہ کو بتا سکتی ہے، ماں باپ کو نہیں بتا سکتی کیونکہ وہ یہ یقین ہی نہیں کر سکتے کہ اُس خود غرضی اور بے رحمی کے خالق وہ ہو سکتے ہیں۔

بتول کا دل چاہا تھا، وہ ماں کو اُس لمحے بتا دے کہ وہ ایک دوسرے انسان کے ساتھ کیا کر بیٹھی تھی، پر اُسے خوف تھا، اُس کی ماں اُسے جانور اور شیطان نہ سمجھ لے، پر ماں کی زبان سے اللہ وسائی کی دی گئی بددعا میں بتول کے رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔ شادی کو دو سال سے اوپر ہو گئے تھے اور وہ اب تک بچہ پیدا نہیں کر سکی تھی۔ ہر بار وہ چند ماہ بعد اُمید سے ہوتی اور بغیر کسی وجہ کے بچہ ضائع ہو جاتا۔ کوئی احتیاط، کوئی دُعا، کوئی تدبیر کام نہ آتی اور ہر بار جب وہ اِس کرب سے گزرتی تو اُسے موتیا یاد آتی۔ اُسے اللہ وسائی اور گامو کا وہ حال بھی یاد آتا جو وہ گاؤں والوں کے منہ سے کہیں نہ کہیں سنتی رہتی تھی۔

پورے گاؤں کو پتا تھا وہ موتیا کی بچپن کی سہیلی تھی، یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کہیں اللہ وسائی اور گامو کا ذکر ہوتا اور عورتوں کی نظریں بتول پر نہ اُٹھتیں۔ اُن کی زبانوں پر اُس کے لیے سوال نہ ہوتے اور وہ اُن نظروں، اُن سوالوں سے بدک بدک کر اُٹھتی تھی بھاگتی تھی۔ اس سوال کا وہ کسی کو کیا جواب دے سکتی تھی کہ موتیا اور چوہدری مراد کے درمیان کیا ہوا تھا۔ اُن کا پیار اور رشتہ ٹوٹ کیوں نہیں چڑھا۔

گاؤں کی عورتوں نے تاجور سے موتیا کے کردار کے بارے میں الزامات بھی سنے تھے۔ گاؤں کے مردوں نے چوہدری شجاع کے منہ سے یہ بھی سنا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ گامو کی بیٹی سے کرنے جا رہا تھا..... تو پھر کیا ہوا تھا؟ کون آیا تھا اُن کے بیچ......

چار دن گاؤں کے لوگ اندھے بہرے گونگے ہوئے تھے۔ زبانوں سے چٹخارے دار باتیں کی تھیں۔ چار دن کے بعد لوگوں کی عقلیں کام کرنے لگی تھیں۔ جانتے وہ اللہ وسائی اور گامو کو بھی تھے اور موتیا کو بھی۔ یہ دل

سے ماننے پر کوئی تیار نہیں ہو رہا تھا کہ موتیا آوارہ تھی۔ پورا گاؤں اللہ وسائی اور گاموں کی شرافت کے گن گا سکتا تھا۔ پورا گاؤں موتیا کی پارسائی کی قسم بھی اُٹھا سکتا تھا، پر اُن میں سے کسی نے وقت پڑنے پر نہ اس شرافت کی گواہی دی تھی نہ اُس پارسائی کی قسم اُٹھائی تھی۔

اور اب جب وقت گزر گیا تھا تو چٹخارے لینے والی زبانوں کا مسالہ ختم ہونے لگا تھا اور اب اُن پر گھڑے گھڑے سوال اور باتیں آنے لگی تھیں اور اُن گھڑے سوالوں اور باتوں کے سامنے بتول کا ضمیر ٹھہر نہیں پا رہا تھا۔ یا شاید ضمیر سے بڑھ کر وہ اذیت اور محرومی تھی جو اُسے بار بار کچوکے دیتے ہوئے یہ یاد دلاتی تھی کہ اُس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اُس کے "گناہ" کی "سزا" تھی اور وہ "سزا" دائمی بھی ہو سکتی تھی۔ سسرال والے اب اُسے طعنے دینے لگے تھے۔

چوہدری مراد کے دونوں بیٹوں کی مثالیں دی جاتیں جس کی شادی اُن کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی اور دو سالوں میں وہاں دو بیٹے آ گئے تھے اور اُن کے بیٹے کا گھر سونا تھا۔ اُس کا شوہر بھی ماں باپ کی باتیں سن سن کر اُس سے بے التفاتی برتنے لگا تھا۔ وہ دو دفعہ اُس کے پاس کویت سے ہو کر واپس آ گئی تھی۔ وہ عیش و آرام جس کے وہ خواب دیکھتے ہوئے شادی کر کے کویت گئی، بھسم ہو گئے تھے۔ وہ پیار محبت شادی کے شروع کے چند ہفتوں میں ہی اُڑ گیا تھا۔

دور ہونے کے باوجود سسرال والوں کو سعید اور اُس کی آمدنی پر مکمل قابو تھا اور بتول ایک روپیہ بھی اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ جو خوف ہر وقت اُس کے گرد منڈلاتا رہتا تھا وہ یہی تھا کہ ماں باپ کے مجبور کرنے پر سعید کہیں ایک اور شادی نہ کر لے اور اُسے پتا ہی نہ چلے...... تو وہ ہول جاتی اور بولائی ہوئی کویت اور اپنے گاؤں کے چکر کاٹتی رہتی۔ وہ سارے للّے تللّے جو اُسے چوہدر ائن کے دیے ہوئے پیسوں سے کرنے تھے وہ ہوا بن کر اُڑ گئے تھے۔ اُس کا وہ پورا جہیز اُس کے سسرال والوں نے اپنی بیٹیوں میں بانٹ دیا تھا کیونکہ وہ کویت چلی گئی تھی اور بھابھی کی ہر چیز ضائع ہو رہی تھی، اس لیے بہتر تھا کہ وہ بیٹیوں کو اُن کے سسرال میں بھیج دی جاتی۔

بتول پہلی بار کویت سے واپس آ کر اپنے پر ایک خالی کمرے میں ماں کی چارپائی پر سوئی تھی کیونکہ کمرے کے پردے اور فرنیچر تک اُس کی نندوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور اُس کے جھگڑنے پر سعید نے اس سے کہا تھا کہ اُسے چیزوں کی اتنی پروا ہے تو وہ چوہدریوں کے گھر سے اور لے آئے۔ آخر اُس کی ماں اب بھی تو وہاں ہی کام کرتی تھی اور بتول حویلی جانے کا سوچنے سے بھی ڈرتی تھی اور خود تاجور نے بھی شکوراں سے کہا ہوا تھا کہ بتول اب حویلی نہ آئے۔

تاجور کو یہ خدشہ تھا کہ بتول کی زبان سے اگر کچھ نکل گیا تو وہ ماہ نور اور اُس کے بیٹے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ اُس نے جو سازش کی تھی، اُسے اُس پر شرم نہیں تھی، مگر اُس سازش کے کھل جانے کا خوف ضرور تھا۔ انسان اللہ کے سامنے گناہ کرنے سے نہیں ڈرتا، لیکن بندوں کے سامنے اُن گناہوں کے آ جانے سے ضرور ڈرتا ہے۔

"تو مجھے یہ بتا بتول کوئی خوش خبری ہے؟"

شکوراں کو اُس کی کیفیت سے یکدم جیسے اُس کے حاملہ ہونے کا خیال آیا۔ اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ماں سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے، میری نسل نے آگے نہیں بڑھنا اماں...... میرے گھر نہیں ہونا بچہ!"

شکوراں نے جیسے ہول کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہے تو بتول؟ کیوں اس وقت برے الفاظ زبان پر لا رہی ہے...... رب سوہنے کے گھر دیر ہے، اندھیر نہیں۔"

بتول نے ماں کی تسلیوں کو سنتے ہوئے اُس کا چہرہ دیکھا۔

"اماں! مجھے لگتا ہے توبہ کیے بغیر کچھ نہیں ہونا...... کسی سے معافی لیے بغیر کچھ نہیں ہونا۔"

وہ عجیب سے انداز میں بڑبڑائی تھی۔

"کس سے معافی لینی ہے تو نے؟ کیا کیا ہے تو نے؟"

شکوراں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بتول انگلیاں چٹخاتے ہوئے اُسی طرح پھرتی رہی۔ اُس نے ماں کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور شکوراں بغور اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی، یوں جیسے اس جگسا پزل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

بتول اگلے کئی دن موتیا کے گھر جانے کے لیے اُس کی گلی میں جاتی رہی اور اُس کے گھر کے سامنے سے ہو کر واپس آجاتی۔ گاموکے گھر کا دروازہ اب ٹوٹا ہوا تھا اور اُس کی لکڑیوں میں جگہ جگہ خلا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب کوئی اُسے دیکھنے والا ہی نہیں رہا۔ موتیا کے ساتھ گزرا ہوا اچھا وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے گزرتا رہا اور اُس کا پچھتاوا جیسے بڑھتا ہی چلا گیا۔

"اے میرے مالک! جتنا بوجھ میرے سینے پر ڈال دیا ہے، اُتنا چوہدرائن پر بھی تو ڈال...... جتنی سزا مجھے میرے گناہ کی دے رہا ہے، اُن کو بھی تو دے۔ میں اولاد کے لیے ترس رہی ہوں اور چوہدرائن کے گھر بیٹے پر بیٹے آرہے ہیں۔ کیا ساری سزائیں غریبوں کے مقدر میں ہی لکھی ہیں؟ امیروں کے گناہ اور خطا نا قابلِ سزا۔"

بتول اپنے آپ سے خود جنگ لڑنے میں مصروف تھی، اگر اُس کے ساتھ سب کچھ ہونے کی وجہ اُس کا گناہ تھا تو اُس گناہ کو کروانے والی کے گھر پر کوئی آفت کیوں نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ وہ عجیب کشمکش کا شکار تھی۔

"موتیا سے بات کرنے کی ہمت نہیں تو کیا میں سب کچھ چوہدری مراد کو بتا دوں؟"

اُس نے واپسی کے راستے میں سوچا تھا۔ پر وہ کیا کرے گا۔ اب تک تو وہ بھول چکا ہوگا موتیا کو۔ اب تو پلوں کے نیچے بہت سا پانی بہہ گیا تھا۔ اب کچھ بھی کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ چوہدری مراد اُسے بھول گئے ہوں تب بھی تاجور اُسے جان سے مار دے گی۔ نہ بھولے ہوں تو خود چوہدری مراد کے ہاتھوں اُس کی جان جاتی۔ آگے کنواں اور پیچھے کھائی میں بتول کو وہیں کھڑے رہنے میں عافیت نظر آئی تھی جہاں وہ کھڑی تھی۔ اُس کو ابھی زندہ رہ کر سزا کاٹنی تھی۔

☆☆☆

وہ گاؤں کے مولوی صاحب تھے جو صبح کنویں کے برابر اپنے کھیتوں میں چرنے والی اپنی بکریوں کے لیے پانی نکالنے آئے تھے۔ کنویں میں گرائے جانے والا ڈول کسی چیز سے ٹکرایا تھا اور مولوی صاحب حیران ہوئے تھے۔ منہ اندھیرے اُنہیں یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ کنویں میں وہ کیا چیز تھی جس سے پانی بھرنے کے لیے پھینکا جانے والا ڈول بار بار ٹکرا رہا تھا۔ ایک عجیب وہم اُنہیں آیا تھا اور اُس وہم کی تصدیق یا تردید کے لیے وہ سورج نکلنے تک کنویں پر بیٹھے رہے اور سورج نکلتے ہی انہوں نے جھانک کر کنویں میں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ گہرے کنویں کی تہہ میں نظر آنے والے پانی پر اوندھے منہ کسی کا وجود پانی کے ہلکوروں کے ساتھ ہل رہا تھا۔ مولوی صاحب غش کھاتے کھاتے بچے تھے۔ اُس گاؤں کی تاریخ میں اُس کنویں سے ملنے والی وہ پہلی لاش تھی اور وہ لاش گاموکی تھی۔

وہ کب وہاں کودا تھا..... گرا تھا یا گرایا گیا تھا یہ کسی کو پتا نہیں تھا اور یہ سب جانتے تھے۔ گامو کی لاش نے گاؤں والوں کو چُپ لگادی تھی اور ایسی ہی چپ چوہدری شجاع کو بھی وہاں آکر لگی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اللہ وسائی کو کیسے اطلاع دیتے۔ اُن سب کو لگتا تھا کہ اُسے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا، پر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ کنویں پر آئی تھی اور گامو کی لاش کے سرہانے چُپ چاپ بیٹھ گئی تھی۔

گاؤں والوں کو یقین تھا، وہ صدمے میں تھی۔ وہ اُنہیں کیا بتاتی کہ گامو کی موت کا صدمہ وہ اُس دن اُٹھا چکی تھی جب اُس کی بیٹی کی بارات نہیں آئی تھی۔ وہ سارے بین جو اُس نے آج کرنے تھے، اسی دن کر لیے تھے۔ یہ گامو تو بس ایک چلتی پھرتی لاش تھی۔ وہ ہنستا گاتا گامو تھوڑی تھا۔ اُس کا سر گود میں رکھے وہ اُس کے گیلے بال یوں سمیٹتی رہی جیسے وہ سویا ہوا تھا۔ پھر گاؤں والوں نے اللہ وسائی کو حق باہو کا کلام پڑھتے سُنا تھا۔ اپنی توتلی آواز میں۔ وہی کلام جو گامو پڑھتا تھا۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی من مرشد وچ لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا تے جاں پھلاں تے آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو، جیں اے بوٹی لائی ہو

چوہدری شجاع اُس توتلی آواز کی بازگشت میں وہاں سے واپس حویلی گیا تھا۔ اللہ وسائی نے اُس کی کوئی بھی مدد لینے سے انکار کردیا تھا۔ اُسے گامو کو چوہدریوں کے پیسوں کا کفن نہیں پہنانا تھا۔

گامو گاؤں کا پہلا ''کمی'' تھا جس نے موت کے بعد بھی چوہدریوں کی امداد ٹھکرائی تھی۔

''کنویں میں گر کیسے گیا؟''

...

تاجور نے خبر ملنے پر اتنے عام سے لہجے میں یہ سوال پوچھا تھا کہ چوہدری شجاع نے کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا۔ وہ بس غم زدہ اپنا حقہ گڑگڑا تا رہا تھا۔ تاجور اُس کی شکل دیکھتی رہی، پھر کوئی جواب نہ ملنے پر اُس نے کہا۔

''اچھا۔ میں ملازموں کو کہتی ہوں، کھانے کا انتظام کردیں اُس کے گھر تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے۔''

''مت بھیجنا کچھ بھی اُس کے یہاں...... اللہ وسائی کچھ نہیں لے گی۔'' چوہدری شجاع نے عجیب سے لہجے میں اُس سے کہا تھا۔

''نہیں تو نہ سہی...... خیرات، زکوۃ کے لیے گاؤں میں کمی بہتیرے۔'' تاجور نخوت سے کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

گامو کا جنازہ اُس گاؤں کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ یوں لگتا تھا۔ چرند پرند بھی اُس کے جنازے میں شرکت کے لیے آگئے تھے۔ وہاں کسی کو یہ ماننے میں تامل نہیں تھا کہ وہ نیک تھا۔ اور اللہ وسائی کو یقین تھا۔ وہ رب کے پاس گیا تھا سوتیا کے لیے۔

☆☆☆

''پترا تو نے ماں باپ سے ملنے نہیں آنا؟ بیٹے کو دیکھنے نہیں آنا؟'' یہ چوہدری شجاع تھا جس نے چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی مراد کے نہ آنے پر اس سے فون پر پوچھا تھا۔

''ابا جی چھٹی نہیں ملتی۔'' مراد نے جواباً اُسے کہا تھا۔

''تو چوہدریوں کا پتر ہے...... انگریزوں کا نوکر تھوڑی ہے کہ چھٹی نہیں ملتی۔ چھوڑ دے ایسی نوکری جس میں تجھے ماں باپ سے ملنے اور اولاد کو دیکھنے کے لیے بھی چھٹی نہ ملے۔''

Scanned with CamScanner

چوہدری شجاع کو غصہ آگیا تھا۔
"ایسا نہیں ہوتا یہاں پر ابا جی...... یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر تاؤ کھا کر نوکریاں نہیں چھوڑ سکتے۔"
مراد نے ٹھنڈے لہجے میں باپ سے کہا تھا۔
"پھر بھی میں آؤں گا، چکر لگاؤں گا...... نہ آسکا تو پھر آپ لوگوں کو بلالوں گا۔" مراد نے ساتھ باپ کو تسلی بھی دی تھی۔
"ہم نے کیا کرنا ہے وہاں آ کے پتر؟ تیرا یہاں آنا ضروری ہے...... تجھے گاؤں یاد نہیں آتا؟"
مراد کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ گاؤں کی یاد کو دفن کر کے ہی تو وہ زندہ تھا ورنہ اُس کا پورا وجود پھوڑا بن گیا تھا اُن یادوں کے درمیان۔
"ابا جی! گاؤں کی بات نہ کریں۔ اپنی بات کریں۔ آپ ٹھیک ہیں؟"
مراد نے بات بدلی تھی۔
"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں...... وہ گامو مر گیا۔"
پتا نہیں خیالوں کی وہ کون سی رو تھی جس میں بہہ کے چوہدری شجاع نے اُسے یہ خبر دی تھی اور اُسے یہ خبر دے کر جیسے وہ پچھتایا تھا۔
دوسری طرف فون پر مراد کے سانس کی آواز بھی نہیں تھی۔ چوہدری شجاع کو لگا فون بند ہو گیا تھا۔
"ہیلو پتر...... تو سن رہا ہے نا؟"
"ہاں۔" دوسری طرف سے مراد نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔
"کیسے؟"
اُس کی آواز میں ایک عجیب سی اُداسی تھی۔ اُس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کون گامو۔ گامو کو سارا گاؤں پہچانتا تھا اور مراد تو گامو کو زندگی کے آخری لمحے تک نہیں بھلا سکتا تھا۔
"کنویں سے لاش ملی ہے۔"
چوہدری شجاع نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ مراد ایک بار پھر گونگا ہو گیا تھا، ایک بار پھر اُس کے پاس سارے سوال ختم ہو گئے تھے۔ کنویں سے لاش کیسے مل سکتی تھی۔ اُس میٹھے پانی میں گامو کے لیے موت کیسے ہو سکتی تھی جو اُس کے ہاتھ سے پورے گاؤں کی پیاس بجھاتا تھا۔ مراد وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا جو سچ تھا، اور ہو چکا تھا اور جو سچ تھا وہ اُس وقت اُس کے ہوش اُڑا رہا تھا۔ اُس نے فون بند کر دیا تھا۔ ایک لفظ بھی اور کہے بغیر۔ یادوں کے جھکڑ چلنے لگے تھے اور ان جھکڑوں میں مشک اُٹھائے گامو کے ساتھ ساتھ موتیا کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔
"لوگ کہتے ہیں، حادثہ ہے شاید پانی نکالتے ہوئے......"
چوہدری شجاع نے آخری جملہ کہتے کہتے ادھورا چھوڑ دیا تھا اور وہ جملہ اب اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ وہ اپنے باپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس کے گھر میں کیا اب موتیا تھی؟ اور وہ وہاں نہیں تھی تو کہاں تھی؟ موتیا کی خوشبو اُس کے اردگرد چاروں طرف پھیلنے لگی تھی یوں جیسے وہ کسی دُھند اور کہر میں گھر گیا تھا۔

☆☆☆

موتیا ہوش و حواس میں نہیں تھی، مگر وہ پھر بھی اس گھر میں ان دو لوگوں کے وجود سے باخبر تھی۔ ایک اللہ وسائی جو دن رات سائے کی طرح اُس کے آس پاس گھومتی رہتی، اُسے کھانا کھلاتی، نہلاتی دھلاتی، اُس کے بال بناتی۔ اُسے بچپن کی طرح ایک بار پھر سے لوریاں گا گا کر سناتی اور دوسرا گامو جسے کئی بار رات کو آنکھ کھلنے پر وہ اپنے سرہانے بیٹھا دیکھتی۔ وہ ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہا ہوتا یا اُس کے ماتھے کو سہلا رہا ہوتا۔ موتیا کو اُس گھر میں

گاموکے وجود کا احساس اور پہچان تھی، بس یہ احساس نہیں تھا کہ وہ اُس کا کون تھا اور اب جب وہ نہیں تھا تو وہ
اُسے غیر محسوس طور پر ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اُس نے گامو کا آخری دیدار کیا تھا پر وہ اُس وقت وہاں لوگوں کا ہجوم
دیکھ کر اُن سے خوف زدہ ہوگئی تھی اور اللہ وسائی شوہر کی آخری رسومات چھوڑ کر اُس کو لیے اندر کمرے میں آکر
بیٹھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی گامو زندہ ہوتا یا اب بھی بول سکتا تو اُسے یہی کرنے کو کہتا۔

وہ گھر جو گامو، موتیا اور اللہ وسائی کا کہلاتا تھا اب صرف اللہ وسائی اور موتیا کا رہ گیا تھا۔ پہلے بھی سنسان اور
ویران لگتا تھا، اب اور بھی سنسان اور ویران ہوگیا تھا۔

☆☆☆

جھوک جیون نے جیسا سوکھا اُس سال دیکھا تھا، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بارش وہاں پہلے دو تین سالوں
سے نہیں ہو رہی تھی مگر اس سال گرمی اتنی بڑھی تھی کہ اُس نے جیسے زمین کا پانی بھی چوسنا شروع کر دیا تھا۔ نہر سے
آبپاشی کے لیے آنے والا پانی کھیتوں اور کھلیانوں کو سیراب کرنے کے لیے پہنچتے پہنچتے کھلوں میں ہی اُڑ جاتا۔
جھوک جیون کی زمین یک دم ہی بنجر ہونے لگی تھی۔ کھلوں سے آنے والا پانی پی کر بھی اُس کی پیاس نہیں مٹتی تھی۔
سرسبز کھیت آہستہ آہستہ سمٹنے اور سوکھنے لگے تھے اور گاؤں والوں میں ساتھ ہی سراسیمگی اور پریشانی بھی
بڑھنے لگی تھی۔ اس گاؤں میں ایسا سوکھا ایک بار تب پڑا تھا جب تاجور ابھی بیاہ کر نہیں آئی تھی اور جب اللہ وسائی
کی گود ابھی ہری نہیں ہوئی تھی اور اب ڈھائی دہائیوں بعد وہ سوکھا اور خشک سالی ایسے لوٹی تھی جیسے سیلاب کا پانی۔
لوگوں کے جانوروں میں بیماری پھیلنے لگی تھی اور وہ مرنے لگے تھے۔ گاؤں کے کنویں کا پانی آہستہ آہستہ نیچے
جا رہا تھا اور اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا اور جب چوہدری شجاع ہر جگہ سے بارش کے لیے دعائیں کروا کروا
کر تھک گیا تھا تو وہ پیر ابراہیم کے پاس بھی گیا تھا، جنہوں نے ہمیشہ کی طرح چوہدری شجاع اور تاجور کے کہنے پر
ہاتھ اُٹھا کر دعا کی تھی اور دعا کرتے کرتے انہوں نے چوہدری شجاع سے پوچھا تھا۔

"گاؤں میں آخری مرنے والا کون تھا؟"

اُن کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو دعا والے انداز میں کیے ہوئے اُن سے چہرہ ڈھانپے
ہوئے پوچھ رہے تھے۔ چوہدری شجاع نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"گامو!"

پیر ابراہیم نے اپنے چہرے کے سامنے سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اُن کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر چوہدری
شجاع کا چہرہ دیکھتے رہے جو انہیں گامو کی موت کی تفصیل بتا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو پیر ابراہیم نے کہا۔

"استغفار کرو تم بھی، تاجور بھی...... گاؤں والے بھی...... ابھی بہت ساری بلائیں اور آفتیں آئیں گی تم
لوگوں کی بستی پر۔ توبہ، استغفار کرو...... تمہاری بستی سے جو نیک آدمی گیا ہے، وہ ناراض ہو کر گیا ہے۔ اُس کی
بیوی اور بیٹی کے دروازے پر جاؤ، اُن سے معافی مانگو۔ اُن کا خیال رکھو، ورنہ بستی اُجڑ جائے گی۔"

وہ عجیب سے انداز میں کہہ رہے تھے اور اُن کا جسم لرز رہا تھا۔ چوہدری شجاع کے رونگٹے کھڑے ہونے
لگے۔

"آپ دعا کریں نا، اسی لیے آیا ہوں آپ کے پاس۔"

"دعا کی نہیں توبہ کی ضرورت ہے تم لوگوں کو...... صدقہ، خیرات جو کرسکتے ہو کرو...... جو اناج رکھا ہے،
بانٹ دو غریبوں میں۔ شاید کوئی عمل روک لے آنے والی تباہی کو۔"

پیر ابراہیم کے اب آنسو گرنے لگے تھے اور چوہدری شجاع کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

تاجور سے چوہدری شجاع نے سب کچھ اسی طرح دہرایا تھا جس طرح پیر ابراہیم نے بتایا تھا۔ وہ نہ لرزی تھی

، نہ کانپی تھی نہ اُس پر کوئی دہشت سوار ہوئی تھی۔

"بابا جان کو ساری عمر کمی کمین ہی نیک لگتے رہے، اُن کے لیے وہ اپنی اولادوں سے بھی بڑھ کر محترم ہو جاتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں کچھ نہیں ہوگا۔ گامو کوئی فرشتہ نہیں تھا، نہ ولی۔ نہ کوئی پیر۔ سوکھا پہلے بھی پڑتا رہا ہے اس گاؤں میں...... اس دفعہ پھر پڑ گیا تو کیا ہوا؟ ان شاء اللہ تعالیٰ ہو جائے گی بارش۔ میری ماں سیدانی تھیں اور جہاں سیدوں کی بیٹیاں آباد ہوں، وہاں دانہ پانی ختم نہیں ہوتا۔ دیکھ لینا کچھ نہیں ہوگا۔"

تاجور نے پیر ابراہیم کی اُن باتوں اور ہدایات کے جواب میں شوہر سے بڑی نخوت اور لاپروائی سے یہ سب کچھ کہا تھا۔ اُسے لگا باپ ایک بار پھر خوامخواہ میں ہی انہیں موتیا کے حوالے سے شرمسار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چوہدری شجاع اُس کی باتوں پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اُس کا دل ابھی بھی خوف زدہ تھا، پر تاجور کی دلیری نے جیسے اسے بھی کچھ ہمت دے دی تھی۔

"ہاں ٹھیک تو کہتی ہے۔ سوکھا پہلے بھی پڑ چکا ہے یہاں اور پھر ختم بھی ہو گیا تھا تو پھر اس بار کون سی انہونی ہو جائے گی۔"

چوہدری شجاع نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"سب کچھ غریبوں میں بانٹ دیا اور سوکھا لمبا کھنچ گیا تو پھر ہم کیا کریں گے؟"

چوہدری شجاع نے سوچا تھا اور پھر پیر ابراہیم کی باتوں کو نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"ہاں توبہ ضرور کر لیتا ہوں...... تسبیح کر لیا کروں گا۔ مولوی صاحب سے بھی کہہ دوں گا کہ گاؤں والوں سے استغفار کروائیں اور جمعے کے خطبے میں بھی توبہ پر بات کریں۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

وہ جیسے خود ہی مطمئن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جھوک جیون میں پڑتے ہوئے سوکھے کے درمیان بتول کی گود ایک بار پھر ہری ہوئی تھی۔ وہ سعید کے ساتھ گاؤں میں دو مہینے کے لیے رہنے آئی تھی اور اس بار اس خوش خبری کے ملتے ہی اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش سے پہلے موتیا کے پاس جا کر اُس سے معافی مانگے گی۔ سعید اُسے گاؤں میں ہی چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا اور بتول دن گن گن کر گزارنے لگی تھی۔ وہ چوتھا مہینہ تھا جب اُس نے بالآخر موتیا کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب تک اُس کو ٹھہرنے والے سارے حمل پہلے تین مہینوں میں ہی ضائع ہو جاتے تھے۔ یہ پہلا حمل تھا جو چوتھے مہینے تک پہنچا تھا اور بتول نے جیسے گھڑی کی سوئیوں کو گن گن کر یہ وقت گزارا تھا۔

"نہ بتول! اس حالت میں مت جا تو موتیا کو دیکھنے...... تو پریشان ہو جائے گی۔ اللہ نہ کرے تیری حالت بگڑ گئی تو؟"

شکوراں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں اماں! مجھے جانا ہے۔ میں آج تک اُس سے چاچا کا افسوس بھی نہیں کر سکی اور اب نہیں جاؤں گی تو پھر آگے جا کر نہیں جا سکوں گی۔"

اُس نے ماں کو تاویل دی تھی۔

"پر بتول! اب جانا کیوں ضروری ہو گیا ہے؟ تو اتنے ہفتوں سے یہاں ہے، افسوس کرنا ہی تھا تو پہلے کر لیتی۔"

شکوراں اب بھی سمجھ نہیں رہی تھی۔

"بس اماں! مجھے نہ روک، مجھے جانے دے۔" وہ جھنجلا گئی تھی۔

"چل پھر میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں اماں میں اکیلے ہی ملنا چاہتی ہوں اُس سے۔"

بتول نے ضد کی تھی اور شکوراں کے بغیر ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

اللہ وسائی کے گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ کواڑوں کے ساتھ بس لٹکا ہوا تھا۔ شاید اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ ہاتھوں میں ہی آجاتا۔ شکوراں نے ایک گہری سانس لے کر جیسے اپنے حواس اور اعصاب پر قابو پایا تھا اور پھر وہ اندر گئی تھی۔

صحن کے بیچوں بیچ ایک چارپائی پر موتیا بیٹھی تھی۔ بتول کے قدموں کی آہٹ پر اُس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور بتول ہل کر رہ گئی تھی۔ ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ اُس حسن پری کا تو نہیں ہو سکتا تھا جسے سات گاؤں موتیا کے نام سے جانتے تھے۔

یہ صرف بتول نہیں تھی جو اُسے دیکھ رہی تھی، موتیا بھی اُسے اسی کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اُس کی مٹھی میں پکڑے سکے اب اُس کی مٹھی سے گر رہے تھے۔ بتول آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اُس کے پاس گئی اور پھر اُس کے مقابل چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"تو نے مجھے پہچانا موتیا؟"

بتول نے مدھم آواز میں موتیا سے پوچھا تھا اور وہ اسی طرح بغیر کسی تاثر کے اُسے دیکھتی رہی۔ بتول کا دل یکدم بھر آیا تھا۔ وہ اپنے گناہ کا نتیجہ دیکھ رہی تھی، اور اس کا دل زار زار رونے کو چاہ رہا تھا۔ اُس نے موتیا کے لیے یہ بھی کہاں چاہا تھا نہ سوچا تھا۔ اُس کو لگتا تھا، چوہدری مراد سے شادی نہ بھی ہوئی تو بھی موتیا کو کوئی نہ کوئی ویسا ہی مل جائے گا۔ وہ ڈاکٹر بن رہی تھی اور حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔ اُس نے کبھی موتیا کو اس حالت میں پہنچا دینے کا نہیں سوچا تھا۔

"مجھے معاف کر دے موتیا! میں تیرے پیر پکڑ کر تجھ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔" بتول اب اُس کے پیر پکڑے ہوئے رو رہی تھی۔

"میں نے ظلم کیا تجھ پر نہ میں لالچی ہوتی، نہ چوہدرائن کے کہنے پر تجھے پھنسواتی۔ تیرے سامنے سب کچھ کہنے آئی ہوں، بتانے آئی ہوں تجھے کہ وہ میں تھی جس نے تجھے اور تیرے پیار کو اُس رات ڈسا تھا۔ میں سعید کو پانے کے لیے لالچ میں آ گئی تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں نے چوہدری مراد کو تیرا نہیں ہونے دیا۔ پر اب تو مجھے معاف کر دے۔ تیری آہ میری اولاد کو پیدا ہونے سے پہلے ہی کھا رہی ہے موتیا! مجھے معاف کر دے..... اس بار پھر پیٹ سے ہوں میں۔ اس بار دعا کر دے میرے لیے کہ میرے بچے کو کچھ نہ ہو۔"

بتول نے روتے ہوئے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر رکھا تھا۔ موتیا کچھ دیر اپنا ہاتھ اُس کے پیٹ پر رکھے رہی پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی، چارپائی پر پڑے سکوں میں سے ایک سکہ اٹھا کر اُس نے بتول کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی ہتھیلی کے بیچوں بیچ رکھ دیا تھا، پھر اُس نے اُس کی مٹھی بند کر دی تھی۔

"تو نے اس سازش کے لیے مجھے معاف کر دیا نا موتیا؟ تو نے کر دیا نا معاف مجھے؟" بتول نے بے قراری سے اُس سے پوچھا تھا، اور موتیا اسی مسکراہٹ کے ساتھ چپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔

بتول کو اپنے عقب میں دروازے پر کوئی آہٹ سنائی دی تھی۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔ دروازے کے بیچوں بیچ ایک بت کھڑا تھا، اور وہ بت چوہدری مراد کا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

حمیرا شفیع

ٹی وی لاؤنج کی دیوار سے لگا کلاک صبح کے پونے نو بجا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے اسکول، کالج اور دفتر جانے والے سدھارے تھے اور ان کو رخصت کرنے کے بعد تھکی ہاری سی رانیہ کاؤچ پر نیم دراز چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھی۔

سامنے بیڈ روم کے ادھ کھلے دروازے سے جانے والوں کا پیچھے چھوڑا ہوا پھیلاوا صاف نظر آ رہا تھا۔

کہیں پر آڑی ترچھی شرٹ پڑی تھی اور کہیں پر بنیان اور پتلون۔ گیلا تولیہ گول مول سا ہوا بیڈ کی پائنتی پر پڑا تھا۔ الماری کی کھلی درازوں سے جرابیں اور رومال جھانک رہے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیوم، ہینڈ لوشن اور ہیئر اسپرے وغیرہ کی شیشیاں لڑھکی ہوئی تھیں۔ فرش پر بوٹ پالش کی ڈبیا اوندھی گری تھی۔ استعمال کے بعد ڈھکن تک بند کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی۔

سوائے اتوار کے ہر صبح بیڈ روم کا کم و بیش یہی منظر ہوا کرتا تھا۔ وہ علی الصبح اٹھ کر ان کو بھیجنے کی تیاریوں میں جت جاتی تھی۔ ایک ایک کو گرما گرم ناشتہ اور مطلوبہ اشیاء فراہم کرتے کرتے نڈھال ہو جاتی تھی اور اس میں اتنی توانائی ہی نہیں بچتی تھی کہ جانے والوں کے فوراً بعد سب کچھ سمیٹ سکے۔ ان ہی کا بچا کھچا ناشتہ کرنے اور کچھ دیر ستانے کے بعد وہ بکھیڑے سمیٹتی تھی۔ اتنے میں صفائی والی آ جاتی تھی۔ اس کے بھی عجیب نخرے تھے۔ ایک بیڈ شیٹ تک جھاڑ کر بچھانا ناگوار گزرتی تھی۔ صاف کہہ دیتی۔

"باجی! برا نہ ماننا۔ میں صرف جھاڑو پھیر کر پوچا لگاؤں گی میرے آنے سے پہلے سب کچھ سمیٹ کر رکھا کرو۔ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا۔ میں نے دوسرے گھروں میں بھی جانا ہوتا ہے۔"

اس لیے آج بھی اس نے تھوڑی دیر کمر سیدھی کی۔ بکھری چیزوں کو ٹھکانے لگا رہی تھی کہ بیل بجی۔ گیٹ کھولا تو سامنے کام والی کی بچیاں کھڑی تھیں۔

"باجی! اماں نے بھیجا ہے۔ آپ کو بتانے آئے ہیں کہ آج ہم کام پر نہیں آئیں گے۔"

"ہیں وہ کیوں کل بھی تم لوگ آدھا کام چھوڑ کر چلے گئے تھے۔" اس کا موڈ ایکدم خراب ہوا۔

"وہ باجی! ہمارے بھائی کے سالے کی شادی ہو رہی ہے۔ کل ہم نے مہندی پر جانا تھا۔ آج بارات ہے۔"

"ہاں تو کل ولیمے پر جانا ہوگا۔ پھر نہیں آؤ گے تم لوگ؟" وہ جل کر بولی۔

"ہاں باجی! شاید پرسوں بھی نہ آئیں۔ ولیمہ گاؤں میں ہے۔"

وہ تو مزے سے کہہ کر چلی بنیں مگر وہ اپنی جگہ پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب کسی کام والی کے خلاف عدالت میں مقدمہ تو درج کروایا نہیں جا سکتا۔

☆☆☆

رانیہ کا شمار بھی خواتین کی اس قسم میں ہوتا تھا جو "ماسیوں" کے ہاتھوں ستائی ہوئی ہیں۔ کئی ایک بدل کر بھی دیکھی تھیں۔ مگر سب ہی کی کم و بیش ایک سی عادتیں تھیں سب ہی چھٹیاں بہت کرتی تھیں۔ سب ہی کو تنخواہ ایڈوانس چاہیے ہوتی تھی۔ سب ہی کو چیزیں مانگنے کی لت تھی۔

ایک دفعہ اس کی دوست اس کے لیے تین رنگوں کا خوب صورت دوپٹہ تحفتاً لے کر آئی جو گوٹا کناری سے مزین تھا۔ کام والی کی نظر پڑ گئی تو اگلے ہی دن

اپنا بانڈ کی ابٹن پر پہننے کے لیے مانگ لیا۔

''میں نے تو خود ابھی ایک بار بھی نہیں اوڑھا تمہیں کیسے دے دوں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ پھر کیا تھا ساری کالونی میں مشہور ہوگیا کہ نیلے گیٹ والی باجی بڑی کنجوس اور کم ظرف دلی ہے۔

خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اس کی بڑی لڑکی دھڑلے سے ان کا نیٹ شیئر کرتی تھی۔ شاید بچوں سے پاس ورڈ پوچھ لیا تھا۔ ایک باجی نے اسے اپنا پرانا موبائل عنایت کر رکھا تھا۔ اس نے ٹوکا تو اس کی ماں نے ہی بہت برا جانا۔

''کیا ہے..... باجی! بچی ذرا سا اپنا دل ہی تو بہلا رہی تھی۔''

''تمہیں پتا ہے کہ وہ کتنی واہیات فلم دیکھ رہی تھی۔ میں تو اپنے بچوں کو بھی زیادہ نیٹ استعمال کرنے سے روکتی ہوں۔'' اس نے نرمی سے سمجھایا مگر اگلے ہی دن ان کا جواب آ گیا۔

''ہم ایسے گھر میں کام نہیں کر سکتے جہاں اتنی روک ٹوک ہوتی ہو۔''

اب یہ جونئی کام والیاں رکھی تھیں، وہ تو تقریبات میں ہی جانے کی بے حد شوقین تھیں۔ ویسے ہر وقت مہنگائی اور دگرگوں معاشی حالت کے رونے روتی رہتی تھیں مگر مجال ہے جو کسی دور پرے کے عزیز رشتہ دار کی بھی منگنی شادی وغیرہ مس ہو جائے۔ ایک دن جب انہوں نے مہینے میں تیسری بار کسی شادی پر جانے کی چھٹی مانگی تو اس نے غصے میں آ کر ہمیشہ کے لیے ان کی چھٹی کرا دی۔

''جہاں میں اور ہزاروں کام کرتی ہوں وہاں ایک صفائی بھی سہی۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ اگلے دن وہ کمر کس کر میدان میں اتر گئی۔ مگر فقط جھاڑو پھیرتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ٹخنوں کے جوڑوں نے خوب دہائیاں دیں۔ پوچے کا مرحلہ مزید دشوار ثابت ہوا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنا محال تھا۔ خیر جیسے تیسے وائپر کے ساتھ پوچے باندھ کر پھیر لیا۔ چند روز یہی روٹین رہی۔ مگر اس کی نفاست پسند طبیعت کو صفائی میں کچھ کمی محسوس

ہوتی تھی۔ شاید کھڑے ہو کر پوچا پھیرنے سے فرش مکمل طور پر صاف نہیں ہوتا تھا۔ پھر ایک دن کچن میں رکھی چوکی پر نظر پڑی تو اچانک خیال آیا کہ اگر اس کو ڈنڈا لگوا لیے جائیں تو بیٹھ کر پوچا پھیرنے میں آسانی ہوگی۔ پھر خود ہی اس نے اپنے آپ کو اس اچھوتے آئیڈیا پر شاباش دی۔ آخر ایف۔ ایس۔ سی میں پڑھی ہوئی انجینئرنگ کام آ ہی گئی۔ ابا مرحوم ٹھیک ہی کہا کرتے تھے کہ اگر لڑکیاں نوکری نہ بھی کریں تو یہ پڑھائیاں لکھائی روز مرہ کے کاموں میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس نے ورکشاپ بھیج کر چوکی کو ڈنڈا فٹ کروا لیے۔ اب وہ آسانی سے گھوم گھام کر پوچا بھی پھیرنے لگی ہفتے دس دن کی پریکٹس سے جسم اس مشقت کا عادی ہو گیا۔ تھکن تو پھر بھی بہت ہو جاتی تھی مگر وہ خوش تھی کہ اب وہ کسی کام والی کی محتاج نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

گھر کا بیرونی گیٹ اور سیڑھیاں بہت گندی ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کسی کام والی نے انھیں ڈھنگ سے صاف بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی چادر اچھی طرح سے کسی اور پائپ لگا کر گیٹ اور سیڑھیوں کو خوب دھویا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا چھوٹا گڈو بھاگتا ہوا آیا۔

"مما! کیا ہم بہت غریب ہو گئے ہیں۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"خدانخواستہ نہیں تو، تم سے کس نے کہا......؟"

"مما! وہ سامنے والوں کا بوبی کہہ رہا تھا کہ تمہاری امی اب خود صفائی کرتی ہیں۔ انہوں نے کام والی کو ہٹا دیا ہے کیونکہ شاید پیسے نہیں ہیں۔"

"ادھر آؤ بیٹا!" اس نے پیار سے بچے کا بازو تھام کر قریب کیا۔

"کل میں نے آپ کو اسلامیات کے سبق "محنت کی عظمت" میں کیا پڑھایا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا ثواب کا کام ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو اپنے گھر کے تمام کام خود کرتے تھے۔ اچھے بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

بچے کو تو اس نے مطمئن کر کے بھیج دیا مگر ایک دن جب وہ گیراج کی صفائی کر رہی تھی تو اچانک بڑی بھابھی صاحبہ تشریف لے آئیں۔

اپنے بیٹے کے لیے "لڑکی تلاش مہم" میں معروف تھیں۔ اس لیے کافی دن بعد چکر لگایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

"ارے رانی..... یہ کیا..... تم خود.....!"

"جی بھابھی! اب میں اپنے گھر کی صفائی خود کرتی ہوں۔" اس نے فخریہ بتایا مگر وہ خوش ہونے کے بجائے تشویش سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر جب تک بیٹھیں سخت بے چین رہیں، کرید کرید کر عجیب سے سوالات پوچھتی رہیں۔ جاتے وقت پیار سے اسے گلے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"دیکھو رانی! یہ ٹھیک ہے کہ اماں ابا گزر چکے ہیں مگر اللہ سلامت رکھے تمہارے بھائیوں کو۔ ان کے دم سے تمہارا میکہ قائم ہے۔ اگر خرچے پانی کا کوئی مسئلہ ہے تو فی الحال یہ رکھو بعد میں، میں اور....." پرس سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"ہائے نہیں بھابھی....." وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"میں اپنی خوشی سے یہ سب کرتی ہوں۔ کام والیوں کی بلیک میلنگ سے تنگ آ چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کوئی مالی مسئلہ نہیں۔" مگر ان کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی وضاحت سے ذرا بھی مطمئن نہیں ہوئی ہیں۔

☆☆☆

بھابھی جان کیا ہو کر گئیں۔ سارے خاندان میں بریکنگ نیوز وائرل ہو گئی کہ رانیہ بے چاری کے پاس تو کوئی کام والی نہیں ہے خود کرتی ہے۔

پھر کیا تھا۔ جٹھانی، دیورانی، بڑی نند، چھوٹی نند، منجھلی بھاوج سبھی نے فون پر کام والی نہ ہونے کی وجہ سے پہلے تو اظہار تعزیت کیا پھر دبی دبی زبان میں میاں کی آمدنی کے بارے میں تسلی چاہی۔

چھوٹی بہن نے تو حد کر دی۔ صبح سویرے اپنی

Scanned with CamScanner

کام والی کے ہمراہ آب دیدہ سی چلی آئی۔ بہت شرمسار تھی کہ دیور کی شادی میں مصروف ہونے کی وجہ سے بہن کی خبر گیری نہ کر سکی۔ بے چاری کتنی مصیبت میں ہے۔ بامشکل اسے سمجھا بجھا کر رخصت کیا کہ اسے فی الحال کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے۔

☆☆☆

وہ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب میاں معمول سے کچھ پہلے چلے آئے چہرہ غبارے کی مانند پھولا ہوا تھا اور تاثرات ہرگز بھی اچھے معلوم نہیں ہو رہے تھے۔

"تم نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے......؟" میں اس کے سر پر آ کر دھاڑے۔

"گھر کی صفائی خود کر کے کیا جتانا چاہ رہی ہو......؟ آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو......؟ میری عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی ہے تم نے......"

"ہیں...... میرے صفائی خود کرنے سے آپ کی عزت میں کیسے کمی واقع ہو گئی۔" اسے بھی شدید غصہ آ گیا۔

"آج بھائی جان میرے دفتر آئے تھے......"

"کیا انہوں نے آپ سے کچھ کہا......؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مجھ سے تو وہ ملے بھی نہیں۔ دراصل چند ماہ پہلے دفتر میں کچھ خواتین ٹائپسٹ اور سیکریٹری وغیرہ کا اضافہ ہوا تھا۔ اب دفتروں میں اس طرح کی باتیں تو چلتی رہتی ہیں۔ میرے کولیگز سے ہی سن گن لینے آئے تھے کہ کہیں میں ان میں سے کسی کے چکر میں آ کر گھر میں تمہیں رقم فراہم نہیں کر رہا جو تم خود صفائیاں کرتی پھر رہی ہو۔"

"ہائے میرے اللہ......" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "ذرا سی بات کے کیا کیا افسانے بن گئے۔

قسم سے احمر! میں نے تو کسی سے کوئی شکایت نہیں کی۔ میں تو اپنی خوشی سے......"

"دوپہر میں بھابھی جان کا فون بھی آیا تھا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"باتوں باتوں میں سنا رہی تھیں کہ مجھ سے کم رینک کے میرے کولیگز کے ہاں تو دو دو تین ماسیاں کام کرتی ہیں۔ جبکہ میری بیوی خود ماسی بنی پھر رہی ہے۔"

"نہیں احمر! میں تو اپنی خوشی سے......"

"ارے بھاڑ میں گئی تمہاری خوشی۔" وہ گرجے۔

"دو ڈھائی ہزار کی بچت کے پیچھے اتنی بے عزتی نہیں کروا سکتا میں۔ خبردار! کل ہی ہنگامی طور پر نئی کام والی کھڑی کرو۔" پھر تن فن کرتے کچن سے نکل گئے۔ اور وہ صدماتی کیفیت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

وہ تو اپنی طرف سے حوصلہ افزائی اور ستائش چاہ رہی تھی مگر اس کے برعکس اسے طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ ان کا وسیع و عریض گھر تھا۔ اس کی امی اور بڑی بہنیں صفائی خود کرتی تھیں اور پڑوس سے آئے گئے سے محنت اور سلیقہ شعاری کی داد پاتی تھیں۔ مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ یعنی پہلے جن کاموں پر فخر کیا جاتا تھا اب وہ شرمندگی اور ندامت کا باعث سمجھے جاتے تھے۔

وقت کے ساتھ جہاں اور بہت کچھ بدلا تھا وہاں معاشرے میں اچھائی اور برائی کے معیار بھی بدل گئے تھے۔ یعنی کہ آج کل کام والیاں رکھنا بھی اسٹیٹس سمبل بن گیا۔ جو نوکر رکھتا ہے اس کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوتا ہے جو افورڈ نہ کر سکے یا اپنی مرضی سے نہ رکھنا چاہے اس کی ذات کو ہلکا لیا جاتا ہے۔

اس نے دل برداشتہ ہو کر شیلف پر دھرا موبائل اٹھایا کہ بہن کو کام والی کا کہہ دے پھر خیال آیا کہ اس نے تو خود سے عہد کیا تھا وہ کبھی ہار نہیں مانے گی تو اب اتنی جلدی ہمت کیوں ہار رہی تھی۔ چند لمحے وہ سوچ میں ڈوبی رہی پھر ایک فیصلے پر پہنچی۔ باقیوں کی تو اسے رتی بھر بھی پروا نہیں تھی جہاں تک میاں کا تعلق تھا تو انہیں سمجھانا کون سا مشکل تھا۔ محبت کے دو بولوں سے پگھل جائیں گے۔ اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ سبزی کاٹنی شروع کر دی۔

☆☆

رشیدہ فرح بخاری

"اماں اس گھر میں میرا مقام ایک ملازمہ سے بھی کم ہے۔ لوگ تو ملازمہ سے بھی رک کر حال پوچھ لیتے ہیں...... مگر اس گھر میں مجھے کوئی یہ رتبہ دینے کو بھی تیار نہیں......" زہی آپا نے بہتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اماں! اس گھر کے لوگ میرے وجود کو نظر انداز کرتے رہے، میں برداشت کرتی رہی مگر مجھ سے اپنی تذلیل برداشت نہیں ہوتی۔" دکھ قطرہ قطرہ آنکھوں کے ذریعے بہہ رہا تھا مگر دل کا غبار چھٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔

نہ میرے بچے! دل چھوٹا نہ کر، دیکھ اس طرح رو کر کچھ حاصل نہیں، زہی میرے بچے! وہی تیرا گھر ہے، وہی تیرا ٹھکانا ہے۔ ارے سسرال میں اپنی جگہ بنانے کے لیے عورتوں کو اپنی جان مارنا پڑتی ہے۔ سالوں لگ جاتے ہیں، تو ابھی سے گھبرا گئی میری بچی!" اماں نے آپا کو سینے سے لگاتے ہوئے دل گرفتی سے کہا۔ ان کی نظریں زہی آپا کے چہرے سے ہٹ ہی نہ رہی تھیں اور میں......

میری بے قرار نگاہیں بار بار آپا کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں اور پھر میں "چونک" گئی۔

"آپا! ظہیر بھائی نے آپ پر ہاتھ اٹھایا ہے؟"

میرے سوال پر اماں نے بھی چونک کر آپا کے سفید گال کی سمت دردیدہ نگاہوں سے دیکھا جبکہ آپا کر رونے میں شدت آ چکی تھی۔

اماں نے مجھے ڈپٹ کر وہاں سے اٹھا دیا کہ جا کر آپا کے لیے چائے بنا کر لاؤں۔

☆☆☆

زہی آپا کوئی کم ہمت، بے صبری اور ناشکری تو نہیں تھیں کہ اس طرح اپنے سسرال سے لڑ جھگڑ کر واپس آ جاتیں اور تو اور اس پورے عرصے میں انہوں نے اپنے سسرال والوں کے بارے میں بھی برائی کا ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

ظہیر بھائی کے تو وہ ایسے گن گاتی تھیں کہ میں حیران ہو کر سنجیدہ سے ظہیر بھائی کو دیکھتی۔ وہ واقعی میں اتنے میٹھے ہیں کہاں ان کا ذکر کرتے ہوئے آپا کے لہجے میں اتنی مٹھاس آ جاتی ہے۔ لیکن آپا جس طرح آج پھٹ پڑیں، اس سے تو ظاہر تھا کہ وہ اپنے سسرال میں پہلے دن سے ہی آزمائشوں میں ڈال دی گئی تھیں۔

میں آسمان پر نظریں جمائے مسلسل آپا کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

ان کا مرجھایا چہرہ اور میلا سا ہوا حلیہ مجھ سے نہیں دیکھا جا رہا تھا تو اماں کے دل کا کیا حال ہوگا۔

اور بچے......؟ وہ بھی گھر میں کتنا پریشان ہوں گے، آپا کے بغیر، شانی اور حرا کے چہرے ذہن میں آتے ہی میں مضطرب سی ہو گئی...... اور وہیں تخت پر لیٹ کر میں نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

زہی آپا بچپن سے ہی اماں ابا کی لاڈلی اولاد تھیں۔ شادی کے پہلے پانچ سال، تک بے اولادی اور اس کے بعد پہلوٹی کے بیٹے کی وفات کے بعد

جب گلابی سی پری اماں کی گود میں آئی تو انہیں لگا، دنیا کی ہر نعمت ان کے قدموں میں ڈھیر کردی گئی ہو۔ پھر پورے پانچ سال بعد میں اس دنیا میں آئی۔

میری آمد نے بھی آپا کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ وہ اماں، ابا کی آنکھوں کا تارا تھیں تو میری جان سے پیاری آپا تھیں۔

زیبی آپا، اماں کی بے انتہا فرماں بردار اور سلیقہ مند بیٹی تھیں۔ جب زیبی آپا میٹرک میں تھیں تو ابا کی اچانک وفات ہوئی، گھر کی مالی حیثیت کو اچھا خاصا نقصان پہنچا اور گھر کے حالات تنگ ہو گئے۔ تب آپا نے میٹرک کے بعد، آگے تعلیم جاری رکھنے کے ارادے کو ترک کیا اور گھر داری میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

پورے گھر میں عجیب سی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ اماں نم آنکھوں کے ساتھ زیبی آپا کو تک رہی تھیں اور زیبی آپا اپنا دکھ بھول کر اماں کی دل جوئی کرتے

ہوئے اپنے جذباتی پن کو کوستیں کہ آکر اماں کو بتانے کی کیا تک تھی؟ کیا تھا جو وہ اپنے راز کو راز رہنے دیتیں اور اپنی خوش حال زندگی کا بھرم رکھ لیتیں جو اتنے چند سالوں سے وہ محض اماں کے سکون کی خاطر رکھ رہی تھیں..... مگر ظہیر نے جب مہمانوں کے سامنے ان پر ہاتھ اٹھایا۔ ان کی ذات کے پرخچے اڑا دیے ان سے برداشت نہیں ہوسکا۔

آخر ظہیر کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ اتنی تذلیل کرتے؟ اور بس یہ ہی کچھ ان سے برداشت نہیں ہوسکا اور وہ اماں کی طرف آگئیں۔ ظہیر نے بچے اپنے پاس رکھ کر انہیں ان کی سرکشی کی سزا دی اور کہا اگر بچے واپس چاہئیں اور گھر واپس آنا ہے تو پہلے اماں اور مجھ سے معافی مانگے۔

☆☆☆

آج دوسرا ہفتہ تھا زہی آپا کو یہاں آئے۔

صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھی آپا نجانے کیا سوچے جارہی تھیں۔ میں افسردہ سی بیٹھی آپا کو دیکھتے ہوئے ماضی کا قصہ سوچنے لگی جب آپا پانچویں جماعت میں تھیں تو ان کی کسی معمولی سی غلطی پر استانی نے ان کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا آپا کے چہرے بالکل اسی طرح تین غیر واضح انگلیوں کے نشان دیکھ کر اماں نے آپا کو سینے سے لگایا اور اسکول جاکر شکایت کی۔ پھر آپا کو تنگ حالات کے باوجود ایک نسبتاً مہنگے اور اچھے اسکول میں داخل کروایا جہاں بچوں کو مارا نہیں جاتا تھا۔ اس واقعے کو سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کیا اماں اب آپا کو واپس بھیج دیں گی؟"

"وہ ان کی سسرال جاکر ان کو کھری کھری سنا سکتی ہیں؟" ہرگز نہیں!

کیا وہ ان کو سسرال بدر سکتی ہیں؟ یقیناً نہیں ان کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے..... وہ ان کے بغیر کیسے رہ سکتی ہیں۔ اف یہ بیٹیوں کی مائیں بھی کتنی مجبور ہوتی ہیں نا..... میں نے آہ بھری۔

☆☆☆

میں کالج سے گھر آئی تو گھر میں غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اتنے دنوں سے گھر پہ چھایا ہوا جمود آج ہوا لگ رہا تھا۔ کچن سے اشتہا انگیز، کھانوں کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ اور سامنے تخت پر آپا نئے جوڑے میں ملبوس، آنکھوں میں کاجل سجائے، ہاتھوں میں چوڑیاں، پہننے میں مصروف تھیں جبکہ اماں یقیناً کچن میں مصروف تھیں۔

"آپا خیریت ہے.....؟ کوئی آرہا ہے کیا.....؟" میں نے ستائشی نظروں سے آپا کو دیکھا وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

میں نے فوراً ماشاءاللہ کہا۔

"ہاں! ظہیر آرہے ہیں مجھے لینے کے لیے۔"

آپا نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

جانے ان کی مسکراہٹ میں ایسا کیا تھا کہ آپا کا سارا روپ، پھیکا پھیکا سا لگنے لگا اور میں حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگی.....

"آپ واپس جارہی ہیں....."

"ہاں.....!" آپا نے مختصرا جواب دیا۔

"کیوں آپا.....؟" میری آواز میں بے قراری تھی۔

"وہی گھر ہے وہ میرا!....."

"یہ گھر بھی آپ کا ہے....."

میں نے زور دے کر کہا۔

"نہیں یہ تمہارا گھر ہے منی!"

آپا نے میرے سر پر چپت مارتے ہوئے مذاق کیا اور مسکراتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ میں اماں کے پاس آگئی۔ کچن میں وہ پکانے میں مصروف تھیں اس شخص کے لیے جو ان کی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کررہا تھا۔ مگر وہ شخص اماں کا "داماد" کہلوایا جاتا تھا لہٰذا یہ اہتمام کرنا ضروری تھا۔

"اماں! زہی آپا واپس جارہی ہیں؟"

"ہاں ظہیر آرہا ہے اسے لینے کے لیے۔"

اماں نے مصروف لہجے میں کہا.....

"اماں! آپ آپا کو واپس نہ بھیجیں....." میرا لہجہ بے قرار تھا۔

"دماغ درست ہے تمہارا! اس کے بچے ہیں وہ کیسے رہے گی، ان کے بغیر اور ظہیر خود آرہا ہے اسے لینے کے لیے۔"

اماں نے "بظاہر" مطمئن لہجے میں کہا اور پھر سے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

"اماں! آپا کے ساتھ اس گھر میں اچھا سلوک نہیں ہوتا۔"

میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

اماں خاموشی کے ساتھ کام میں مصروف رہیں۔ میں نے زور دے کہا۔

"ظہیر بھائی تو ان پر ہاتھ تک اٹھاتے ہیں۔"

اماں نے ہاتھ روک کر لمحہ بھر کو مجھے دیکھا۔

"غصے میں کہاں پتا چلتا ہے انسان کو، اٹھ گیا ہوگا ہاتھ ظہیر کا......" میں نے ازحد حیران ہو کر اماں کی طرف دیکھا۔

"لیکن اماں! یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ بیوی پر اس طرح ہاتھ اٹھایا جائے اور اسے ذلیل کیا جائے۔"

اب کے اماں نے میری طرف خفگی سے دیکھا۔

"جاؤ یہاں سے! میرا دماغ خراب مت کرو...... اب ماں کو سکھاؤ گی کہ اسے کیا فیصلے کرنے چاہئیں۔"

"میری مدد نہیں کر سکتیں۔ تو جاؤ یہاں سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں!" اماں نے سختی سے کہا۔

میں پیر پٹختی زینی آپا کے پاس آ گئی۔

"آپا! آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔"

"کس بارے میں؟" آپا کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"واپس اپنے سسرال جانے کے بارے میں......" میں نے رکھائی سے کہا۔

آپا مسکرا دیں...... پھر وہی مسکراہٹ...... کھلتے چہرے کو مرجھا دینے والی مسکراہٹ، اس سے تو اچھا ہے آپا نہ ہی مسکرائیں میں نے جل کر سوچا۔

"مانو! تم نہیں سمجھو گی! لڑکی کا اصل گھر پیا کا گھر ہوتا ہے۔ جہاں وہ بیاہ کر جاتی ہے، اگر میں ہمیشہ کے لیے یہاں بیٹھ جاؤں تو اماں پر کیا بیتے گی؟ میرے بچوں کا کیا مستقبل ہوگا؟ کیا میں ان کے بغیر رہ لوں گی......

"زندگی ایسے نہیں گزرتی میری جان! دونوں میں سے کسی ایک کو تو جھکنا پڑے گا، سو میں جھک گئی کیونکہ مجھے معلوم ہے گھر بچانے کے لیے قربانی عورت کے حصے میں ہی آتی ہے۔"

آپا نے میرا ہاتھ تھام کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"یعنی آپ اپنا گھر بچانے کے لیے ظہیر بھائی کے آگے سر جھکا دیں گی؟"

"نہیں پگلی!"

"سر میں نے ظہیر کے آگے نہیں بلکہ اپنے اللہ کے آگے جھکایا ہے۔ اس سے بہتر میرے لیے کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اور پتا ہے مانو! انسانوں کے سامنے سر جھکانے میں سوائے ذلت کے کچھ نہیں اگر ہم دو قدم چل کر اللہ کے آگے سر جھکا دیں تو وہ دس قدم آگے بڑھ کر ہمارا جھکا ہوا سر دنیا کے سامنے اٹھا دیتا ہے۔" آپا کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

"یہ ہی سوچ کر، میں نے واپس جانے کا ارادہ کیا اور ظہیر کو کال کر کے، اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اپنے بچوں کی خاطر اور اماں کے سکون کی خاطر اس فیصلے پر سر جھکا دیا۔"

میں گم صم بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اچھا چلو! بہت باتیں ہو گئیں۔ اٹھو جاؤ اماں کا ہاتھ بٹاؤ — میں ذرا کال کر کے پوچھوں کہاں پہنچے ہیں ظہیر۔" آپا نے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں اطلاعی گھنٹی بجی، اماں کچن سے نکل کر، گیٹ کی طرف لپکیں اور ان کے پیچھے آپا بھی ظہیر صاحب کا پرجوش استقبال کرنے کے لیے ان کے ساتھ چلی گئیں۔

☆☆

Scanned with CamScanner

نازیہ رزاق

پلوڈب پچھم

ناولٹ

بے جی...... بے جی چھٹی مرگئی۔" صغریٰ نے گرتے پڑتے یہ خبر سنا کے ہر ایک کو منجمد کردیا۔

"ہیں ییں یں کون مرگئی؟" بے جی نے دوپٹہ کان کے پیچھے اڑستے خود کو چوبند کیا۔ گھنے پیپل تلے بیٹھی خواتین نے ہڑ بونگ میں ہر شے سمیٹی۔

"بے جی! آپ کی دشمن نمبر اول و آخر مرگئی ہے۔ کلثوم ولایت چشتہ...... رام پور کے مسلوں میں سے مزید ایک کم ہوگیا۔"

یہ جنت ناظمہ چوہدری تھی۔ پیپل سے جھولتے جھولے کو ایڑھ دے کے مزید بلند کرلی۔ بے حس سا تبصرہ کرتی، ہر کوئی آگے پیچھے ہوگیا مگر بے جی اور وہ

......

بے جی ہوا سے اڑتے اس کے بال دیکھتی رہیں۔ وہ ہل نہ سکیں۔

"تو کیا وہ مر بھی سکتی ہے؟ رام پور کی ہیر شیرنی عورت کالوں خاندان کے لیے ہیبت اور عزیمت عورت تب ہی بڑھکیں مارتے گھر کے مرد اندر داخل ہوئے۔"

"بے جی...... اہاں، او چاچی مرگئی ہے او جادو گرنی مک گئے (ختم ہوگئے) چٹے، مک گئے ویر (دشمنی) مک گئے لاشے۔" بڑے تایا کالڑ کا اونچا اونچا بولتا آیا سب خواتین واپس اکٹھی ہوگئیں۔

"واسطہ (باسط) وے او کہویں مرگئی؟ کل تک تو بھلی چنگی تھی آموں کے باغ میں مرغابیوں کا شکار کررہی تھی۔ گالیاں بک رہی تھی۔" تائی شگفتہ نے سونے سے لدا ہاتھ لہرا کر کہا۔

"او مرتے او اس دن ہی گئی تھی جس دن آخری پت مرا تھا ہمارے ہاتھوں، یہ رائفلیں تو شریکوں کے منہ بند کرانے کو چلائی تھی ہمارے سامنے۔" چاچا سفیر نے لسی کا جگ منہ سے لگایا۔

"ٹھنڈ پے گئی تسے۔ کامران کا سالا آئے گا تو پنچایت بٹھا کے صلح کرلیں گے۔ وہ تیجے لوگ (تیسرے) دشمنی کھینچیں گے نہیں اب۔"

"اوتے کامران دا پتر؟ کج پتہ وی اے ستائی (ستائیس) سالاں کا ہوگیا ہونا اب۔" بے جی نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"لو بے جی، کی گل کردے او۔ کامران کا سالا شعیب ہی تے پال رہا ہے اس نوں، صلح ہوگئی، گل ختم۔" مستنصر یا بی جی کا تغافل ایسا ہی تھا ہمیشہ سے۔

"او نکالو اپنی رائفلیں بچ جنازے ہیم جشن کرنا اے پورا۔" چاچا نصیر شوقین ور نگین مزاج تھے۔

"کافر، کالے دل والے۔" جنت کا جھولا رک گیا۔ وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بی اے کی انگریزی رٹتی نیلماں نے دہل کے اسے دیکھا تھا۔ وہ کالوؤں کا بارود تھی۔ دبتی نہ تھی۔ دراصل وہ دوسری کلثوم ولایت چشتہ تھی۔ اور جنت نے دیکھا اپنی حویلی کے پچھواڑے کے باغ سے دوسری طرف کے باغ میں موجود اس حویلی کو۔ جہاں گاڑیاں بھر بھر کے گارڈز اور عہدیدار جمع ہورہے تھے۔ گاڑیوں کی قطار دور تک بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ مڑی اور نیلماں سے بولی۔

"وہ آگیا ہے نیلو! موئی کامران چشتہ بزدل نہ ہوا تو مزا آنے والا ہے۔" نیلماں نے گھبرا کے چھت کی چھوٹی دیوار سے جھانکا اور گارڈز کی تعداد دیکھ کے آہ بھری۔

Scanned with CamScanner

"ہاں۔ آ گیا ہے وہ۔ بزدل نہ ہوا تو مرنے۔"

☆☆☆

رام پور سکھوں کا بسایا دیس تھا۔ گول دائرے کی طرز کی گلیاں اور ہر گلی کے آغاز پر ایک دیوہیکل پھاٹک ہوتا۔ گھر روشن اور اونچی فصیلوں والے ہوادار سے بنے تھے۔ گلیوں میں جگہ جگہ دیوار کے اندر دیا رکھنے کا آستان کھدا تھا اور رام پور کے چاروں طرف چار برگد اور گاؤں کے عین وسط میں بھی برگد تھا جس کے تنے کے گرد ڈھائی فٹ اونچا گڑا سا بنا تھا جہاں ہر وقت مردؔ دیا لگا ئے رکھتے۔ گاؤں کے قبرستان کو جاتے رستے پر دو دو حویلیاں تھیں جن کے درمیان میں دو ایکڑ کا آم کا باغ تھا۔ ایک ایکڑ چشموں کا تھا دوسرا کالھوؤں کا۔ درمیان سے پکا نالہ گزرتا اور یہی نالہ وہ سرحد تھا کہ جس کے پار دونوں خاندانوں کے لیے موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"ابا جی! یہ دونوں خاندان تو سنا ہے بڑے ڈھاڈے دوست ہوا کرتے تھے پھر کیا ہو گیا؟"

گاؤں کے مرکزی برگد تلے بیٹھے کسی شخص نے بزرگ سے پوچھا۔ ادھر چٹھوں کی حویلی سے جنازہ نکلا تھا۔ سارے کاہلوں رائفلیں سنبھالے مچانوں پر کھڑے تھے۔ چٹھوں کے اکلوتے وارث کے گرد پورے شہر کی پولیس جتنا حفاظتی دستہ تھا۔

"لے یارانہ نہیں تھا صرف، اک دوجے کے گھر سے عیدیں شبراتیں (عید، شب بارات کے تحفے) جاتی تھیں۔ اکٹھے گڑ بیلتے تھے۔ سویاں بنانے کی مشینیں ایک حویلی میں لگتیں اور پورے سال کی سویاں بنائی جاتیں دونوں حویلیوں کی۔ یہ درمیانی آم کے باغ میں جھولے ڈلتے۔ چیت میں — بہنیں بیٹیاں اک دوجے کے سوہرے بھی آتی جاتیں۔ چنگے وقت تھے۔ کوئی ونگا (چوڑیاں چڑھانے والا) بھی جیب سے واپس نہ جاتا۔"

جنازہ قبرستان کو جاتی کچی سڑک پر اترنے سے پہلے دشمنوں کی حویلی کے پاس سے گزرتا اور دشمن جشن میں رائفلیں ہوا میں کھول دیتے۔ لوگوں میں ہلچل مچتی مگر وہ اکلوتا دشمن جبڑے بھینچے چلا جاتا۔ چھت پر کھڑی جنت فاطمہ کی آنکھ سے آنسو گرتا اور صحن میں بیٹھی بے جی کا بدن ہلکورے لیتا روتا۔

بجن ٹور پردیس گئے

تے سونیاں ہوگیاں رواں

"فیر سنا کہ چٹھوں کی حویلی میں ڈکیتی ہوئی ہے۔ لاکھوں کا مال چوری ہوگیا۔ اور فیر دھمکیوں والے فون آتے۔ حویلی میں کہ پولیس کے پاس نہ جائیے ورنہ یہ کردیں گے وہ کردیں گے۔ ولایت چوہدری کا داماد پولیس والا تھا اس نے کھرا کروایا تے او کاہلوؤں کی حویلی دا نکل آیا۔ ٹھن گئی دونوں خاندانوں میں بس فیر پیسہ تھا۔ بندوقیں تھیں۔ خاندانی فخر و غرور اور مرنے کو غریب لوگ، چٹھے تے تو امیر پر تھے کم۔ ادھر سے کاہلوں تھے۔ چھ بھائی اور ان کے چودہ پتر ولایت خان چٹھا اکلوتا تھا۔ تین بیٹے تھے۔ ایک تو کاہلوؤں کے پہلے ہی وار میں باپ کے ساتھ مر گیا۔ دوسرا کوئی پانچ چھ سال لڑا۔ چھ جوان مروائے اس نے کاہلوؤں کے۔ فیر بھٹے چڑھ گیا کاہلوؤں کے۔

تیجا ابھی چھوٹا تھا کامران ولایت، بڑی چنگی روح والا، اسلام آباد پڑھتا تھا جب بھرا (بھائی) مارا گیا تعلیم چھوڑ رام پور آ گیا مرنے۔ دوسری تحصیل کے ایم پی اے سے رشتے داری کرلی کلثوم ولایت نے، پوتا ہوا تو کامران کو لگا کہ وہ پتر نہ مرواسکے گا۔ صلح کی کوششیں ہوئیں۔ صلح ہوئی۔ پر کاہلوؤں نے بھری کچہری میں مروا دیا نمانے کو۔ سب بھائی مرگئے۔ کامران کی بیوی اس کا بیٹا لے کے غائب ہی ہوگئی جیسے اور پیچھے رہ گئی کلثوم ولایت۔ رائفلوں کے ذخیرے اور مربعے زمینوں کے ساتھ۔ اور آج تو وہ بھی مک گئی۔ اب یہ کالے دل والے کاہلوں ہی رہ گئے ہیں رام پور میں کہرام بن کے۔"

بزرگ کو کھانسی کا دورہ پڑا تھا اور تب ہی قریب سے جنازہ گزر رہا تھا۔ وہ مرد جو سوال پوچھتا تھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کھیل ختم نہیں ہوا ابا جی! چٹھے ابھی ختم نہیں ہوئے۔" وہ اٹھے کندھوں اور جھکی نگاہوں والے موئی کو دیکھتے کہنے لگا۔ جنازہ آگے بڑھتا رہا۔

☆☆☆

پچھلے چیت میں......

وہ آم کے باغ کا آخری پیڑ جیسے عشق ہو جنت فاطمہ چوہدری کا۔ اس کے موٹے تنے پر نیم دراز وہ ریڈیو کا اسٹیشن پکڑنے کو بے تاب تھی۔ آموں کا بور اس کے اوپر آن گرتا۔ وہ جھنجلاتی۔ اتنے میں مخصوص پائل کی چھن چھن گونجی اور ریڈیو کی دھنیں جنت کے لیے بے معنی ہوگئیں۔

وہ تنے سے پاؤں لٹکا کے بیٹھی اور آواز کی سمت دیکھا۔ وہاں وہ چلی آتیں۔ غزالی آنکھوں والی بوڑھی عورت جن کے بالوں کی چٹیا کے بل گننے میں وقت لگے۔ زمین پہ گھسٹتی رائفل اور الائچی چباتا سنجیدہ چہرہ، جنت نے ایک ننھے سے آم بنتے بیج کو نیچے نالے میں پھینکا۔ چھل ابھری اور کلثوم ولایت کے قدم رکے۔ رائفل تنی۔

"کون کرتا ہے اٹھکیلیاں؟" بھاری دبنگ

آواز میں پوچھتیں۔
جنت ریتک کے دوسرے تنے پر ہوئی اور بیج کلثوم ولایت کے پیروں پر دے مارا۔
"کون ہے؟" وہ فائر کر کے پوچھتیں۔
"وہی جسے پسند ہیں آپ کی پازیبیں اور بہت سے بل۔" لٹ کو انگلی پر پیچتی وہ کہتی۔ کلثوم ولایت الائچی جیسا ہنستیں۔
"تو بزدل کالوٹس میں کوئی ہے جو ہم سی ہے۔" چلتے ہوئے نالے کے قریب آتی درختوں کو ٹٹولتی اور جنت کے پاؤں دیکھتیں۔
"کہیں تم ہمارے والی تو نہیں؟"
"میں کسی کی والی نہیں کیونکہ مجھے اس مشین کا شور نہیں پسند۔" وہ بندوق کی طرف اشارہ کرتی۔
"اگر ہمارے والی ہوتی تو تحفہ بھیجتی ان پازیبوں کا اور خالص آملے کے تیل کا۔" اپنی بات کہہ کے وہ پلٹنے لگتیں۔
"یہ مشین کھا گئی میرا باپ۔ میرے والے کا باپ اور...... اور تم لوگ اسے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہو۔"
جنت کی بات پہ کلثوم ولایت کے قدم رکتے۔
"نیچے اتر، شکل دکھا اپنی۔" اگلے دن وہ خود سے آ کے کہتیں۔
"منہ دکھائی میں بس پازیبیں نہیں چاہئیں مجھے۔" املی کا چٹخارہ لیتی وہ قدم قدم تنوں پر چلتی۔
کلثوم ولایت کا سن ہوتا۔
"تو پھر کتنے مربعے لکھوائے گی اپنے نام؟" طنز سے کہتیں۔
وہ کھلکھلا کے ہنستی۔
"آجا۔ شاباش۔" وہ کچے نالے کنارے بیٹھ جاتیں۔
"حویلی دکھاؤ گی اپنی؟"
"اب تو مروانے کو بھی کوئی نہیں بچا پتری، کیوں نئی جنگ میں جلا کرتی ہے۔" درخت کے تنے سے ٹیک لگاتیں۔
"کیوں نہیں بچا؟ ہے ناں۔ وہ۔ وہ بے تحاشا کھلونوں والا۔" بچپن کی یاد کا حوالہ تھا۔ کلثوم ولایت کے کلیجے کو ہاتھ پڑا۔
"میں قیامت تک نہ کراؤں ایسی منہ دکھائی تیری۔ وہ شیر کا پتر ہے۔ پر اسے حکمرانی کی لت ہی نہیں۔ نام نہ لیجیو اس کا بھی۔" پھنکار کے بولیں۔
"تو کیوں بنایا اس شیر کے پتر کو میسنہ، کالوٹس کا ایسا بھی کیا ڈر؟"
کلثوم ولایت اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"ڈریں وہ جن کے صحن بھرے ہیں بیٹوں سے ہم سے کسی سے ڈرا نہیں جاتا۔ کوئی شک ہے تو بتا؟" ان کی آواز میں ایسی للکار تھی کہ جنت فاطمہ کی سانس اٹکی۔ اور اگلے دن...... وہ چشموں کی حویلی میں تھی۔
کلثوم ولایت نے حویلی ملازماؤں سے خالی کرا رکھی تھی۔ اب جنت کی کھلکھلاہٹیں اور کلثوم ولایت کی پازیبیں رقصاں تھیں۔
"سنا تھا کلثوم ولایت رام پور میں سب سے حسین عورت ہے۔ آج دیکھ کر مان لیا۔" قیمے کا نوالہ منہ میں رکھتی جنت فاطمہ نے کہا۔ کلثوم ولایت مسکرائیں۔ بولیں۔
"سنا تھا کہ کالوٹس میں اک مری صورت و دلیری جیسی بھی ہے۔ آج مان لیا۔" چٹیا کو بل دیتی رہیں۔
وہ دن دشمن سے دوستی کا تھا۔ کلثوم ولایت نے خود سے چالیس سال کم عمر لڑکی سے دوستی گانٹھ لی تھی۔
"اور آج۔ آج میری سکھی مر گئی۔"
حویلی کے چبوترے سے لپٹ کے وہ روئی تھی۔ بے تحاشا۔ نیچے صحن سے قہقہوں کی آوازیں آتیں۔ وہ زہریلی ہو ہو جاتی۔
نیلماں روئی کا تھال اس کے قریب دھر گئی تھی۔ پھر وہ پیتل کا گلاس لیے اٹھی اور منڈیر سے وہ آب خورہ زمین پہ دے مارا۔ چھناکے کی آواز سے قہقہے رکے۔
"تیری تو......" چھوٹا لالہ بھڑک کے اپنی جگہ سے اٹھا۔
"او بہہ (بیٹھ) جا قاسم، لاڈو کی رشتے دار مری ہے۔ رائفل نہیں چلا سکی یہ۔ آب خورہ ہی سہی۔"

Scanned with CamScanner

میاں جی نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ۔ وڈی چنگی ناں ہو تو۔" لالہ قیس جھاڑ کے وہیں بیٹھ گئے۔

"دھیان رکھو اس دا۔ کہیں کسی دن نالہ پار کر گئی تے واپس نہ لائی جائے گی سرپھری۔" نصیر چاچا نے پتے کی بات کہی۔ باتیں پھر سے ہونے لگیں۔

"تو کیا کہا تھا اس کم ذات نے؟" باسط لالہ نے بات وہیں سے شروع کی۔

"میں نے کہا کہ کالووں نے رائفلیں چلا کے اچھا نہیں کیا چٹھہ صاحب!" بولا "جیسی حیائی میری دادی نے ان کے سامنے گزاری تھی۔ اس کے لیے اتنی سلامی تو بنتی تھی کالووں کی۔"

"ہونہہ۔ باپ جیسا بزدل۔"

"او ٹھیک ٹھیک، اک ہور گل وی کہی ہے اس نے کہتا تھا۔

ہماری تو آخری سلامی تھی یہ۔ ان کی تو ابھی بارہ تیری سلامیاں پڑی ہیں ہماری طرف۔" ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ چھت پر بیٹھی جنت کے لب مسکرائے۔

"کامران کے سالے سے جلدی بات کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے صلح کرو۔ نکلے یہ رام پور سے۔ بڑی دیر لڑ لیا۔" میاں جی کی متفکر آواز گونجی۔

"اسے ختم کرتے ہیں میاں جی! ہماری ایک پگ رہن رکھی ہے ادھر جو میں کبھی نہ چھوڑوں۔" یہ شیر دل تھا۔ کالووں کا اکلوتا مرد ہوجے۔ پہاڑ سی اٹھان۔ خوب صورت چہرہ اور دلیر کردار۔

"صلح کرتے ہیں اور پگ بھی واپس مانگ لیتے ہیں۔" میاں جی جیسے ادب گئے تھے۔

"میں پگ خود ہی چھین لوں گا ان سے۔ صلح آپ کو مبارک۔" وہ حویلی سے نکل گیا۔ اور جنت کے عقب سے چاند ہولے ہولے چڑھتا رہا۔

☆☆☆

چن کتھاں گزاری ای رات وے
میڈا جی۔
او چن کتھاں......

من جیت سنگھ نے رائفل سے آم کا بور نوچتی گھبریوں کا نشانہ باندھا اور تان لگائی۔ چھپاک سے گھبری بیچ نالے میں جا گری اور موئی کامران کے قدموں نے نالے کے پار سرحد سے آگے دیکھا۔

کالووں کا باغ سنسان پڑا تھا۔ حویلی کی سرخ اینٹوں سے چنی دیواروں پہ بے نقش دیکھا وہ پشت پر ہاتھ باندھے نالے کے ساتھ ساتھ چلا۔ پھر وہ ایک مقام پر رکا۔ وہاں جہاں مکئی کے بھٹے کا ٹکڑا پڑا تھا جیسے کوئی یہاں بیٹھا تنے سے ٹیک لگائے اسے کھاتا رہا ہو۔ اسے کلثوم ولایت وہاں بیٹھی نظر آئی ہو جیسے۔ پھر اس نے بھٹے کے بقیہ آدھے حصے کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ اور وہ آدھا حصہ اسے نالے کی دوسری طرف نظر آیا۔ آم کے تنے کے پاس۔

وہ ساکت سا کھڑا کانٹے دار جھاڑیوں میں آگے اس گلابی پھول کو دیکھتا رہا جس کا وجود خوب صورت سے زیادہ باہمت تھا۔ خوش رنگ سے زیادہ خوش امید۔

دے ڈھول سانول
اج ٹھیک کری دا

من جیت سنگھ کے سر نے باغ ساکت تر کر دیا جیسے مگر ایک جنبش...... چھن چھن چھن...... وہ چونکا۔

"ہیڈ شوق سے کھاتی ہے۔" اسے خط کی سطریں یاد تھیں بالکل یاد۔

"پازیب کی اس قدر شوقین کہ وقت پڑنے یہ کالووں کا سارا دھن تیاگ کے گھنگروؤں میں پرو لے۔"

دوسرے خط کی چوتھی سطر میں تھی یہ گوہر افشانی، موئی کامران چٹھہ کے تنے کندھے متوجہ ہوئے اور نگاہیں جنوں میں چھپی ڈالیوں کو کھوجنے لگیں۔ پازیبیں جیسے چھنکنا ئیں۔ چھن چھن کی آواز کچھ اور شوخ ہوئی۔

"چٹھہ صاحب! تحصیل دار صاحب ڈیرے میں آئے بیٹھے ہیں۔ چل سکدے او؟" ماموں زاد ہاشم شعیب نے پگڈنڈی پر کھڑے ہو کر تان لگائی تو وہ چونک کے مڑا۔

دے ڈھول سانول
اج نہیں کری دا

آواز کا سحر قائم و دائم تھا مگر چھن چھن ناراض سی تھی۔ وہ ڈیرے کو چلتا جاتا اور دل پیچھے کو بھاگا جاتا۔ اسے رام پور سے پہلی بار خوف آیا۔

☆☆☆

گندم کی کٹائی شروع ہوئی تھی اور آم ابھی کیریاں کہلاتے تھے۔ سارے رام پور میں گھاس اور جنگلی پھول وافر ہو گئے تھے۔ گھر کے مرد صحن کے کونے میں بنے تھڑے پہ دھرے موڑھوں پر بیٹھے بکرے کے گوشت کے شوربے کے پیالے پیتے۔

"تحصیل دار کہتا ہے ساڑھے سات ایکڑ تو وہ چٹھہ نمبردار والے کھیتوں سے نکلوا لے گا۔ باقی تیس ایکڑ پر سیدھا سیدھا قبضہ ہے ہمارا۔ قبضہ بھی چھڑوا لے گا۔" مجھلے تایا کا متکلم سب کو بتائے جاتا۔ کئی ایک پہلو بدلتے کھنکارتے۔

"ہم تو اس کی قبر کے لیے دو گز زمین نہ دیں اور یہ چلا ہے قبضہ چھڑوانے۔"

شیر دل کی للکار چھپل نے سنی اور چھت پر بچھی چارپائی پر کیٹی جنت کے کانوں تک پہنچائی۔ نین تارا گھبراہٹ میں ہاتھ والا پنکھا زور زور سے جھلا کے جنت کو ہوا دیتی۔ جنت کروٹ بدلتی۔ اپنی چھنیا کے بل گنتی پوچھتی۔

"ہجویری شاہ کے میلے میں کتنے دن رہ گئے بھلا نیناں؟"

"بس اگلی جمعرات۔" نیناں تارے گنتی کہتی۔

"تو دیکھنا اگلے جمعے کو وہ ان کا بلوؤں کی کاٹھیوں پر چڑھا بیٹھا ہوگا۔ وہ زمین کے ساتھ ان سے دستار بھی چھینے گا۔" سرد سا بولتی۔

"اور تو خوش ہو گی جنت فاطمہ چوہدری؟ ہمارے چھ بھائی مار دیے انہوں نے تیرا اباپ مار دیا۔ اور تو دیہاڑے گن رہی ہے کہ وہ ان کی دستاریں چھینے؟" نیناں کی آواز گھٹ گھٹ کے آئی۔

"فرعون کے محل میں بھی تو کچھ ایسے ہوں گے جو اس کے غرق ہو جانے کی منتیں مانتے ہوں گے۔ ہاں میں وہی غدار ہوں۔ میری بلا سے جو کوئی بھی مرے بس سکون کو لمبی زندگی ملے۔ امن تا حیات رہے۔"

نیناں نے گھور کے اس سرپھری کو دیکھا۔ تب ہی سکینہ اوپر آئی۔

"جنت باجی! تہاڈی امی جان بلا رہی ہیں اپنے کمرے وچ۔" وہ پھولی سانسوں سے پیغام دیتی۔ جب جنت دھڑ دھڑ نیچے اترتی تو کئی ایک گردنیں اس کی طرف گھومتیں۔

"او چاچی، سمجھائیں اسے، چٹھوں کی حویلی کو چھت پر چڑھ کے گھورنا بند کر دے ورنہ کل کلاں کو اس بزدل آخری" چٹھے کا سینہ بھونتے ہمیں اس کی چیخیں سخت تنگ کریں گی۔" شیر دل نے حسب معمول جملہ پھینکا۔

"میاں جی کی رائفل سے ابھی تیرا سر کھول دوں تو کیسا رہے گا؟ پھر تے تجھے میری چیخیں سنائی دینے والا کوئی ذرندے گا ناں؟" زبردست قہقہہ پڑا تھا۔

"او جیتی رہ میری پتری۔" میاں جی نے دلیری پر داد دی تھی۔ شیر دل اسی ادا پر تو قربان تھا۔ مسکرایا۔

"میاں جی اسی سے نہ قصہ ختم کروائیں اس موئی کامران کا۔"

"او چھڈ دو یار۔ کل کے بچے سے کیسی دشمنی۔ ہجویری شاہ دے میلے پر جب ساری پنچائت بیٹھے گی تے بس ہو جائے گی صلح۔ زمین واپس کر دیتے ہیں اس کی۔ خاندان مکا (ختم) دیا ہم نے۔ اب بس۔" میاں جی نے حقے کی نال منہ سے لگائی۔ وہ ماں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ خدیجہ کی تسبیح رکی۔

"شام سے نظر نہ آئی میری دھی؟" وہ ان سے لپٹ گئی۔ جواب نہ دیا۔ وہ اس پر دم کرنے لگیں۔

"بھراؤں سے منہ ماری نہ کیا کر میری دھی، بیٹیاں جرأت مند ہوں تو زمانے کو انہیں گالی دینا بڑا آسان لگتا ہے۔"

"اماں اراکھوں کے ہوتے گالی سے کیا ڈرنا!"

"پتر، گولی سے انسان اک ہی وار میں مر جاتا ہے۔ گالی تو بار بار دو پھر بھی جواب میں گالی ہی ملے گی۔" خدیجہ نے تڑپ کے اسے خود میں بھینچا۔

"جنت۔ بہت نہ کر، اب بس کر دے ناں،

ستاراں ورے (سترہ برس) ہو گئے ہیں باپ نوں مرے۔ تجھے صبر کیوں نہیں آرہا میری جندڑی۔"

"گولیاں رک جو نہیں رہیں اماں۔ کیا ابا جی اتنے بھی قیمتی نہ تھے کہ ان کی جان کی قربانی کے بدلے یہ بری گولیاں رک جاتیں۔" وہ عجب تھی۔ روتی ہی نہ تھی۔

"جھلی دھی، او تے اتنے قیمتی تھے کہ ان کے بدلے کامران مرا اور چھ اور کالے چٹھوں کے اور......"

"اماں......!" وہ دکھ سے پلٹی۔

"اس دا مطلب ہے۔ ایتھے کوئی جان کے قیمتی ہونے دا مطلب ہی نہیں جانتا۔" وہ جانے کس بستی سے آئی تھی وہ جان کی قیمت جانتی ہو جیسے۔

"اچھا چھڈ میری لاڈو۔ ماں کے ہتھ سے روٹی کھا۔ باقی گلاں فیر سہی۔" وہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔

☆☆☆

اور وہ آم کے باغ میں رونق کے دن تھے۔ کیریوں سے باغ کی دھرتی بھری رہتی اور جنت فاطمہ کا منہ بھی۔ کومل کی جوانی کے دن تھے جیسے۔ یوں جیسے کسی نو بیاہتا کا پردیسی سرتاج چھٹی پر آیا ہوا اور وہ اس کے گرد دیوانہ وار گھومتی چہکتی ہو۔ جنت پرندوں کے پانی کے کٹورے بھر بھر کے منڈیروں پر رکھتی جب پیپل کے نیچے سے کوثر کے بولنے کی آواز آئی۔

"بے جی! سنا ہے بڑی لڑائیاں چل رہی ہیں ادھر چٹھوں کی حویلی میں۔" دیسی گھی سے سر کی مالش کرواتی بے جی غنودہ آنکھوں سے اشارہ کرتیں "کیا ہے؟"

"سکھنی بتا رہی تھی کہ من جیت کہتا ہے۔ جتے کی ماں کہتی ہے رام پور چھوڑ اور میرے ساتھ واپس چل۔ پر وہ کہتا ہے کہ کلثوم ولایت کی رائفل اب بھی نہ دھرے گا وہ نیچے۔ ماں چلی گئی ہے لڑ کے بھرا دے گھر واپس۔ منڈا ادھر ہی ہے۔ سکھنی کہتی ہے مرن مئی چڑھی ہے شوہدے کو۔ اینڈی سوہنی تے ستھری جوانی۔ او دی اتھری۔ بس جی کالوواں نواں......"

کوثر کی بات بیچ میں ہی رہ گئی اور پیچھے سے ایک چوہدرائن نے چیخ کے اسے پکارا۔

"اس دے باپ دی جوانی دی بڑی ستھری تھی کوثر ی! تین گھنٹے کچہریوں کی زمین پر پڑی رہی تھی اس دی لاش۔" جنت فاطمہ کا دل پانی کے کٹورے میں ڈوب گیا۔ کومل نے پھر سے بین ڈالے۔

اسے یاد آیا کہ اس کے باپ کو بھی چودہ گھنٹے مردہ خانے میں رکھنے کے بعد اور رات کے آخری پہر کی تاریکی کا اطمینان کرلینے کے بعد ہی خاموشی سے دفن کردیا گیا تھا۔ یہ تھیں جراتوں اور مردانگیوں کی حقیقتیں۔

☆☆☆

"بڑی پنچایت کی سربراہی علاقے کے ایم این اے نے کرنی ہے۔ ابا جی دی گل ہوگئی ہے ان سے۔ بس سیدھی گل کرنی ہے کہ جی ہماری زمینیں چھوڑ دو۔ اب ہم لوٹ آئے ہیں۔"

ہاشم جیپ میں اس کے ساتھ تھا۔ ہدایات دیے جاتا۔ پنچایت کبڈی کے میچ کے بعد اسی اکھاڑے میں لگنی تھی۔

ہجویری شاہ کے میلے پر جیسے رونقیں ٹوٹ پڑی ہوں۔ بھاگتے دوڑتے کھلونے خریدتے، جھولے جھولتے بچے، آنچلوں میں جلیبیاں، اندرسے بھرے کھلکھلاتی لڑکی بالیاں۔ مرغوں کی لڑائیاں کراتے ہاہاکار مچاتے جوان۔ وہ عادتاً پشت پر ہاتھ باندھے اکھاڑے کو جاتے ہوتے پنڈال پہ نظر دوڑاتا۔

منت پوری ہونے پر اللہ دتا چوہان حلیم کی دیگ چڑھانے آیا تھا۔ پہلے اور زیادہ لینے کے چکروں میں رجو اور صغریٰ نے بات تو تکار سے شروع کی اور اب ہاتھا پائی جاری تھی۔ گتھم گتھا ہوتی دونوں، کفگیر بھر کے شاپر میں حلیم ڈالتے اللہ دتا پر جا گری تھیں۔ نتیجتاً کفگیر کا مواد فضا میں اڑا اور واپس زمین کی طرف لوٹا کئی ایک کو اپنی لپیٹ میں لے گیا۔ گرم حلیم سے جھلسے ہوؤں کی آہ و بکا کو خاطر میں نہ لاتے وہ دونوں اٹھ کے پھر سے ایک دوسرے پر جھپٹا مار چکی تھیں۔ میلوں

کی ایک رونق یہ لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔"
موسیٰ کے چہرے پر الگ سی رنگت کی۔ اور کتنی دیر سے چھن چھن کرتے قدم رکے۔
"نی اے تے بندا (ہنستا) دی اے۔" پھنسی پھنسی آواز میں تبصرہ کیا گیا اور موسیٰ متوجہ ہو گیا۔
"بندا ہو گا۔ بس یہ دیکھ کہ آگے کب تک بندا اے۔"
یہ آواز پر اعتماد تھی۔ ٹھہری، ٹھنڈی اور دلیری۔
موسیٰ رک گیا۔ پلٹا۔ کچھ قدم دور کھڑی دو لڑکیاں ہڑ بڑاہٹ میں پلٹیں۔
موسیٰ نے بغور دیکھا۔ چادروں میں لپٹے وجود۔ نظر رینگتی ہوئی پیروں تک گئی۔ اونچے قد والی کے پیروں میں وہ نازک پازیب تھی۔ وہ اگلے ہی لمحے واپس مڑ گیا۔ پر اسے یاد رہا اگلے کئی لمحوں تک جب تک کہ وہ پنچایت کے سامنے تھا۔
دوست محمد کاہلوں عرف میاں جی نے اپنے یار کی نسل کو بیس سال بعد دیکھا۔ اور ایسا کڑیل جوان دیکھ کے جگر میں سوئی اٹکی ہو جیسے۔ انہیں کامران چٹھہ سے صلح کی وہ شام یاد آئی جس میں سات سالہ موسیٰ کامران باپ کے پہلو سے لگا سب کاہلوں کو از بر کرتا۔
اندھی دشمنی نے دلوں پر ایسی مہر لگائی تھی کہ اگلے روز کچہری جاتے بیٹوں کے ہاتھ سے رائفلیں لینا بھول گئے اور پھر خبر آئی کہ انہوں نے کامران کو ڈھیر کر دیا۔ خاندان بھر کو ایسی چپ لگی کہ دو سال تک بیٹے یہاں وہاں پناہ لیتے پھرے۔ صحن سے آنکھیں موندتے وہ موسیٰ کی آنکھ کا غیظ دیکھتے۔ ایسا غیظ جو کامران کی آنکھ میں ہوتا تو موت کو اسے لے جانے کی اتنی جلدی نہ ہوتی۔
"او وتے۔ ہم نے تو سنا تھا بڑا مرد ہے چٹھہ اوائے تے مہاراجہ رنجیت سنگھ جتنا حفاظتی دستہ ساتھ لیے گھومتا ہے۔" شیر دل نے ٹانگ پہ ٹانگ جماتے میراثی کو مخاطب کر کے کہا جو حقہ گرم رکھنے کو ہر پنچایت میں موجود رہتا تھا۔ تیرہ...... تیرہ مرد...... موسیٰ نے گنتی مکمل کی۔ اور سگریٹ سلگاتا سکون سے بولا۔
"میں بزدلوں سے زیادہ گولی کی رفتار کو مانتا ہوں چوہدری صاحب! پھر قرآن پر ہاتھ رکھ کے صلح صفائیاں کر کے اگلے ہی دن منکر ہو جانے والوں پر بھروسا تو ابلیس بھی نہ کرے۔"
محفل میں ایسا سکوت چھایا کہ کئی لمحے کوئی بول نہ سکا۔ دور کھیتوں میں مغرب کی اذانیں گونجنے لگیں تو وہ مزید بولا۔
"صلح کے معاہدے اکھاڑوں میں ہوتے اچھے نہیں لگدے میاں جی! حویلی آنے کی دعوت پہ غور کروں گا۔ گھر کی گل اے۔ گھر میں طے کرتے ہیں ناں۔" ہر ایک نے چونک کے اس سرپھرے کو دیکھا۔
شیر دل نے بے ساختہ رائفل کندھے سے اتاری، موسیٰ مسکرایا۔
"چوہدری صاحب! چوہدری صاحب! عام سا انسان ہوں میں۔ بس خاص یہ ہے کہ میں ڈرتا نہیں۔ موت سے تو بالکل نہیں۔ جہاں سب سدھار گئے مجھے جاتے کوئی ڈر نہیں۔ بس چاہتا ہوں کہ کاہلوں کی گنتی کم نہ ہو۔ پانچ چھ بھی اگر جاتے ہیں تو یہ نسل بین کرتے گزارے گی اور ہم۔ ہماری تو نسل ہے ہی نہیں۔"
وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔
"کل شام آتا حویلی، ختم کرتے ہیں یہ کھیڈ (کھیل)۔" میاں جی نے کہا تھا۔ وہ رکے بغیر بڑھتا رہا۔

☆☆☆

وہ ستونوں اور برآمدوں سے بھری حویلی تھی جس کا صحن سرخ اینٹوں سے بنا تھا۔ عشق پیچاں کے کاغذی پھول اڑتے پھرتے اور پیپل کے پتوں نے تالیوں سے شور کر رکھا تھا۔ ملازمائیں دودھ کے جگ بھر بھر کے رکھتی جاتیں۔
افراتفری میں بھی اک سنجیدہ سا سکوت تھا۔ کئی دل لرز رہے تھے۔ کئی دل چپ تھے اور ایک دل وہ بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ مسہری پر دوپٹا ایک طرف

ڈالے وہ ریڈیو کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ جب نین تارا بھاگتی آئی۔

”اوآ گیا جنت!“ خبر سنتے ہی چپل پہنے بنا باہر بھاگی۔ پیپل تلے بچھی چارپائیوں پر رنگلے کھیس اور سفید تکیے سجے تھے۔ منقش پائیوں والی چھوٹی میزوں پر دودھ کے جگ اور مٹھائیاں دھری تھیں۔ چارپائیوں پر اکڑ کے بیٹھے مرد تناؤ سے بھرے تھے۔ وہ چھن چھن کرتی بھاگتی آئی تھی۔

پیپل کا گلاس پکڑتے موسیٰ کامران کے گلے میں گھنٹی ابھری اور نگاہیں دائیں برآمدے کے ستونوں تک گئیں۔ وہ بھاگتی زینوں تک جاتی۔ نگاہیں پیروں سے اوپر اٹھتیں اور اس لانبی چٹیا کے لاتعداد بلوں تک جاتیں اور واپس آب خورے تک پلٹ آتیں۔

اگلے ڈیڑھ گھنٹہ تک وہ زمینوں کے معاملات، نہری پانی کے مسائل اور اپنی منڈیوں کے معاملات طے کرتا اور منڈیر کے ساتھ ساتھ چلتے وجود کی پازیب کی بے چینی محسوس کرتا۔ میاں جی جوان خون کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ تعاون کرتے۔ جب وہ اٹھا تو جلبلاتا شیر دل چپ نہ رہ سکا۔

”ہماری بک ہے تمہاری طرف، ہمیں واپس لوٹا دو۔ ہم آج تک معاہدے کے پابند رہیں گے۔“ موسیٰ کامران نے ناسمجھی سے دیکھا۔

”مجھے خبر نہیں اپنی اماں جان سے پوچھوں گا۔ ایسا کچھ ہوا تو من جیت کے ہاتھ واپس لوٹا دوں گا۔“ سب نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔ شیر دل اطمینان سے مسکرایا۔

”اب پھر؟“ جیپ میں بیٹھ کے ہاشم پوچھ رہا تھا۔

”کالوؤں کی لڑکی ہے وہ۔“ وہ کہتا۔ ہاشم حیران ہوتا۔

”تو وہ کالوؤں کی لڑکی ہے۔ کیا بات ہے دادی جان......“ ادھر وہ بھاگتی نیچے اترتی۔

”اسے تو خبر نہیں۔ اماں جان سے پوچھے گا وہ۔ اور اسے دیکھو، بھاگ بھاگ کے شیدائن ہوئی جاتی ہے۔“ چھوٹی چاچی کی بات پر لڑکیاں ہنسی تھیں۔

☆☆☆

باغ میں لگی کیریاں لڑکپن کا زمانہ گزار چکی تھیں۔ اب جوانی کے دن تھے۔ جنت فاطمہ چوہدری کالوؤں کو سارا دن نظر نہ آتی۔ وہ باغ سے بندھ گئی تھی۔ مٹی کے ڈھیلوں اور غلیل سے پھل کی حفاظت کرتی۔ پرندے اڑاتی اور آم کی آخری شاخ سے لٹکی ریڈیو کی فریکوئنسی ماپتی۔ نیناں کے حویلی اور باغ کے چکر بڑھ گئے تھے۔

وہ ڈیرے پہ ہاشم کے دوستوں کی بلا کار سے تنگ آ کے باغ میں نکلا تھا۔ ابھی ابھی کچی تھی مگر پھل بہت آیا تھا۔ وہ عادتاً پشت پر ہاتھ باندھے باغ میں چلتا جاتا۔ گھنا سایہ دار گھپ سا باغ پرندوں کی بولیوں سے بھرا تھا۔ کالوؤں کے باغ میں زمین کو پانی دیا گیا تھا تو نم سی خوشبو موسیٰ کامران کے باغ میں بھی کود آئی تھی۔

وہ کچے نالے کے ساتھ جے درخت سے ٹیک لگا کے کالوؤں کے نم باغ کو دیکھتا رہا۔ تب ہی ادھ کھائی کیری اس کے کندھے پہ گولی کی طرح آن لگی۔ وہ بری طرح چونکا۔

”کون ہے؟ کون ہے ادھر؟“ ایک اور کیری اس کے کان کی لو کو چھوتی ہوئی گزری تو وہ مشتعل ہوا۔

”من جیت! رائفل لا۔“ وہ دھاڑا۔ تب ہی سامنے والے آم کے درخت کی شاخ سے دو پیر نیچے لٹکائے گئے۔

من جیت نے رائفل لا تھمائی۔ موسیٰ نے ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ پیروں نے ایک دوسرے سے ٹکرا کے چھن چھن مچادی۔ جیسے وہ پازیب ہنسی۔ جیسے کہتی ہو کہ ہمت ہے تو باندھ نشانہ۔ موسیٰ نے پیر سے ذرا نیچے کا نشانہ باندھ کے فائر کر دیا۔ پازیب مزید ہنسی۔ دونوں نڈر نکلے۔

”نیچے اتر۔ ابھی۔“ ماتھے پر بل ڈالے وہ ہنوز نشانہ باندھے کھڑا تھا۔

"میں نے کہا۔ نیچے اترو۔" وہ چمن سے نیچے
کودی۔ شاخ پر اٹکا دوپٹا کھینچتی نڈر سی اس کی طرف
چلتی آئی۔ اور موسیٰ کامران کی نظر نے اسے جالیا۔
اسے پالیا۔ گھپ باغ میں جیسے منوں چاندی چمکی اور
اس سنہری مورت سے ٹکرا کے واپس شرمندہ لوٹ
آئی۔

اور جنت فاطمہ چوہدری نے بیس سال بعد
اسے نظر بھر کے دیکھ لیا۔ جس کے ماتھے کے بلوں پر
کوئی کافر بھی مر مٹے اور جس کی اٹھان کے قصے
شاعروں سے کہے نہ جا سکیں۔ رائفل نیچے ہوئی کہ مٹی
سے اٹے ان پیروں کو دیکھ سکے۔

"تکلیف ہوئی کہ کیری سے نشانہ لیا تیرا؟
میری چیز ہے میں جو مرضی کروں۔" اب وہ کسے اپنی
چیز کہتی تھی۔ موسیٰ نہ جانتا تھا۔

"اچھا تو یہ ہے جنت فاطمہ چوہدری۔ وہ جس
نے میری دادی پر ڈورے ڈال رکھے تھے۔" ہاتھ
پشت پر باندھ کے وہ پھر فرصت سے اسے دیکھتا رہا۔

"سہیلی تھی وہ میری۔ ڈورے تو میں نے
پوتے کے لیے سنبھال رکھے تھے۔" نالے میں پیر ڈبو
کے دلیری سے کہا گیا۔

وہ ہنسا۔ رام پور میں ڈیڑھ مہینے بعد وہ ہنسا۔ اور
چیٹھے کا حلوہ کٹوری میں لیے لوٹتی نیناں کی سانس کسی
تودے تلے دب گئی۔ اور جنت کو یاد آیا تھا۔

"اور وہ ہنستا کیسا ہے؟" آنکھوں میں دل
بھرے اس نے کلثوم ولایت سے کبھی پوچھا تھا۔

"ایسا کہ...... دیکھ کے دل ٹھنڈا ہو جائے۔"

جنت نے زیر لب کلثوم ولایت کا جواب دہرایا تھا۔
ہاں ایسا ہی تھا۔ وہ مڑنے لگا۔

"گولی سے ڈرا کرو۔ وہ کسی سنہری رنگ کو نہیں
مانتی۔" مڑتے مڑتے بولا تھا۔

"تیری دادی نے جنت کے بارے میں اور کچھ
بھی تو بتایا ہوگا جیسا کہ وہ...... اب...... اب کسی سے
نہیں ڈرتی۔ گولی سے بھی نہیں۔"

وہ چھپاک چھپاک پاؤں دھوتی بولی۔ وہ
ہنا رکے سنتا گیا۔

"اٹھ کمینی! مرنا ہے کیا؟ حویلی چل ابھی کے
ابھی۔" نیناں نے اس کا بازو دبوچ کے اٹھایا۔ وہ
تا حال مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ تو کیا کر رہی ہے جنتے؟ بڑا زہریلا ہے وہ۔
نیلی کر کے مارے گا۔" وہ آنکھ میں کاجل کی دھار کھینچتی
تو نیناں اپنا ٹھنڈا پڑتا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتی۔

"نیلی تے میں پہلے سے ہوں جھلیے۔ ہو سکدا
ہے کوئی تریاق ہی کر دے۔" وہ خود کو دیکھتی کہتی۔

"تجھے آخر معلوم ای ہے کیوں مروانا چاہتی ہے
اسے۔" نیناں بے بس تھی۔

"تو نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا ناں اسے۔"

"اب تو کالوؤں کی شہ رگ پکڑنے جا رہا ہے
موسیٰ! بھلے کتنے ہی مروا لے ان کی ایک گولی اور یہ
خاندان ختم۔ یہ تو کیا کر رہا ہے؟" ہاشم تپ کے اسے
انجام بتاتا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا۔ بس کچھ ہے اس کے پاس۔
نالے کے اس پار۔ آم کی اس شاخ پہ۔ مٹی زدہ ان
پیروں میں۔ کچھ ہے۔ وہ جسے سکون کہتے ہیں۔ دل
کہتا ہے جنت کہیں ہوگی تو ایسی ہی ہوگی۔ اس قدر
ٹھنڈک ہے اس میں کہ جس قدر سکون میں ہوتی
ہے۔"

اور وہ جو رام پور کی آگ تھی وہ دشمن کے لیے
ٹھنڈک بن گئی۔

وہ باغ کا سب سے اچھا پہلا آم اس کے لیے
لاتی۔

وہ اپنے کھیتوں کی سب سے میٹھی مکئی کا بھٹہ
برگد کے پتے میں لپیٹ کے اسے نالے کے پانی پہ
تیرا کے دیتا اور خود پہ ہنستا۔

وہ آندھی میں بھی شام چار بجے باغ میں پہنچ
جاتی اور وہ منڈی سے لاکھوں کی رقم کی وصولی کیے بنا
ہی لوٹ آتا کہ اب چار بجنے والے ہیں۔

وہ عشق پیچاں کے پھول پتے نالے میں بہا کے

Scanned with CamScanner

اسے بھیجتی تو وہ بہت قیمتی ریڈیو اس کے لیے لاتا۔
وہ اسے غلیل سے کیری توڑ کے دکھاتی اور وہ اس کو کلاشنکوف سے نشانہ باندھنا سکھاتا۔
وہ ہنستی تو وہ ہنستا۔ وہ مست ہوتا تو جنت کے دن میں حسن اتر آتی۔ رام پور نے ایسا والہانہ پن کسی کے دل میں نہ دیکھا۔ ایسے دشمن سے ایسی عقیدت رام پور کو حیران کرتی۔
"اداس ہو؟" وہ منکری اس کے سامنے بیٹھی پوچھتی۔
"میری حویلی دیکھی ہے تو نے؟" پوچھتا۔
"حویلی نہیں محل ہے کوئی وہ۔" کہتی۔
"اس محل کی ویرانی دیکھی ہے؟" وہ پوچھتا اور وہ چپ رہ جاتی۔
"اس محل سے زیادہ آباد تو من جیت کی کوٹھڑی ہے۔ میرا دل خالی ہو جاتا ہے وہاں جاتے ہی۔ بھلا گھر ایسے ہوتے ہیں؟"
جنت کو موسیٰ کی آنکھیں ریگستان لگیں......
ویران...... پیاسی...... منتظر...... وہ نالہ پھلانگ کے اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔
"قتل کرائے گی کیا؟" وہ مسکرا کے بولا۔ وہ چپ رہی۔ پھر ہولے سے بولی۔
"جب ابا قتل ہوئے، میں نو سال کی تھی۔ اس رات ابا کی لاش سرد خانے میں تھی اور بھوکا بلوؤں کی حویلی میرے لیے وہ سرد خانہ ہی تھی۔ پرسکوت، موت زدہ اور ویران۔ اس دن کے بعد سے حویلی میرے لیے ویران ہی ہے۔ کسی کا ماں سے چلنا نہیں بھایا مجھے۔ کوئی اپنے بچے کو چوم لے تو میں مرنے لگتی ہوں۔ کوئی اپنے کمرے میں مسکرا کے داخل ہو تو محرومیاں مجھے خالی کر دیتی ہیں۔ پر اماں نے مجھے جینا سکھا دیا ہے۔ پتا ہے جب مجھے نیند نہ آئے یا کچھ بہت مشکل لگ رہا ہو تو میں کیا کرتی ہوں۔"
وہ آنکھوں کی نمی کو پیچھے دھکیلتی بولی۔
"میں اچھی اور پسندیدہ چیزوں کو دہراتی ہوں۔ جیسے کہ باغ کی نم زمین اور رسی کیری۔" اب وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی جو سوچتا ہوا سا کہتا۔
"لہلہاتے فصل سے بھرے کھیت۔"
"گہری سبز چوڑیاں دونوں ہی ڈھیروں۔" وہ مسکرا کے بتاتی۔
"نئی جیپ۔" موسیٰ نے اپنے پیر نالے کے ٹھنڈے پانی میں ڈالے۔
"گرتے ہوئے زرد پتے۔" وہ پانی کو دیکھتی۔
"رات کو صاف نظر آتا آسمان۔" وہ آسمان دیکھتا کہتا۔
"شام چار بجنے کا انتظار۔" جنت نے پانی میں اس کا عکس دیکھا۔
"کیری کھا کے آنکھیں میچتی جنت۔" وہ مسکرایا۔
"پشت پر ہاتھ باندھے چلتا موسیٰ کامران۔" وہ پانی میں اس کے پیر پر پیر رکھتی۔
"ہنستے ہنستے غصیل ہو جاتی جنت۔" وہ اب کے سوچ کے ہنسا تھا۔
"غصے میں گولی تک مار دینے والا موسیٰ۔"
"موسیٰ کی جنت۔" اس نے اپنے پیر پہ رکھا اس کا پیر دیکھا۔
"جنت کا موسیٰ۔" پیر اٹھا کے مارا۔ گھنگھرو موسیٰ کے پیر سے ٹکرائے اور چھن چھن سی فضا ہو گئی۔
"ہو گیا؟ اب چل واپس۔ اپنی ماں کا اکلوتا لاڈلا ہوں میں۔ مروائے گی مجھے۔" وہ اسے دھکیلتا۔
وہ کل نہ آنے کی دھمکی دیتی اس پار کود جاتی۔ وہ واپس مڑتے اپنے سکون کو دیکھتا۔
☆☆☆
"جنت کو اس کے ابا بہت یاد آتے ہیں؟" وہ کسی بات پہ بے تحاشا ہنس رہی تھی جب وہ اچانک بولا۔ وہ چپ ہو گئی۔
"بس وہ کبھی مجھے بھولے نہیں۔" کندھے اچکاتے کہا۔ "روتی رہتی تھی بس۔"
"چشموں پر غصہ تو آتا ہوگا؟" وہ جیسے اکسا تا۔
"پہلے مجھے سمجھ نہ تھی جب سمجھ آئی تو اس دشمنی پہ

غصہ آیا۔ پھر دشمن سے دوستی ہوگئی تو بس دشمنی پہ ہی غصہ آیا۔ اب دشمن سے محبت ہوگئی ہے تو..... دشمنی، دشمنی نہیں لگتی۔"

وہ بہت دیر خاموش رہا۔

"تو اب غصہ کس پہ آتا ہے؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"شیر دل کی رائفل پہ..... دراصل ڈر لگتا ہے مجھے۔ وہ رائفل بڑی نڈر ہے۔" وہ شیر دل کی نظروں سے ڈرتی تھی۔ موسیٰ کو بتا نہ سکی۔

"مجھے لگا تھا، تجھے اس کی "نظر" پہ غصہ آتا ہوگا۔" ماتھے پہ بل تھے موسیٰ کے۔ وہ سر جھٹک کے ہنسی۔ وہ موسیٰ تھا۔ جنت کے روگ جانتا تھا۔

"جنت فاطمہ چوہدری! میرے پاس اتنی دولت ہے کہ سب کاہلوؤں کے سروں کی قیمت لاکھوں بھی لگاؤں تو، برسوں تک تمہاری حویلی میں میری حویلی جتنے مرد بھی نہ بچیں پہ۔ اب یہ دشمنی دشمنی نہیں لگتی۔"

"زیادہ چنگا نہ بن۔" وہ شرارت سے کہتی۔

"سوچتا ہوں، وہ ساری دولت تجھے حق مہر میں دوں گا۔" عجب شاہی انداز تھا۔ وہ ہنسی۔

"کنگلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ حق مہر تے اتنا ہی ہوگا، جتنا لکھا ہوا ہے۔"

وہ چونک کے پلٹا۔ وہ غلیل سے گلہری کا نشانہ باندھ رہی تھی۔ موسیٰ نے تادیر اسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

رت بدلی تھی۔ رام پور میں گہری دھند بچھ گئی تھی۔ باغوں پر سکوت چھا گیا اور مالٹوں کی ترشی باس نے ہر شے کو رنگ دار کر دیا۔ ٹنڈ منڈ کیکر اور شیشم دبیز دھند میں دیکھنے والے کو باندھ لیتے۔ گڑ بنانے کے بیلنے لگ گئے اور گھروں میں ساگ اور مکئی کے ڈھیر لگ گئے۔

اس دن موسیٰ نے جنت کی سرخ پڑتی ناک اور گلابی گال دیکھتے نالے کے پار ہاتھ بڑھایا تھا۔

"آج چل ناں حویلی۔ بہت جلدی شام ہو جاتی ہے وہاں۔"

"دماغ ٹھیک اے؟ مرنا ہے کیا؟" وہ اس کی ہتھیلی کو نظر انداز کرتی بولی۔

"ہاں مرنا ہے۔ چل ابھی۔" وہ جانے کیوں ضدی ہوا۔

"مرنا ہے تے اپنی رائفل کو استعمال کر۔ میرے بھائیوں کے سر ایک اور قتل نہ ڈال۔" وہ حسب سابق جنت ہی تھی۔ مگر موسیٰ بگڑ گیا۔

"تجھے کیوں لگتا ہے کہ میں اپنے باپ دادا جیسا سادہ انسان ہوں۔ یہ اونٹوں کی فوج مجھے دیکھ کے رستہ بدل لیتی ہے اور تو مجھے ان سے ڈراتی ہے۔ اور تجھے محبت، محبت بولنا آتا ہے بس۔ کبھی سمجھا ہے تو نے کہ مجھے کسی اپنے دی کتنی ضرورت اے۔ یہ ٹھنڈی قبر سی حویلی۔ میں ایک رات دی چین سے نہیں سویا اتھے۔"

"بگڑ کیوں رہا ہے۔" میں بھلا ایسے ای منہ اٹھا کے تیرا دل بہلانے کو وہاں کیسے جا سکتی ہوں۔ حد ہے۔"

"کیوں ...... وہاں کیوں نہیں جا سکدی۔ یہاں بھی تو آتی ہے۔ یہاں کون سا میں نے مدرسہ کھول رکھا ہے۔" کیا بات تھی اور کیا ہو رہی تھی۔

"اچھا آ آ آ..... ہن سمجھ آئی۔ موسیٰ کامران چٹھہ کو لگدا ہے کہ جنت فاطمہ چوہدری اس دی محبت میں نہیں اس کا دل بہلانے یہاں تک۔ یعنی اپنے باپ کے باغ کے آخری کونے تک آ سکدی ہے تے فیر تو اس کی حویلی یعنی کہ اس کی آرام گاہ تک وی جا سکدی ہے۔ مینوں اتنا معتبر کر دینے کا شکریہ چٹھہ صاحب۔"

آرام گاہ کا سنتے ہی موسیٰ کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔

"آرام گاہ۔" وہ طیش میں چند قدم پیچھے ہٹا اور تالی بجائی۔ "واہ چوہدرائن صاحبہ۔ چٹکیوں میں مجھے اور میرے کردار کو شرابی اور زانی کاہلوؤں کے برابر دینے کا شکریہ۔ اب کبھی ادھر مت آنا ورنہ من جیت کو

حکم ہوگا کہ منہ سر دیکھے بغیر گولی مار دے۔"

"ہن یہاں میرے باغ کی گلہری وی آ گئی ناں تے میں خود اس کے ٹکڑے کروں گی۔ جنت بھی اس جہنم میں نہ آئے گی اب۔ ختم ہوا تماشا۔"

وہ دونوں بیک وقت پلٹے تھے۔ ساڑھے چار بجے ہی گھپ اندھیرا چھایا تھا اس دن۔

☆☆☆

"شیر دل کی گولی لگے اسے۔ وہ بھی سیدھا سینے وچ۔" وہ نیناں کے سامنے بددعائیں دیتی۔

"ایویں بھاگ بھاگ محبت جمع کرتی رہی اس کے واسطے بزدل چٹھہ! سیدھا رستہ مشکل تھا ناں۔ اس واسطے چور رستہ! موڑ رہا تھا۔"

"چنگا کیا تو نہیں گئی حویلی۔ پر ہن اتنا جھوٹ بھی نہ بول خود سے۔ تو خود جانتی ہے کہ موئی کا ارادہ غلط نہ تھا۔ جیسے اس کی دادی تنہائی سے گھبرا کے تجھے حویلی لے جاتی تھی ویسے ای وہ بھی تیری ہنسی سننا چاہتا تھا اپنے آنگن میں۔"

نیناں نے صاف چٹ موئی کو بے گناہ کر دیا۔ وہ اور بگڑ گئی۔

☆☆☆

اور دن گزرتے گئے۔ دھند زیادہ گہری کہر زیادہ یخ اور ماحول زیادہ بے چین ہوتا گیا۔

وہ شیریں سے جھگڑ پڑی۔

ملازمہ کے پانی نہ لانے پر واویلا شروع کر دیا۔

بے جی سے سر پہ مالش کرواتے کرواتے روٹھ کے اٹھ گئی۔ اور اپنی ماں سے بات بہ بات الجھنے لگی۔

پھر چپکے سے چار بجے نالے کی آم پر چڑھے نگرانی کرتی رہی مگر وہاں ذرہ برابر ہلچل بھی نہ ہوئی۔

"یہ رہی تیری محبت۔" وہ غلیل میں پتھر رکھ کے چٹھوں کی حویلی پر بھی چلا آئی۔ مگر سکون کو نہ آنا تھا۔ نہ آیا۔

اس دن ہلکی ہلکی نڈھال سی دھوپ نکلی تھی۔ چھت پہ دھری چارپائی پہ بخار میں جلتا بے سدھ پڑی جنت فاطمہ چیخ کے اٹھی تھی۔

شیریں گھبرا کے اس کی طرف دوڑی جبکہ شہر بانو نیچے کسی کو بلانے گئی تھی۔ مگر جنت نے افراتفری میں چپل پہنی۔ دوپٹا گھسٹتا اس کے ساتھ سیڑھیاں اترا تھا۔ بھاگتے قدموں وہ حویلی کے پھاٹک سے نکلتے شیر دل سے ٹکرائی تھی جو عجلت میں تھا۔ وہ بڑا کے آگے بڑھ گیا۔ وہ بھاگتی گئی تھی۔ سرسوں کے کھیت، آم کا باغ، لیچی کا باغ، وہ چٹھوں کی حویلی کے پھاٹک پر موجود بندوقیں لیے کھڑے چار لوگوں کی پروا نہ کرتے پتھریلی روش پر بھاگتی گئی۔

جیپ پر سوار ہوتا موئی ساکت ہو گیا تھا۔ من جیت آگے ہوا تو موئی نے اسے پیچھے کرتے اپنے قدم جیپ سے اتارے۔ ہاتھ سے ملازموں کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تیز سانسوں سے اس کی شال بنالی اس کا سویٹر دیکھنے لگی۔

"کچھ ہوا تو نہیں؟ ٹھیک ہو ناں؟" وہ نڈھال سی جیپ کے ساتھ لگی تو اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ وہ بپھر کے اس پر جھپٹی۔

"کیوں آئے رام پور میں رہ لیے ہوتے ادھر ہی کہیں۔ اب ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" آواز میں آنسو بھر گئے۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔

"میں نے چنگا خواب نہیں دیکھا موئی۔"

"میں ٹھیک ہوں جت اچنگا بھلا۔ دیکھ مجھے۔"

"چنگی گل اے۔ پر آج کہیں نہ جانیں۔" وہ تھکا تھکا سا کہتی مڑی۔

"اچھا رک ناں۔ اتنی مشکل سے آئی ہے۔ اندر چلتے ہیں۔ میری آرام گاہ میں۔" وہ پیار سے بولتا بولتا شرارت سے کہنے لگا۔

"میں تے آرام گاہ تک وی چلی جاؤں پر تجھ سے تو باغ تک نہ آیا گیا۔ ذرا کم ڈرا کر کاملوؤں سے۔" وہ دوپٹا درست کرتی واپس مڑ گئی۔

"معافی مل سکتی ہے؟ مصروفیت رہی کچھ تو۔"

وہ خاموشی سے واپس لوٹ آئی۔

☆☆☆

"میں نے دیکھا اس کے سینے پر شگاف ہے اور میں دونوں ہاتھ اس شگاف پر رکھے چیخ رہی ہوں۔ میرے ہاتھ اس کے خون سے بھر چکے ہیں اور...... میں سترہ سال بعد ڈری ہوں نیناں۔ یہ لوگ موسیٰ کو ماردیں گے۔ میرا دل یہ بات دہرائے جاتا ہے۔ مجھے اک بار بھی یہ نہیں لگ سکا کہ ہم دونوں کبھی ایک ہوسکتے ہیں۔"

وہ مسہری پر لیٹی ہولے ہولے نیناں سے کہتی رہی۔

"بے جی! پوچھیں اس خائن سے کہ چٹھوں کی حویلی میں کیسے گئی یہ۔ ہمیں بے غیرت بنادیا ہے اس نے پورے رام پور وچ۔ لوگ تھو تھو کررہے ہیں۔" شیر دل کی دھاڑ پر دونوں کمرے سے نکلیں۔ ہر کوئی خون خوار ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تو ہر دم اس دے نال رہتی ہوں۔ یہ بھلا کیوں جائے گی دشمنوں کی گلی" نیناں نے کانپتے لہجے میں کہا۔

"ثبوت لا، پھر بولیں۔" اس نے شیر دل کو للکارا۔

"ثبوت میں اس کی لاش ہی دوں گا اب تجھے میں۔" وہ سر جھٹک کے مڑ گئی پر اس شام۔

"موسیٰ کامران چٹھہ کی جیپ تے حملہ ہو یا اے بے جی! دو چار مرے بھی ہیں۔ ابھی پتا نہیں چلا کہ موسیٰ زندہ ہے کہ نہیں۔"

میراثن نے ویڑے سے دوڑ کے آ کے سب کو بتایا تو سب ساکن ہوگئے۔

"شیر دل نہیں رکا پھر۔" بے جی سینہ تھام کے وہیں بیٹھ گئیں۔ اور جنت کا دل بھی وہیں رک گیا۔ میاں جی کی دھاڑیں شروع ہوگئیں۔ مردوں کو یہاں وہاں چھپنے کا حکم دیا۔ مگر رات تک گھر کے چھ لڑکے گرفتار ہوچکے تھے۔

اگلے دن رام پور میں قہر مچا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ میاں جی مٹھیل کے بیٹھے موت کی چاپ سنتے۔

"پولیس کو گودام کی خبر کیسے ہوئی؟ میرے مارے یاراں دوستاں دے گھر کا پتا کیسے چلا۔ منڈے جہاں جہاں چھپے، پولیس وہاں پہنچ گئی۔" جنت نے اپنا وجود گھسیٹا اور اندھیرے کمرے میں دیوار کے ساتھ خود کو چپکا لیا۔ اللہ دتا بھاگتا آیا۔

"چوہدری صاحب! ہم برباد ہوگئے۔ شیر دل صاب کی گاڑی کھائی میں گرادی ظالموں نے۔ کوئی نہیں بچا۔ چاروں ویر (بھائی) مارے گئے اپنے۔"

خواتین کی چیخیں سنتی جنت پاگل ہوئی جاتی۔ ان کی حویلی مردوں سے خالی ہوگئی اور جنت کو یاد آتا۔

"یہ کالو بھاگتے کدھر کو ہیں ہر قتل کرانے کے بعد؟"

وہ سرسری لہجے میں پوچھتا اور جنت اندھوں جیسا اسے حرف حرف سب کچھ بتاتی۔ ہر گودام، ہر تجوری، ہر دوستی۔

"ہم نے نہیں کرایا اس کی جیپ پر حملہ، ہمارے مرد تو آدھے گھر اور آدھے فصل کٹانے گئے تھے۔" میاں جی کسی پنچایتی کو بتاتے خواتین کے بین اونچا ہوئے جاتے۔

پھر اسٹور کا دروازہ دھاڑ سے کھلا اور شیریں بکھرے بالوں اور سوجے منہ سے اس پر جھپٹی۔

"باہر نکل غدار۔ ناگن! یہاں کیوں چھپی ہے۔" وہ اسے گھسیٹتی باہر نکال لائی۔ اور تائی، چچی اس پر پل پڑیں۔

"شیر دل کہتا رہا کہ یہ جاتی ہے ان کافروں کے محل گھومنے۔ ہم نہ مانے۔ یہ کھا گئی ہمارے پتروں کو۔ جانے اور کیا کیا کرچکی ہے یہ اس چٹھے دے نال۔ نسل بڑھانے کے خواب دیکھنے لگی تھی اس دے نال"

"میں نے کچھ نہیں کیا بے جی! میں سچ بولتی ہوں۔" وہ مسلسل کہتی رہی۔ خدیجہ منہ میں دوپٹا گھسائے سسکیاں روک کے اپنے لخت جگر کو سب کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھتیں۔

"یہ تھی ہماری محبت اور مان کی بھرپائی۔ کسی کو

ویر (بھائی) نہ جانا تو نے۔ سب کو اس چشمے کے ہاتھوں مروادیا تو نے ناگن۔ حویلی میں جھاڑو پھروا دی تو نے۔ ہائے میرا شیر دل۔ میرا باسط۔ ظالمو! ہمیں لاشیں ہی دے دو۔ کافر ہم اتنے ظالم نہ تھے۔ آٹھ پتر ایک ساتھ لے لیے ہمارے۔"

جنت کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ نیناں اپنے درد بھلائے اس پر پانی کے چھینٹے مارتی۔ چہرہ تھپتھپاتی۔ وہ گویا مر گئی تھی۔ سب کے لیے۔

کسی نے اسے دوبارہ دیکھا تک نہیں۔ حتیٰ کہ سگی ماں نے بھی نہیں۔ وہ پہروں مردہ سی صحن کے اس حصے میں پڑی پھر وہ اٹھی۔ اور ننگے پاؤں دہلیز عبور کر گئی۔ نیناں چیختی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی پر بڑی تائی نے اسے بالوں سے کھینچ کے واپس اندر کرلیا۔

"جائے۔ کود جائے کسی نہر میں۔ بدبخت، سیاہ دل۔ اسے پانی نصیب نہ ہو مرتے وقت۔ کفن نہ ملے، قبر کو زمین نہ ملے......" وہ تکتی چلی گئی۔ وہی پھاٹک، وہی پتھریلی روش اور لکڑی کے فرش والے برآمدے۔ اس نے ہلکی دھوپ میں کرسی پہ نیم دراز اس جنت جیسی لاش کو دیکھا۔

"میں تجھے مرد سمجھتی تھی موسیٰ کامران! تو تو انسان بھی نہ نکلا۔"

اس نے پھل کاٹنے کو رکھی چھری کو پلیٹ سے اٹھایا اور موسیٰ کے سینے میں گھسا دیا۔ وہ بری طرح کراہ کے پیچھے ہٹا۔ وہ پے در پے وار کرتی گئی۔

"تجھے مل گئے سب رستے، سب ٹھکانے تو تو باغ میں جانے کا رستہ بھول گیا اور میں پاگل......"

ملازم بھاگ کے جمع ہوئے۔ کسی نے اس کو بازوؤں سے جکڑا۔ کوئی موسیٰ پہ جھکا۔

"کاہلو بڑے کافر ہیں مانا۔ مگر وہ تجھ سے چھوٹے کافر نکلے موسیٰ! تو نے تو اپنی بیوی کو بھی نہ چھوڑا۔ تو نے اپنی بیوی کے ہاتھوں اس کے بھائی مروائے...... پھر اس کا شوہر۔ جا میرے دل نے تجھے طلاق دی۔ مرنے سے پہلے مجھے طلاق دے کر مرنا۔ میرا نام اپنے ساتھ لے کر مرنا بھی حرام ہے تجھ پہ۔"

اسے گھر سے باہر پھینک دیا گیا۔ رام پور کا آسمان خون رنگ ہوگیا۔ وہ کھیتوں میں ڈگمگا کے چلتی۔ پگڈنڈیوں سے گرتی۔ اور اسے یاد آتا۔

"سترہ سال پہلے، اس شام جب وہ آٹھ سال کی تھی۔ صلح کے نام پر مکاری کرنے کے لیے جنت فاطمہ کو ضمانت کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ جنت کو موسیٰ سے باندھ دیا گیا تھا۔

"دشمنی کو رشتہ داری میں بدل دیتے ہیں۔ پھر کاہے کی دشمنی۔"

اس بن باپ کی بچی کا نکاح دشمنوں کے سات سالہ بچے سے ہوا تھا۔ مگر اگلے دن اس بچے کے باپ کو قتل کروادیا گیا تو ماں بچے کو لے کہیں گم ہوگئی اور یوں یہ رشتہ۔ یہ معاہدہ بھی۔

وہ لٹی پٹی پھاٹک سے اندر آئی تھی اور ہر کسی نے اس کا خون آلود چہرہ، لباس اور ہاتھ دیکھے۔ وہ صحن کے بیچوں بیچ بیٹھی تھی۔

"مار دیا ہے اسے۔ اپنے ہاتھوں...... اپنے ہاتھوں سے۔" چھری اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور شور سے سب جاگ اٹھے جیسے۔ نیناں اس تک بھاگتی آئی۔ جنت اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیوانوں کی طرح دیکھتی رہی۔

"اس کے سینے میں شگاف ڈال دیا اور میرے ہاتھ...... وہ میں تھی نیناں۔ میں نے موسیٰ...... اپنے موسیٰ کو مار ڈالا۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کے روتی رہی اور پھر وہ ایک اندھیرے میں گم ہوگئی۔

☆☆☆

"شیر دل اور باسط لوگوں کو اغوا کیا تھا اس نے۔ زندہ ہیں وہ۔" خدیجہ نے چوتھے دن اپنی لاش نما بچی کو ہولے سے بتایا۔ وہ چت لیٹی رہی۔ ساکن، جامد۔

"بچ گیا ہے وہ۔ پنچایت لگے گی آج۔" مزید بتایا۔ وہ کروٹ بدل گئی۔

رات کو میاں جی پنچایت سے لوٹے۔

Scanned with CamScanner

"دو جوڑے باندھ دو اس کے۔ چیتھوں کی جیپ آرہی ہے۔ اسے جانا ہے اس حویلی۔" وہ کمرے کی دہلیز میں کھڑے ہو کر خدیجہ کو حکم سنا گئے۔

"مجھے چارہ نہ بنائیں میاں جی! آپ کے بیٹوں کے لیے میں اسے مار چکی۔ اب مجھے پھر سے قربان نہ کریں۔ کسی جائے او، وہ میرے ساتھ کیا کرے گا۔"

تائی، چچی اس کے کپڑے باندھنے لگیں اور بازو سے گھسیٹ کے باہر لے آئیں۔

"مزید نہیں بچانے تم لوگوں کے بیٹے مجھے۔ تم لوگوں کے بیٹے بچانے کے لیے میرا باپ مرا، انہیں بچانے کو نو سالہ جنت کو قربان کر دیا گیا۔ انہیں بیٹوں کو بچانے کے لیے میں نے اسے چھریوں سے چھید ڈالا۔ اب انہیں چھڑانے کو مجھے اس دشمن کے ہاتھوں فروخت کر دو تاکہ کل کو یہی بیٹے مجھے موقع ملنے پہ، بیوہ کر دیں۔"

وہ بے بسی سے کہتی رہی مگر میاں جی کا لرزتا ہاتھ اس کے سر پہ ٹھہر گیا تو وہ ڈھے سی گئی۔

☆☆☆

کتنے دن گزر گئے تھے۔ وہ اس کوٹھڑی کی سلاخ دار کھڑکی سے کبھی کبھی روشنی دیکھ لیتی ورنہ سکڑی سمٹی کوٹھڑی کے ایک کونے میں بیٹھی رہتی۔ کئی پہروں بعد کچھ کھا لیتی اور ملازمہ باسی ہوتے کھانے والے برتن تاسف سے اٹھا کے لے جاتی۔

پھر اس نے کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے زمانوں بعد موسیٰ کامران کو کہیں جاتے دیکھا۔ وہ آہستہ قدم اٹھاتا اور اس کا بازو گلے میں پٹی ڈال کے جمایا گیا تھا۔ پھر وہ کھڑکی کی ہو رہی۔

وہ اسے آتے دیکھتی۔ پھر کہیں جانے کا انتظار کرنے لگتی۔ وہ گزر جاتا تو اٹھ جاتی، کچھ دیر بعد پھر واپس بیٹھی اس کے لوٹنے کی منتظر ہوتی۔

بہت دنوں بعد وہ اچانک کھڑکی کے باہر آن کھڑا ہوا تھا۔

"دماغ ٹھکانے پہ لگتا ہے کچھ۔ کھول دو کوٹھڑی۔" وہ کسی ملازم سے بولا۔

"موسیٰ! یہ خطرناک ہے۔ ابھی پہلے زخم نہیں بھرتے ہیں تیرے۔ یہ لڑکی سر پھری ہے۔" ہاشم نے کہا۔

اس نے کچھ نہ سنا کوٹھڑی کا دروازہ کھل گیا۔ پر آنے والے بہت سے دنوں تک وہ باہر نہ نکلی۔

اس دن دھوپ ذرا تیز ہوئی تو وہ کوٹھڑی کی دہلیز پر آن بیٹھی۔ سامنے حویلی کے برآمدے، منقش دروازے، بیل بوٹے اور روش دیکھتی رہی۔

وہ روز یہ منظر دیکھنے لگی۔ پھر کچھ اور منظر بھی۔ جیسا کہ منشی برکت علی کی گھر والی رجو۔ جو حویلی کی ملازماؤں پہ حکم چلاتی۔ آنچل بھر بھر کے نعمتیں حویلی سے منسلک اپنی کوٹھڑی میں لے جاتی۔ جنت کی کوٹھڑی کے ساتھ گودام تھا جہاں ہر قسم کا اناج ذخیرہ کیا جاتا۔

موسیٰ کے جانے کے بعد رجو اپنے شوہر کے ہمراہ آتی اور برکت علی اناج کی بوریاں کندھے پہ ڈالے باہر جاتا۔ ایک دن وہ پوچھنے لگی۔

"یہ گندم ہر دوسرے دن کہاں جاتی ہے رجو؟"

رجو کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"حویلی کا کاروبار ہم چلاتے ہیں۔ ہم ہی جانیں۔ کسی کو کیا مطلب۔"

وہ جانے کس زعم میں بولی۔ مگر جنت کے اندر کی چوہدرائن ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

"واپس رکھ بوری برکت علی۔ حویلی کا کاروبار جو مرضی چلائے۔ مالک کیسے بن جانا اس نے۔ اپنی زبان کو واپس اپنے منہ میں رکھ رجو! اور آگے لگ میرے۔ میں تجھے بتاتی ہوں کسی کو کیا مطلب ہے اس سے۔"

دونوں میاں بیوی کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ اور اس دن جنت فاطمہ گردن اکڑا کے حویلی کے اندر چلی گئی۔ کلثوم ولایت کے ساتھ حویلی آتے جاتے اسے ہر ہر رستے اور ہر ہر شے کا ٹھکانا معلوم تھا۔

وہ ہر شے دیکھتی گئی۔ حساب لگاتی اور ملازماؤں کی پیشیاں لگاتی گئی۔ اس کی آواز کی کڑکڑاہٹ نے ہر ایک کو بتادیا کہ اب راج دھانی پہ کوئی چوہدرائن آن بیٹھی ہے۔

من جیت کی بیوی سکھ ونت کور نے ہر ایک کی ہیرا پھیری اور حویلی کی ابتری کی ہر بات اسے بتاڈالی۔

موسیٰ واپس آیا تو ملازمائیں دبکی ہوئی حویلی چمکانے میں لگی تھیں۔ گودام سے نکلتی جنت نے اس کی حیران نگاہوں سے نظریں چرائیں اور دونوں نے راستے بدل لیے۔

☆☆☆

پھر وہ لوٹتا تو دیکھتا کہ گملوں کو نیا روغن ہوا ہے۔

کبھی دیکھتا کہ پانی کے گھڑے سوکھے نہیں پڑے بلکہ نم ریت میں دھنسے پانی سے بھرے ہیں۔

پھر دیکھتا کہ اپلوں کو تندور میں لگا کر مکھن اور نمک میں گندھے آٹے سے روٹی لگاتی ہے جسے وہ رغبت سے کھالیتا ہے۔

پھر دیکھتا کہ شفتی ماشی السی کے تیل میں لہسن جلائے اس کے کندھے کی مالش کرتا ہے۔

میٹھے میں حلوے بنتے۔ وقت پہ بادام والا دودھ لیے سکھ ونت حاضر ہوجاتی۔

اگر وہ یوں منارہی تھی تو وہ محسوس کررہا تھا۔

☆☆☆

اس شام وہ دھند شدید ہونے سے پہلے حویلی لوٹ آیا تھا اور اچار کے لیے لیموں کاٹتی، برآمدے کے تخت پہ چوہدرائن بنی بیٹھی جنت نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ سکھ ونت اور نظیراں یکایک اٹھ کے تالیوں سے تال ملاتی گدا ڈالنے لگیں۔

ساڈے نی ویڑے وچ بوٹا کِکّی دا
ماہی نیں نے ساتوں کج نہیں چاہی دا
ماہی تے تک دا ای نہیں
"(ہمارے صحن میں کِکّی کا پودا ہے۔ ماہی کے سوا ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ مگر ماہی تو دیکھتا بھی نہیں)"

موسیٰ نے آن کو دیکھتے، جنت کی مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔ عجب رونق لگی تھی حویلی میں۔ رات تک آوازیں آتی رہتیں۔ وہ ہر ہر آہٹ سنتا رہتا۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکلا تھا۔ زمینوں پہ کچھ کام تھا اور وہ اٹھا ہی دیر سے تھا۔ برآمدے میں اپنے تخت کے کنارے پہ پاؤں لٹکائے بیٹھی جنت لانبے بال کھولے سکھ ونت سے تیل لگوا رہی تھی۔ وہ قریب سے گزرا تو جنت نے اپنا پاؤں آگے کردیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ تلملا کے درشتی سے پلٹا۔ وہ آنکھیں موندے گنگنائی۔

بے ماہی مینوں ویکھ لے
ناں لادیواں زمین اور دے ساری
نی بے ماہی مینوں ویکھ لے
(اگر ماہی مجھے دیکھ لے۔ میں اپنی ساری جائیداد اس کے نام لگادوں)

وہ الٹے قدموں چلا اور اس کے بالوں اور پازیب کو مدت بعد دیکھا۔ دل۔ میں سوئی ٹوٹ گئی ہو جیسے۔ وہ جلدی سے مڑ گیا۔

☆☆☆

وہ ملازماؤں کے ساتھ صحن میں افراتفری مچائے بیٹھی تھی۔ ساگ، پالک اور ہرا لہسن کاٹا جارہا تھا۔ کچھ دور بیٹھا موسیٰ حساب کتاب کررہا تھا۔ جنت نے گھبرائی ہوئی کوثر کو پھاٹک سے اندر آتے دیکھا جس کے ہاتھ میں چینی کی رکابی تھی۔

"جنت باجی! یہ بے جی نے تھاڈے واسطے دال چنا دا حلوہ بھیجا ہے۔"

جنت کا چہرہ سپاٹ رہا۔ سکھ ونت کو اشارہ کیا۔

"حلوہ رکھو اندر۔ کوئی پانی شانی پلاؤ اس نوں۔"

خود ہاتھ دھونے اٹھ گئی۔ واپس آئی تو موسیٰ کو حلوے کا چمچ منہ میں رکھتے دیکھا۔ دیوانہ وار بھاگتی اس تک آئی اور ہاتھ مار کے چمچ گرادیا۔

"کیوں کھایا؟ نہیں کھانا تھا۔" پلیٹ اٹھا کے پھینک دی۔

"کیا پتا زہر ہو۔ کیا پتا کیا مقصد ہے دشمنوں کا۔ کیوں کھایا۔ کیا ہو رہا ہے۔ دل تو نہیں گھبرا رہا؟ متلی ہو رہی ہے؟"
موسیٰ ساکت اسے خبطیوں سی باتیں کرتا دیکھتا رہا۔
"اگر تمہارے وار سے بچ گیا تھا تو ان کے حلوے سے میرا کیا ہو پائے گا۔ زیادہ بیوی نہ بن۔ نہیں مرتا اک بچے سے میں۔"
وہ درشتی سے کہہ کے چلا گیا۔ وہ اٹھی۔ اور پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ کالوؤں کی حویلی میں مرد کھانا کھا رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان جا کھڑی ہوئی۔
"وہ جینا چاہتا ہے اپنی ماں کے لیے۔ اپنے باپ دادا کے نام کے لیے۔ اسے مارنا بھول جاؤ۔ کیونکہ اب میں ایسا ہونے نہ دوں گی۔ اگر اسے آنچ بھی آئی ناں تے میں سب کچھ پھونک ڈالوں گی۔ اگر میں اس کے سینے میں چھری اتار سکتی ہوں ناں تو مطلب سب کو لہولہان کر سکتی ہوں۔ ہم دشمنی بھول جانا چاہتے ہیں۔ تم لوگ بھی بھول جاؤ کہ نالے پار کوئی دشمن رہتا ہے۔ اور اگر واقعی حلوہ بے جی نے بھیجا تھا تو شکریہ۔"
وہ پلٹ آئی۔ سب کو دنگ چھوڑ کے۔ پھر مردوں نے گالیاں بکنا شروع کیں اور چچا کی چھوٹی بہو اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ٹھیک کہتی ہے وہ۔ آج تک کیا اچھا ہوا ہے رام پور وچ؟ اب ہم سے نہیں لگتیں روٹیاں رائفلوں کی رکھوالی والوں کے لیے۔ نہ ہی مرنے کے لیے بیٹے پیدا کیے جاتے ہیں۔ نہ تم لوگوں کے آرے تیز کیے جاتے ہیں اور نہ ہی سلائی کی جاتی ہیں سفید اوڑھنیاں۔ اب بس کر دو۔"
ہاں کچھ بدل گیا تھا۔ کچھ بدل رہا تھا۔
اس شام سکھ ونت کے بجائے وہ بادام والا دودھ لیے اس کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ سویا ہوا تھا۔ جنت نے چھوٹی میز پہ دودھ رکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے سینے سے کپڑا ہٹا کے دیکھنا چاہا۔ موسیٰ نے ہاتھ مار کے اس کا ہاتھ ہٹایا۔
"کہا ناں۔ بیوی نہ بن۔" وہ غصے میں پلٹ آئی۔

☆☆☆

وہ گودام میں جا رہی تھی تو دیکھا موسیٰ کے پاس سے کوئی اٹھ کے باہر چلا گیا۔ وہ گزرنے لگی تو موسیٰ بولا۔
"سخاوت چچا کہہ رہے تھے کہ انہوں نے تجھے دیکھ رکھا ہے بچپن میں۔" اٹھ کے گئے شخص کا بتایا۔
"ہاں۔ میں بھی جانتی ہوں انہیں۔ ساری زندگی ہمارے گھر سے فون کرتے رہے ہیں اپنے رشتے داروں کو۔ اب اللہ نے سے لو لگائی ہے۔ کسی زمانے میں بہت بڑے ڈکیت تھے محترم۔ خیر۔" وہ آگے بڑھ گئی۔
"نگران کے گھر تو اپنا ٹیلی فون ہوا کرتا تھا۔" وہ گودام تک پیچھے چلا آیا۔
"ہم سے تو کہتے تھے خراب ہے ٹیلی فون۔" وہ پرسوچ سا پلٹ آیا۔ شام کو وہ ماموں کے بیٹوں سے وہ فون ٹیپ پوچھ رہا تھا جو ماموں نے نکلوائی تھی، کالوؤں کے فون کی۔
اور وہ معاملہ جو پچھلے بائیس سال سے نہ سلجھا تھا۔ بائیس گھنٹوں میں سلجھ گیا تھا۔
موسیٰ نے اپنے دوست سے وہ ٹیپ اور سخاوت کی ریکارڈ آواز کی فریکوئنسی فرانزک کروائی تھی اور شک درست نکلا تھا۔ ڈکیتی کالوؤں نے نہیں، سخاوت وڑائچ نے کروائی تھی۔
اک بار پھر بڑی پنچایت لگی تھی اور اس بار سب نے شرمندگی سے ایک دوسرے سے نظر بھی نہیں ملائی تھی۔
سخاوت وڑائچ ڈکیتی مان گیا تھا۔ یکایک وہ سب غیور سے بے وقوف اور اندھے ثابت ہو گئے تھے۔ رام پور میں اس رات سب کی سماعتیں حیرانی لیے ہوئی تھیں۔

☆☆☆

جنوری کی وہ یخ رات تھی۔ بارش کی جل تھل نے دلوں پہ جمے کہر کو دھو ڈالا تھا۔

تھکا ماندہ موسیٰ کامران جیپ میں بیٹھا اپنی سنسان حویلی کو دیکھتا۔ اگر تایا زندہ ہوتے؟ اگر ابا زندہ ہوتے؟ یہ گھر تو جوانوں سے بھرا ہوتا۔ کہیں کسی کے بچے ہوتے۔ کسی کی نئی نویلی شادی ہوئی ہوتی۔ کوئی لڑکی میکے آئی ہوتی اور کوئی روٹھ کے آئی بیٹھی ہوتی۔ مگر حویلی زندہ ہوتی، دشمنی نے اتنے لوگ مار دیے۔ اتنا سکوت پیدا کر دیا زندگی میں۔

پھر وہ شدید بارش میں حویلی جانے کے بجائے جنت کی کوٹھڑی تک آیا تھا۔ دیے کی ناکافی روشنی اور بے شمار ٹوٹے پھوٹے سامان کے ساتھ اس کی چارپائی ایک دیوار سے لگی تھی۔ آہٹ پہ جنت نے سر اٹھا کے دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔

جنت کی پائنتی پہ وہ گردن جھکائے دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ جنت نے خاموشی سے موسیٰ کے گھٹنوں پہ لحاف برابر کیا۔ لحاف پہ سر جھکائے وہ پھوٹ پھوٹ کے بچوں کی طرح رونے لگا۔

"میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا کہ میں نے اصل دشمن کو ختم کر دیا۔ کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی بچا ہی نہیں۔"

جنت نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔

"میں چھٹیوں میں ماموں کے گھر جانے والا تھا اور ابا مجھے وہاں چھوڑنے جا رہے تھے۔ کچہری میں چند دستخط کرنے ہی تو رکے تھے۔

میں نے گاڑی کے شیشے سے انہیں لہولہان زمین پہ گرے دیکھا تھا۔ وہ زندہ تھے۔ مجھے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا کہہ رہے تھے۔ میں بہت چیخ رہا تھا اور اماں کی چادر ان کے سر سے اتر کے کہیں یہاں وہاں رل رہی تھی۔

پھر میں نے کبھی ابا کو نہیں دیکھا۔ اپنی حویلی کو نہیں دیکھا۔ زندگی کے عیش نہیں دیکھے۔ بس پابندیاں، خوف اور احتیاط دیکھی۔

مگر دادی جان مجھے خط لکھتی رہیں، بتاتی رہیں کہ اتنی فصل ہوئی ہے۔ اتنے کھیت، اتنی جائیداد ہو گئی ہے۔ پھر بتانے لگیں کہ ایک سہیلی ہے ان کی۔ جو "ہماری" ہے۔ تم سے ملا تو بھول گیا سب۔ مگر پھر مجھ پر حملہ ہوا۔ ہاشم کو گولی لگی۔ دو گارڈ مر گئے تو مجھے تم بھی بھول گئیں۔ بس اتنا یاد رہا کہ کالوؤں کو گھٹنوں کے بل لانا ہے اپنے سامنے۔ تب ہی مجھے اپنے نکاح کا پتا چلا۔ مگر تم نے مجھے خود سے دور پھینک دیا۔ وہ بھی ٹکڑوں میں کاٹ کر۔

میں جانتا تھا کہ اب اس حویلی میں رہنا ٹھیک نہیں۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔ اور تم نے اس حویلی کو گھر بنا دیا۔ مجھے ہر شام گھر آنے کی جلدی رہتی ہے۔ مگر کہیں نہ کہیں دل دکھتا ہے کہ تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں نے استعمال کیا ہے تمہیں۔ کیسے سوچا یہ؟ مجھے تیرے ساتھ گھر بنانا ہے جنت۔ سات بچے پیدا کرنے ہیں کہ جب اس حویلی کا بٹوارہ ہو تو کسی کو اتنا حصہ نہ ملے کہ جہاں وہ تنہائی ڈھونڈ لے۔"

جنت اس کے سینے کا نشان دیکھتی پہلی بار روئی۔

"جنت مر جاتی موسیٰ! اگر موسیٰ کو کچھ ہو جاتا۔ معاف کر دو۔ میں اپنی دلیری کا کچھ کر نہیں سکتی۔"

"وہ کیا کہتی ہے تو......" وہ یاد دلاتا۔ جنت ہنستی اور گنگناتی۔

"بولی ہے۔" یہ ایک......

نی بے ماہی مینوں نہ تکے

اگ لا دیواں میں پنڈ نوں سارے

بے ماہی مینوں نہ تکے

(اگر ماہی مجھے نہ دیکھے۔ میں سارے گاؤں کو آگ لگا دوں)

"مار دھاڑ مجھیں ختم کرنی جنت فاطمہ نے۔" شرارت سے کہتا۔

"ہاں تو ماہی بھی دیکھ ہی لے ناں اب۔"

دونوں بے ساختہ ہنستے تھے۔ پورب سے پچھم تک میں رہتی محبت کا سینہ ٹھنڈا ہوا تھا اس ہنسی سے۔

☆☆

خوابوں کا محل

اس کے خوابوں کے محل کی بنیاد تو عرصے سے ڈلی ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر اس روز شروع ہوئی جب اس کی منگنی ہوئی۔ سولہ سال کی شوخ صحت مند لڑکی تھی ارشاد۔

اس عمر میں خود ہی اپنی اداؤں سے محبت ہوتی ہے اور اپنی ہی صورت کی بلائیں لینے کا دل کرتا ہے۔ اس کا بھی چاہتا تھا۔ نیا جوڑا پہنتی تھی تو کتنی ہی دیر آئینے کے سامنے دوپٹا لہراتی رہتی۔ مشکل سے دو جماعتیں پڑھی تھیں۔ کام وہ گھروں کی صفائی اور برتن مانجھنے کا کرتی تھی۔ دل کی اچھی تھی خود سے محبت دوسروں کا احترام کرتی تھی اور اسے لگتا تھا دنیا بھی اس جیسی ہے۔

☆☆☆

جب گاؤں کے زمین دار گھرانے سے اس کا رشتہ آیا تو اس کی ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔ سب ملنے والے پہلے چپ ہو جاتے پھر کوئی کہتا۔

"اتنی حسین جو ہے اس لیے اتنا اچھا رشتہ آیا۔"

کوئی کہتا۔ "کم عمر ہے۔ امیر لوگ چھوٹی بہو لاتے ہیں کہ دب کر رہے۔"

کوئی کہتا "سال پہلے ارشاد گاؤں گئی تھی شادی میں لڑکے کی ماں نے دیکھا تھا۔ کیا خبر لڑکے کی بھی نظر پڑ گئی ہو۔ ماں بیٹا، کوئی تو ضد لگا کر بیٹھا ہوگا کہ ارشاد ہی گھر کی بہو بنے گی۔"

جو بھی تھا ہر دلیل سے ارشاد کا مان بڑھتا تھا۔

وہ دل گردے، پھیپھڑے، دماغ سب اس ہی رشتے سے جوڑ بیٹھی۔

لڑکے والوں نے منگنی کے لیے آنا تھا۔ ارشاد کی اماں کو اپنے اسٹینڈرڈ کی پڑ گئی۔

"اتنے کھاتے پیتے لوگ ہیں وہ ان کو سوکھے چائے بسکٹ کھلاتے۔ اچھے لگیں گے؟ برادری تھو تھو کرے گی۔" ماں پیڑھی پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ باپ نے سر پکڑا تو دادی کا دل اپنی اولاد کے لیے دکھ گیا۔

"ایسے کچے کنوارے رشتوں پر یوں دھوم دھام نہیں جچتی۔ ابھی تو منگنی ہے۔ جس کی نہ حیثیت نہ اوقات۔ جب نکاح آئیں گے پھر وہ دھوم دھڑکا کریں گے کہ برادری کو بھی معلوم ہوگا۔" دادی نے ناپ تول کر کہا۔

ارشاد کی دادی تھیں مگر ماں کی ساس تھیں۔ انھیں تو مرچیں ہی لگنی تھیں۔

"سوکھے منہ بھیج دیں گے تو کیا مان رہے گا میری بچی کا۔ انہیں لگنا چاہیے کہ ہم پلہ لوگوں میں رشتہ ہوا ہے۔ ویسے بھی آپ کے رشتے دار ہیں جو عید کے عید شکل دکھاتے ہیں۔ میرا خاندان تو ملنے کا شوقین ہے۔ نہ بلایا تو برا مان جائیں گے۔" اماں نے جتلایا۔

"کھاتے پیتے ہیں مگر ہیں تو مزدور لوگ، بس یہ ٹھاٹھ ہے کہ اپنی زمین پر کاشت کرتے ہیں۔" ابا نے سمجھایا۔

"کیوں خواہ مخواہ لوگوں کی نظروں میں آنا۔ پیسہ خرچنا ہی ہے تو لڑکے کی انگوٹھی اور ساس کے جوڑے پر خرچ لینا۔ انگریزوں سے سیکھو۔ منگنی تو لڑکا لڑکی آپس میں کر کے فارغ ہوتے ہیں۔ شادی پر خرچا کرتے ہیں۔" دادی پھر بولے بنا نہیں رہ سکیں۔

"یہ ہی رشتہ آپ کی نواسی کے لیے آتا تو میں دیکھتی یہ سادگی کے پرچار کیسے ہوتے۔ پہلی بیٹی کی شان سے ڈولی اٹھے گی تو ہی دوسروں کے لیے اچھے پیام آئیں گے۔" اماں نے منہ بسورا اور ضد پکڑ لی۔

ابا نے بیوی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور دادی چپ ہو گئیں۔

☆☆☆

ارشاد میرے گھر صفائی کا کام کرتی تھی۔ مجھ سمیت کئی باجیوں سے پیشگی تنخواہ لی اور بڑی دھوم دھام سے منگنی ہوئی پورا خاندان جمع ہوا۔ چار دیگیں چڑھائی گئیں۔ لڑکا تو آیا نہیں تھا۔ ارشاد ساس پر ہی فریفتہ ہو گئی۔ گاؤں کی درزن سے سوٹ سلوایا تھا۔ قمیض کے سامنے کی کڑھائی بار بار ڈھلک رہی تھی۔

"میرا ناپ کچھ ٹیڑھا ہے۔ کسی درزن کے ہاتھ ہی نہیں چڑھتا۔" وہ دانت دکھاتے ہوئے بار بار

وضاحت دے رہی تھیں۔

جن جن کو مدعو کیا تھا۔ ان سب کو تو وہ تھی کہ لائے کیا ہیں؟

"لڑکی کا جوڑا میک اپ اور انگوٹھی تو لائے ہی ہیں۔ ساتھ گھر کا مکھن، اپنے بوٹے کے آم، اپنے جانوروں کا خالص دودھ بھی لائے ہیں۔ نان جیسی موٹی ملائی اتری ہے۔" اماں بار بار تفصیل بتا کر ذرا بھی نہیں تھکی تھی۔

"بھائی کو ہوٹل میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ ایک دفعہ شہر جا کر سیکھ کر بھی آئے تھے مگر شہر میں دل ہی نہیں لگا۔ ہماری زمین کے پاس ہمارے ہی مکان ہیں۔ کوئی شور شرابا نہیں۔ ہر طرف ہریالی ہے۔" نند نے مزید تفصیل سے بتایا۔

اس کے سسرال میں سب ہی پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ ارشاد مزید مرعوب ہوتی گئی۔ دعوت ختم ہوئی تو اس کی کزنوں نے پکڑ پکڑ کر اس کا جوڑا اور انگوٹھی دیکھی۔ کتنی خوب صورت رات تھی دل کرتا تھا کبھی گزرے ہی نہیں۔ ایک ایک لمحہ سرور گزرا۔ کچھ دن بعد اس کے اماں ابا گاؤں جا کر لڑکے کے ہاتھ پر بھی پیسہ رکھ آئے تھے۔ اس نے جن کی تصویر لانے کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ وہ ناکام لوٹے تھے۔ ارشاد تصویر کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ اس لیے خوب غصہ کیا۔ مگر پھر اپنے ہاتھ دیکھے جن پر مہندی دمک رہی تھی۔ وہ پھر سے اس رشتے کی دلفریبی میں کھونے لگی۔ تصویر نہیں آسکی تو کیا ہوا۔ عمر بھر اس کی صورت دیکھوں گی۔ اس نے مسکرا کر سوچا۔

☆☆☆

باتھ روم میں کلینز ڈالنے کے لیے ربڑ کے دستانے ملتے تھے۔ جب سے منگنی ہوئی تھی۔ ارشاد وہ دستانے پہن کر باتھ روم دھوتی تھی اور ویسا ہی نیا جوڑا برتن دھونے کے لیے نکال لیا تھا۔ تاکہ اس کی مہندی سلامت رہے۔

"باجی! آپ کی سلائی مشین فارغ ہے تو میں اپنا جوڑا سی لوں؟" اس نے برتن دھوتے ہوئے فرمائش کی۔

"سلائی آتی ہے تمہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

"میں سوٹ کٹوا کر لائی ہوں۔ سلائی ادھر سیکھ لوں گی۔ جیسے آپ کی خالہ کا فارم ہاؤس ہے۔ میرے سسرال والوں کا بھی ویسے ہی ہے۔ کھیت کے پاس اپنے ہی چار مکان ہیں۔ دور دور تک کچھ نہیں۔ سلائی آئی ہوگی تو اپنے جوڑے خود ہی سیا کروں گی۔"

اس نے ایسے کہا جیسے سب چٹکی بجانے کا کھیل ہو۔

"واہ بھئی تم تو صحیح فارم ہاؤس میں رہوں گی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میری ساس کہہ رہی تھیں ان کا ناپ کسی درزن کے ہاتھ نہیں چڑھتا۔ میں اب جاؤں گی تو خود ان کا جوڑا سیوں گی۔" اس نے اتنی محبت سے کہا۔ میں ہنس پڑی۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ لڑکیاں تو یہ پلاننگ کرتی ہیں کہ شوہر کو کیسے ساس نندوں سے دور کرنا ہے۔ کہاں تم ساس کے نخرے اٹھانے کو ابھی سے تیار ہو۔" میں نے ہانڈی میں چمچ چلایا۔

ارشاد نے برتن دھو کر دستانے سنک میں لٹکائے ہوئے تھے کہ پہلے خشک ہو جائیں۔

"باجی میری ساس تو بہت اچھی ہیں ہو دیکھو میرے لیے سونے کی انگوٹھی اور کنگن لائی ہیں۔" اس نے دستانے اتار کر انگلی دکھائی۔ میں اب کے چونکی سونے کے کنگن تو اب ہم جیسے مڈل کلاس کی دسترس میں نہیں رہے۔ وہ غریب طبقہ کہاں سے لے سکتا تھا۔ میں نے غور کیا انگوٹھی شاید اصلی تھی۔ کنگن نقلی تھا۔ سونے کا نہیں لگ رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس پر سونے کی پالش ــــ تھی۔ مگر میں نے بچی کا دل نہیں دکھانا تھا اس لیے ہامی بھر لی۔

☆☆☆

ارشاد کم عمر تھی مگر بہت ذمہ دار تھی۔ اس نے اپنی تنخواہ میرے پاس جمع کروانا شروع کر دی کہ اپنا

بنوانا ہے۔ سارا دن وہ خوابوں کے محل میں اینٹیں جوڑتی رہتی۔ اس قسم کا لہنگا بنواؤں گی۔ ایسا رنگ، ایسا کام۔

اس کی کوشش ہوتی کہ صفائی نپٹا کر ہانڈی پکا لے۔ ساتھ ہی ذکر کرتی کہ اس کے منگیتر نے ہوٹل کا کام سیکھا ہوا ہے۔ بہت کچھ پکانا آتا ہے۔ رانجھا رانجھا کردی کی مثال بنی۔

ایسے ہی دن گزرتے رہے۔ مہینہ دو بعد بھی یہ چکر لگا آتے۔ کبھی ساس چکر لگا لیتی۔ ساس کے لائے اچار، مکھن، دودھ ساگ اور "سونے کے تحفے" کے قصے میں ہر بار اس کا دل رکھنے کے لیے سختی لڑکے والے قانون جانتے تھے۔ اس لیے لڑکی کی اٹھارہ سال کی عمر ہونے کے بعد تاریخ رکھتی تھی۔ مگر ارشاد بازار کا جب چکر لگا کر آتی اپنا پورا جہیز سوچ آتی۔

"ستاروں والے سوٹ آئے ہیں۔ اپنی نند کو وہ دوں گی۔ اچھے شوخ رنگ کا دوں گی۔ بہت اچھا لگے گا بڑے پھیکے رنگ پہنتی ہے۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ میں الماری بھی ضرور لے کر جاؤں گی۔ اماں نے پیٹی رکھی ہے۔ پر مجھے الماری چاہیے۔"

منگنی کے سال بھر میں جتنی بار فیشن بدلا اتنی بار اس نے نند کو دینے والے سوٹ کا ارادہ بدلا۔

خوابوں کا محل ہر گزرتے پل کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ آخر محنت مشقت سے ان گھر والوں نے منگنی پر آئے۔ خرچے کا ادھار چکایا۔ اب باقی جمع جوڑ کر کے شادی کی تیاری شروع کی ہی تھی کہ خوابوں کا محل بنیادوں سے ہل گیا۔

☆☆☆

وہ دو دن کام پر نہیں آئی تو مجھے شدید غصہ آیا۔ بندہ کھڑے کھڑے آ کر برتن بھی تو کر ہی جاتا ہے۔ اپنی مصروفیت میں مجھے کسی انہونی کا شائبہ تک نہ تھا۔ دو دن بعد اس کی ماں آئی۔ تو ماں کا رو رو کر برا حال تھا۔ ارشاد بھی ساتھ ہی آئی تھی اور کسی غیر مرئی نقطے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ کہنے سننے کو جیسے سب ختم ہو گیا تھا۔

"سارا سی کال کر کے کہتی ہے کہ منگنی ختم کر رہے ہیں۔ لڑکے کی خالہ نے بیٹی کا رشتہ مانا ہے۔ وہیں وٹہ سٹہ کر دیں گے۔" اماں رو رو کر داستان سنا رہی تھی۔

"کہیں اور ہی کرنا تھا تو یہاں منگنی کیوں کی۔" میں بھی ارشاد کی اداس صورت دیکھ کر تلملائی۔

"میں نے بھی یہی کہا تو کہتی کون سا بیاہ لیا تھا۔ منگنی ہی تو کی۔ ایسے کہہ رہی تھی جیسے منگنی کی وقعت ہی کوئی نہ ہو۔ ساری برادری کو معلوم ہے۔" وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

لمحہ بھر کو تو میں چونک گئی۔ منگنی کی وقعت کیا ہے؟"

"ہماری ارشاد کو کوئی بہتر مل جائے گا۔" میں نے تسلی دی۔

"مجھے لگا۔ دو ایک دن میں عقل آ جائے گی۔ معذرت کر لیں گے۔ مگر انہوں نے کسی شہر آنے والے کے ہاتھ سب سامان بھجوا دیا۔

مجھے غصہ آیا۔ یعنی ہمیں ہوٹل کا کرایہ بچانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا ادھر آؤ، کھاؤ پیو اور واپس چلتے بنو۔ میں نے وچولن کو کال ملائی کہ اتنا جو خاطر تواضع پہ ہم خرچا کرتے رہے ہیں وہ واپس کریں۔" اب کے اس نے سر پکڑ کر دہرایا۔

"پھر انہوں نے واپس کیا؟" میں نے یہ پالیسی پہلی بار سنی تھی اور خاص نہ معقول بھی نہیں لگی تھی۔

"کہاں کرنا تھا۔ الٹا ملنے ملانے والوں سے برائیاں کرنے لگے کہ ماں خود غرض ہے۔ بچی تیز طرار خرچا واپس مانگ رہے ہیں۔"

اماں کے تو رونے ختم نہیں ہو رہے تھے ارشاد کی چپ بھی ویسے ہی قائم تھی۔ اس کے خوابوں کا محل کیسے دھڑام کر کے گرا تھا۔ یہ اس کی صورت سے پڑھا جا سکتا تھا۔ غریب رونے بیٹھ جائے تو کھائے کہاں سے وہ ماں بیٹی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور کام کرنے لگیں۔

Scanned with CamScanner

☆☆☆

ارشاد پہلے جتنا بولتی تھی اب اتنا ہی خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا تصور نہیں تھا۔ اس کی تو عمر تھی۔ خواب دیکھنے کی۔ میں آہستہ آہستہ سے سمجھاتی رہی۔

"وہ تمہارے قابل نہیں تھا کوئی بہت اچھا لکھا ہوگا۔ اچھا ہے کچھ عرصے اور ماں باپ کے پاس رہ لو گی۔"

چند دن ہر طرح کی تسلی دی مگر وہ تھی کہ ویسے کی ویسی۔

ہفتہ گزرا تو اس کی ماں بجلی کا بل تھامے آ گئی۔ یہ بل کا ناگ امیر غریب کو یکساں ڈس رہا تھا۔ میں خود پریشان ہو گئی کہ اب ادھار مانگے گی تو میرا کہاں سے پورا ہوگا۔ مگر جب وہ بولی تو ارشاد کی خاموشی بھی ٹوٹ گئی۔

"باجی پچھلی بار سے دگنا بل آ گیا ہے۔ ایک پنکھا چلتا ہے رات کو، پھر بھی اتنا بل، سب رو رہے ہیں۔"

اس نے تمہید باندھی میں کیا بتاتی ہم بھی رو رہے ہیں۔

"باجی! ارشاد جو لہنگے کے پیسے جمع کرواتی رہی ہے وہ پکڑا دیں۔" اماں نے کہا۔

میری نظر فوراً سبزی کاٹتی ارشاد پر گئی۔ وہ ٹرے پٹخ کر اٹھی۔

"میرے لہنگے کے پیسے ہیں۔ میں نہیں دوں گی۔ کل کو جہاں بھی شادی ہوگی، میں لہنگا پہن کر ہی دلہن بنوں گی۔"

اس نے ضد سے کہا۔ میں نے شکر کیا چلو افسردگی کے علاوہ بھی اس کے چہرے پر کچھ آیا۔

"جب ہوگی، تب جوڑ لیں گے۔ اس بار سیدھا نکاح پڑھوا کر رخصت کر دوں گی ابھی تو خرچا چڑھا ہوا ہے۔" اماں نے ارشاد کو ڈپٹ کر میری سمت رخ کیا۔

"ساری برادری جانتی تھی۔ اب باری باری سب افسوس کرنے آ رہے ہیں۔ عصر کے بعد سے آنا شروع کرتے ہیں، عشا تک مجمع لگ جاتا ہے۔ بڑا اچھا بھر کر چائے کا خرچ جاتی ہوں۔ کبھی لڑکے کو بھیج کر بسکٹ منگواتی ہوں تو کبھی نمک پارے، ہاتھ میں دھیلا نہیں ٹک رہا۔" اماں نے سر پکڑا تو میں نے دل تھام لیا۔

"کمال کرتی ہو تم۔ پہلے منگنی پر خرچا کیا اب افسوس کرنے والوں پر پیسہ لٹا رہی ہو۔ قصہ تمام ہوا ہے۔ اب کیوں لوگ آ رہے ہیں۔" میں نے دونوں ماں بیٹی کی صورت دیکھی۔

"پہلے پوچھنے آتے تھے کہ کیا لائے، کیا دیا اب پوچھتے ہیں کیوں منگنی ٹوٹی، سامان میں کیا واپس کیا۔ آگے کس کے ساتھ منگنی ہوگی۔" ارشاد نے جل کر کہا۔

"باجی ہماری برادری میں ایسے ہی ہوتا ہے۔"

اماں نے توجیح پیش کی۔

"خیر ان کی رسم تھی، میں نے ان کے حوالے کی مگر مجھے سب حد درجہ احمقانہ لگا۔ لمبی منگنیاں ہوں تو ایسے ہی ہوگا۔ ماں باپ آپس میں طے کریں۔ نہ برادری کو بتائیں نہ لڑکا لڑکی کو۔ پھر جب عملی جامہ پہنانے کا وقت آئے تو لڑکا لڑکی سے پوچھ کر آر یا پار ہو جائیں۔ میں اپنے تئیں حل سوچ رہی تھی۔

کام کرتی ارشاد نے دھیمے سے مجھے کہا۔

"باجی میں دوبارہ پیسے جوڑ لوں گی۔ پر شادی پر لہنگا ہی پہنوں گی۔"

اس کی امید دیکھ کر مجھے بھی حوصلہ ہوا۔ خدا کرے اب اس کے خوابوں کا محل کبھی نہ ٹوٹے۔ میں نے دل سے دعا کی۔

☆☆

شازیہ جمال طارق

مہک اٹھے گلاب سارے

پلاؤ دم پر لگانے کے بعد اس نے رائتہ بنا کر باؤل میں نکالا اور سلاد کاٹنے لگی۔ فرائی فروٹ کھانا وہ پہلے ہی بنا کر فریج میں رکھ چکی تھی۔

تولیے سے کچن کاؤنٹر صاف کر کے اس نے ایک گہری اطمینان بھری سانس لی اور فیروزہ چچی کے کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ کھولتے ہی ایئر کولر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اس کے پسینے سے نہلائے وجود کو لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھرا دیا تھا۔

الماری کھولے کھڑی فیروزہ چچی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ...... چچی میں نے سب کچھ تیار کر لیا ہے۔"

ان کی نظروں سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ گہری، اندر تک اترتی بے مہر آنکھیں۔

"تو؟" ابرو اچکا کر پوچھا۔

"تو...... وہ میں بس یہی بتانے آئی تھی۔" اتنے برس ان کے ساتھ گزارنے کے باوجود بھی وہ آج تک ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہیں کر پائی تھی۔

"بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ کر لیا تو جتانے بھی آ گئیں؟" اپنا مطلوبہ سوٹ نکال کر زور سے الماری کا پٹ بند کیا تھا۔

"نہیں...... ایسی بات نہیں ہے چچی! میں بس پوچھنے آئی تھی اور کوئی کام ہے تو بتا دیں؟"

"وہ لوگ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ اتنی مہربانی کرنا کہ کھانا لگا دینا۔ اور ہاں کڑک سی چائے بھی بنانی ہے کھانے کے بعد۔"

مکمل ناول

وہ تابعداری سے سر ہلاتی فوراً باہر نکل گئی تھی۔ ٹھنڈے جہنم سے باہر کے گرم لو کے تھپیڑے اسے غنیمت لگے تھے۔ کم از کم وہ کھل کر سانس تو لے سکتی تھی۔

اس نے دادا کے کمرے کی طرف رخ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے سامنے میز پر چند اوزار پھیلائے اپنی بندوق کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے۔

"ہو گئی چاکری؟" بندوق کی نال سیدھی کرتے ہوئے ایک نظر اس کے گرمی اور پسینے سے تمتماتے چہرے کو دیکھا۔

"گھر کے کام کرنے میں کیا قباحت ہے دادا؟" دادا کا پھیلایا ہوا کچرا سمیٹتی وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔ پھر ڈسٹ بن اٹھا کر ان کے قریب رکھ دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ڈسٹ بن کو نظر انداز کر کے عادتاً سارا کچرا ادھر ادھر ہی پھینکتے رہیں گے۔

"گھر کے کام اور پرائی چاکری کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اور یہ تو تم بھی جانتی ہو، کیسے وہ ذرا سی کوتاہی ہونے پر تمہاری دن بھر کی کارگزاری لپیٹ کر چولہے میں جھونک تمہیں دس باتیں سنا ڈالتی ہے۔"

"آج کے دن تو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔" وہ مسکرائی۔

"ابھی دن گزرا کہاں ہے زینیا سرفراز؟"

بندوق کی نال میں زور سے پھونک مارتے ہوئے انہوں نے اس کے لبوں پر کھلتے خوش امیدی کے پھول کو بھی پھونک مار کر دور اڑا دیا تھا۔

وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔ نہا کر ابھی گیلے بال سلجھا رہی تھی جب چچی کے مہمانوں کی آمد ہوئی۔ جس طرح وہ اسے کھانے کی تیاری کے بارے میں ہدایات دے رہی تھیں۔

زینیا کو لگا کوئی بہت خاص مہمان آنے والے ہیں۔ لیکن آنے والوں کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

مہندی سے رنگے بے حد سرخ بالوں والی چچی کی ماں اور ان کا بھائی سلمان احمد جو خود کو سلمان خان

...سے ہرگز کم نہیں سمجھتا تھا۔ گلے میں پڑی موٹی چین ...گھماتا وہ کھانا لگانے کے دوران مسلسل زینیا پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

انگوری رنگ کا دوپٹہ پھیلا کر اپنے گرد اوڑھتے وہ کھانا لگاتے ہی باہر جانے لگی تو سلمان نے استحقاق بھرے انداز میں روک لیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟ کھانا نہیں کھاؤ گی کیا؟"

"میں کھانا ہمیشہ اپنے دادا کے ساتھ ہی کھاتی ہوں۔" روکھے لہجے میں جواب دیتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

"بڑی اکڑ ہے بھئی۔" سلمان نے اپنے گردن سے نیچے تک آتے لمبے سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"دھیرج میرے بھائی جلدی کا کام شیطان کا۔"

پلیٹ میں پلاؤ نکالتی فیروزہ کے مشورے پر وہ محض گہری سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ جبکہ سرخ بالوں والی فریدہ بیگم کی اس وقت ساری توجہ کھانے کی طرف تھی۔

زینیا اچھی طرح جانتی تھی جب تک یہ لوگ موجود رہے اس کے حلق سے پانی کا ایک گھونٹ اترنا محال تھا۔ چچی اسے زچ کرنے کی خاطر بار بار کسی نہ کسی بہانے سے بلا بھیجتیں۔ آخر میں وہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ ٹرے میز پر رکھ کر جانے لگی تو فریدہ بیگم نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"اتنی تمیز نہیں ہے کہ چائے کی پیالی بنا کر ہاتھ میں ہی تھما دے۔ اے فیروزہ! تو نے اس لڑکی کو کچھ نہیں سکھایا۔ آخر کو حرف تو تیری تربیت پر ہی آئے گا۔ بن ماں کی بچی کو بھیڑ بکری کی طرح پال پوس کر بڑا کر دیا۔ نہ تمیز سکھائی نہ آداب......"

سرخ چہرہ لیے وہ دو زانوں بیٹھ کر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی تھی۔ جی تو چاہا گرم چائے کی ایک پیالی اس بے ہودہ انسان کے چہرے پر الٹ دے جس کی غلیظ نگاہیں اسے اپنے وجود کے آر پار اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اسی وقت ضیاء چچا نے اندر قدم رکھا تھا۔ چچی ماں کو مزید گوہر افشانی کرنے سے منع کرتیں فوراً پینترا بدل کر بولیں۔

"کیا کروں اماں؟ بن ماں کی بچی ہے۔ پھولوں کی چھڑی سے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جو کچھ کرتی ہے اپنی مرضی اور خوشی سے کرتی ہے۔ میں نے کبھی کوئی روک ٹوک نہیں کی۔ سرفراز بھائی اتنی بڑی ذمہ داری ہمیں سونپ گئے ہیں۔ خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ان کو کیا جواب دوں گی۔"

زلیخا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑ کر اس کے ہاتھ کو چھونے کی شدید خواہش دل میں دباتا سلمان گہری سانس بھرتا مجبوراً ضیاء صاحب سے مصافحہ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

عین وقت پر انہوں نے انٹری مار کر سارا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔

زلیخا سب کو چائے دینے کے بعد تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اپنے اور دادا کے لیے کھانا لے کر وہ ان کے کمرے میں آ گئی تھی۔ چھوٹی سی میز پر کھانا چن دیا۔ دادا شاور لے رہے تھے۔ وہ کرسی کھینچ کر دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے ان کا انتظار کرنے لگی۔ چچی کے مہمان گرامی رخصت ہو گئے تھے۔ اس لیے اب وہ قدرے مطمئن تھی۔

"ضیاء آ گیا تھا؟" اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے دادا نے پوچھا تو وہ ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالتی اثبات میں سر ہلا گئی۔

"میرا نہیں پوچھا؟"

دادا نے رکابی سے ڈھکن ہٹایا۔ انہیں ڈاکٹر نے چاول کھانے سے منع کیا تھا۔ زلیخا نے ان کے لیے ہلکی مرچ مسالے ڈال کر کدو کا سالن بنایا تھا۔

"پوچھا تھا۔ چچی نے کہا آپ اندر کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔"

"بیوی نے کہا تو یقین بھی کر لیا۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ خود چل کر باپ کو دیکھنے آ جاتا۔ الو کا......"

"آپ خود کو گالی دے رہے ہیں دادا!" زلیخا نے ہنستے ہوئے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالے۔ مہمان خصوصی ساری بوٹیاں، رائتہ، سلاد سب چٹ کر گئے تھے۔ غنیمت تھا کہ چند نوالے چاولوں کے چھوڑ دیے۔ چچی کا بس چلتا تو یہ بھی ان کے ساتھ باندھ کر روانہ کر دیتیں۔

"ہاں الو تو ہوں جو ایسے پٹھے پیدا کیے۔ ایک یہ ہے بیوی سے کان اور زبان ادھار مانگے پھرتا ہے اور دوسرا وہ......"

انہوں نے غصے سے نوالہ چبایا۔ زلیخا چپ چاپ چاول ختم کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی جب تک دادا یوں بول بول کر اپنے اندر کی بھڑاس نہیں نکال لیں گے انہیں سکون نہیں ملے گا۔

☆☆☆

"جی...... جی بھائی جان! بالکل...... یہ لیں ابا سے بات کریں۔"

ضیاء چچا نے بات کرتے کرتے موبائل ان کی طرف بڑھایا۔ "بھائی جان ہیں۔"

دادا نے خفگی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"مجھے بات نہیں کرنی۔"

"ابا!" ضیاء اللہ نے زبردستی موبائل ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دوسری طرف سرفراز بہت محبت سے ان کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔

"ہاں...... ہاں لگتا تو ہے زندہ ہوں ٹھیک بھی ہوں۔"

چچا انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

"ہاں مل گئے تھے پیسے۔ منع کیا تھا تمہیں اتنے نہ بھجوایا کرو۔ بھلا کفن دفن پر کون سا اتنا خرچا آتا ہے۔ یہ تمہارا امریکہ تو ہے نہیں جہاں دو گز زمین کھودنے اور بھرنے کے لیے کئی ڈالر لگ جائیں۔"

"کیوں کرتے ہیں ابا جی آپ ایسی باتیں؟" سرفراز صاحب کی بے چارگی بھری آواز ابھری تھی۔

"کیوں نہ کروں؟" دادا تنک کر بولے۔ "میں

تو ایسی باتیں ہی کروں گا۔ تم نے نہیں سنی تو دوبارہ یہاں فون مت کرنا۔ سمجھے؟"

کال کاٹ کر موبائل سر پر ملک الموت کی طرح کھڑے ضیاء اللہ کی طرف بڑھایا۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے موبائل لے کر باہر چلے گئے تھے۔

☆☆☆

"ایک تو مجھے آپ کے اباجی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر کس چیز کی کمی ہے انہیں جو وہ ہر وقت گلے شکوؤں کی پٹاری کھولے لیے رکھتے ہیں۔"

منہ پر کلینزنگ کرتی فیروزہ بیگم نے انہیں اندر آتا دیکھ کر کہا۔

"اسی بات کا تو مجھے بھی قلق ہے ان سے۔"

ضیاء اللہ اپنے کھاتے کا رجسٹر کھول کر بیٹھ گئے۔

انہیں کنوؤں کے باغات کا ٹھیکہ ملتا تھا۔ اس کا حساب کتاب کرنے کی غرض سے روز رات کو اپنا رجسٹر کھول کر بیٹھ جاتے۔

"سرفراز بھائی بھی کیا سوچتے ہوں گے۔ ہر ماہ اتنی رقم بھجوانے کے باوجود بھی نہ تو اباجی ان سے سیدھے منہ بات کرتے ہیں نہ زینی......"

ضیاء اللہ نے چونک کر رجسٹر سے اپنا سر اوپر اٹھایا تھا۔

"زینی! کیوں سیدھے منہ بات نہیں کرتی؟"

"آپ کو تو جیسے کچھ پتا نہیں۔ اباجی کے زیر اثر ہے وہ۔ جیسا وہ کہتے ہیں وہی کرتی ہے۔ میری بات کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اس کی نظر میں۔"

نرم پف کی مدد سے چہرہ صاف کرتیں وہ ایسے دل گرفتہ لہجے میں بولی تھیں کہ ضیاء اللہ نے گہری سانس اپنے اندر اتاری پھر قدرے نرم سمجھانے والے انداز میں بولے۔

"چھوڑو۔ تم اپنا دل برا مت کیا کرو۔ تمہیں میرے کاروبار کا اچھی طرح معلوم ہے۔ سیزن گزرنے کے بعد مالو کھانے کے لالے پڑ جاتے اگر بھائی جان زینی کے خرچے کی مد میں ہر ماہ وہ رقم ہمیں نہ بھجوائیں تو۔" بات تو سچ تھی مگر......

"ہاں تو ہم نے زینی کو کون سا کسی چیز کی کمی ہونے دی ہے۔ اپنی مرضی سے کھاتی پیتی، پہنتی اوڑھتی ہے۔" ضیاء اللہ ہنکارہ بھرتے پھر سے رجسٹر پر سر جھکا گئے تھے۔

☆☆☆

شام کی چائے بناتے ہوئے زینیا نے کچن کی کھلی کھڑکی سے دیکھا۔ چچی برآمدے کے باہر کاسنی پھولوں والی بیل کے ساتھ لپٹی گرل کے ساتھ چارپائی پر بیٹھی مشی سے کال پر بات کر رہی تھیں۔

"پڑھائی بھی ہوتی رہے گی۔ بس تم اپنے کھانے پینے میں غفلت مت برتا کرو۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھو۔ وہاں پرائے شہر میں کون سا ماں ساتھ بیٹھی ہے۔ اب اپنا خیال خود ہی رکھنا سیکھ لو۔

میرا تو دن رات دھیان تمہارے اور خانو کی طرف ہی لگا رہتا ہے۔ اور اس خانو کو دیکھو میں نے فون نہیں کیا تو اتنی توفیق نہیں ہوئی کال کر کے ماں کو اپنی خیریت ہی بتا دے۔ بہت لاپرواہ ہے یہ لڑکا......"

چچی اتنی لمبی بات صرف اپنے دونوں بچوں سے ہی کرتی تھیں۔ بات کرتے وقت ان کا سارا دھیان، ساری توجہ فون کے دوسری طرف ہوتی۔ خانو یا مشی کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ہی وہ ان کے خیریت سے ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ لگا لیا کرتی تھیں۔

زینیا خاموشی سے ان کے سامنے چائے رکھ کر پلٹ گئی تھی۔

اور وہ زینیا سرفراز اس قابل تھی ہی کہاں کہ وہ اس پر بلا ضرورت ایک نظر ڈالتیں۔

"مجھ بڈھے کو آج کے دن چائے ملے گی یا نہیں؟"

اندر سے دادا دھاڑ رہے تھے۔ اتنا سا زور لگانے سے کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ اگلے کئی لمحوں تک کمزور وجود ہلکورے کھاتا رہا تھا۔

"ضرور ملے گی۔ لیکن پہلے آپ ذرا باہر آئیں

تو ایک بہت پیاری چیز دکھاتی ہوں۔"

"نہ...... میں نے نہیں آنا باہر......"

بوڑھے دادا دن بدن بچہ بنتے جا رہے تھے۔ ان کے لاکھ مچلنے، جان چھڑانے کے باوجود زیتا انہیں باہر لے آئی تھی۔

دائیں دیوار کے قریب بوگن ویلیا کی ٹھنڈی چھاؤں تلے کرسی بچھا کر انہیں بٹھایا۔ پھر کچن سے چائے کی پیالی پرچ میں رکھ کر ان کی طرف بڑھائی۔

"کہاں ہے وہ پیاری چیز جو مجھے دکھانے کے لیے تو کھینچ کھانچ کر باہر لے آئی ہے؟" پرچ میں تھوڑی سی چائے ڈال کر سڑک کر کے پی گئے۔

"سامنے دیکھیں دادا! آج گلاب کے پودے پر کتنے سارے پھول کھلے ہوئے ہیں نا؟"

"تم مجھے یہ پھول دکھانے کے لیے لے کر آئی ہو؟" سڑک کر کے پھر پرچ خالی کی۔

"نہیں تو...... گل دوپہری کو دیکھیں ذرا کیسی بہار آئی ہوئی ہے آج ان پر۔"

"یہ گل دوپہری؟"

دادا نے ناک چڑھا کر گول کیاری میں اگے ڈھیر سارے گلابی پھولوں کو گھورا۔

جبکہ وہ کہہ رہی تھی "فضا میں کھلی موتیا کی مہک محسوس کریں دادا! ان کے گرد منڈلاتی زرد پروں والی تتلی اور...... اور آپ کی یہ پوتی۔ کیا ان سب سے بڑھ کر بھی کچھ پیارا ہے اس دنیا میں؟"

ان کے عقب میں کھڑی وہ پوچھ رہی تھی۔ دادا نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا اور اس لمس کے پیچھے لو دیتا احساس۔ ان کی ملگجی آنکھوں میں دھندی چھانے لگی تھی۔

"نہیں، میری پوتی سے بڑھ کر تو کوئی بھی پیارا نہیں ہے اس پوری دنیا میں۔"

ناریل کا خول چٹخنے لگا تھا۔ زیتا نے لاڈ سے ان کے گلے میں اپنے بازو حمائل کر دیے۔

"ارے...... ارے پیچھے ہٹو۔ گردن دباؤ گی کیا میری؟ ہاں تو تم بھی چاہتی ہو گی یہ بڈھا جلدی سے مر کھپ جائے اور تمہاری جان چھوٹ جائے۔ سارا دن تنگ جو کرتا رہتا ہوں۔"

چٹختا خول پھر سے جڑنے لگا تھا۔ دادا نے اس کے ہاتھ جھٹکنے چاہے۔ "دادا!" وہ لاڈ میں مزید ان سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

"غضب خدا کا، سارا کچن ادھڑا پڑا ہے، رات کے کھانے کی کچھ خبر نہیں۔ اگر پیار کے یہ مظاہرے ختم ہو گئے ہوں تو جا کر کچن کی کچھ خبر لو......"

مشی سے بات کرنے کے بعد چچی کی نظروں نے تیر کی طرح اپنے ہدف کا نشانہ لیا تھا۔

"جی چچی! میں بس ابھی جا ہی رہی تھی کچن میں۔"

زیتا نے فوراً خالی پرچ پیالی اٹھائی۔ دادا نے خشمگیں نگاہوں سے بہو کو گھورا۔ جن کی آمد نے اس سارے خوب صورت منظر کو گرہن لگا دیا تھا۔

"بات سنو بہو! یہ اگر گھر کے کام کر دیتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تم اس کے ساتھ بالکل ملازماؤں والا سلوک کرو۔"

چچی نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ "مفت کی روٹیاں توڑنے سے بہتر ہے، تھوڑے ہاتھ پیر ہی ہلا لیے جائیں۔"

"مفت کی روٹیاں؟" دادا چراغ پا ہوتے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میرا منہ مت کھلواؤ ورنہ کیا میں نہیں جانتا اس کے باپ کے بھیجے گئے پیسوں سے تم اور تمہاری اولاد کیسے عیش کر رہی ہے۔ وہ ہاتھ کھینچ لے تو لگ پتا جائے گا۔ مفت کی روٹیاں ہونہہ......"

"دیکھ لیں ضیاء صاحب! آپ کے ابا کیسے منہ بھر بھر کر مجھے طعنے دے رہے ہیں؟"

بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ضیاء اللہ پر نظر پڑتے ہی چچی کا لہجہ اور الفاظ دونوں بدل گئے تھے۔

"سرفراز بھائی جو کچھ بھی دیتے ہیں اپنی مرضی

اور خوشی سے دے دیتے ہیں۔ ہم نے کبھی ان کے سامنے جھولی نہیں پھیلائی۔ زیبی ان کی اولاد ہے اگر وہ اپنی خوشی سے اس کا خرچا بھیج دیتے ہیں تو اس میں میرا یا میرے بچوں کا بھلا کیا مفاد؟"

ضیاء اللہ نے ایک شکایتی نگاہ اپنے باپ پر ڈالی تھی۔

"ابا! آپ کیوں ہر وقت فیروزہ کو الزام دیتے رہتے ہیں۔ آخر اس نے کیا بگاڑا ہے آپ کا......؟"

"چپ عقل کے اندھے! کبھی تو تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیا کر۔"

دادا نے جھاڑا تو وہ منہ بنا کر خاموشی سے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

"دادا! آپ اندر چلیں۔" زیچا نے ان کا بازو تھاما۔

"میری ٹانگیں سلامت ہیں۔ خود جا سکتا ہوں۔" دادا نے خفگی سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"ہونہہ رسی جل گئی، بل نہ گیا۔ مری سست، گواہ چست۔" چچی طنزیہ مسکراہٹ دادا پوتی کی طرف اچھالتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

چچی کو خوش کرنے کی خاطر وہ کچن میں گھسی تو پھر سارا کام ختم کر کے ہی باہر نکلی تھی۔

بہت دل لگا کر مسالے والی چنے کی دال بنائی۔ چچا کا پسندیدہ باداموں والا کسٹرڈ بھی بنا ڈالا۔

دادا اپنے کمرے میں بستر پر چت لیٹے پنکھے کو گھور رہے تھے۔ زیچا نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ کر کھڑکی کھول دی۔

کمرے میں گھسی حبس کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا تھا۔ وہ دادا کے بیڈ کے کنارے ٹک کر انہیں دیکھنے لگی۔ یہ لحظہ بہ لحظہ بگڑتے موڈ اور چڑچڑے پن کی ساری وجوہات وہ جانتی تھی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

دادا نے آنکھوں پر رکھا اپنا بازو ہٹا کر اسے گھورا۔ "سخت زہر لگ رہی ہو؟"

وہ ہولے سے مسکرائی۔ دادا کے بولنے سے زیادہ ان کا خاموش ہو جانا تکلیف دیتا تھا۔

"اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"

زیچا کو ہنسی آ گئی۔ "بہت بھاری ہوں آپ نہیں اٹھا سکیں گے۔"

"ٹرے کو۔" دادا نے دانت پیسے۔

"بابا کا غصہ چچی پر، چچی کا مجھ پر اور میرا کھانے پر نکالیں گے؟"

اس نے آرام سے کہتے ہوئے کھانے کی ٹرے درمیان میں رکھ دی۔ دادا چڑ کر اٹھ بیٹھے۔

"انسان کو اتنا بزدل اور کم ہمت نہیں ہونا چاہیے زیچا سرفراز!"

زیچا نے سر ہلایا۔ "بالکل نہیں ہونا چاہیے۔"

"اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے۔"

زیچا نے پھر سر ہلایا۔ "بالکل اٹھانی چاہیے۔"

دادا نے انگلی سے اس کا سر بجایا۔ "یہ میں تمہیں کہہ رہا ہوں۔"

"اچھا؟" اس نے معنوی حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

دادا نے خون کا گھونٹ بھرتے ہوئے ٹرے اپنی جانب کھسکا لی تھی۔ زیچا نے سکھ کی سانس لی تھی۔

☆☆☆

خالو کا دو دن سے مسلسل فون بند جا رہا تھا۔

چچی کا مارے پریشانی کے برا حال تھا۔ مشی کو کال ملائی تو اس نے بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ چچی اس پر الٹ پڑیں۔

"یونیورسٹی اور ہاسٹل مختلف ہیں لیکن شہر تو ایک ہی ہے نا؟ پھر بھی تم دونوں بہن بھائی کو ایک دوسرے کی خبر نہیں ہے۔"

"مجھے کچھ مت کہیں آپ...... اپنے لاڈلے کو اچھی طرح جانتی ہیں وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔"

مشی کو ماں کا یوں اس پر غصہ کرنا ناگوار گزرا تھا۔

"ویسے بھی وہ کون سا ہر جگہ مجھے بتا کر جاتا ہے۔ ہو گا کہیں اپنے دوستوں میں مصروف۔ فارغ

ہو کر خود ہی آپ سے رابطہ کرے گا۔"

اس کا انداز تسلی دینے سے زیادہ جان چھڑانے والا تھا۔ فیروزہ بیگم کی پریشانی پہلے سے کہیں بڑھ گئی تھی۔ کالج کے بعد دونوں نے لاہور کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہاں ان کے چند قریبی رشتہ دار تھے۔ رہائش کا مسئلہ باآسانی حل ہو سکتا تھا۔

"لیکن کسی دوسرے کے گھر میں اتنا عرصہ مہمان بن کر رہنے سے اپنی اور ان کی پرائیویسی کا کباڑا کرنے سے کہیں بہتر ہے بندہ کسی گرلز ہاسٹل میں رہ لے۔"

یہ مشی کے خیالات تھے۔ جنہیں عملی جامہ پہنانے میں اس نے دیر نہیں کی تھی۔ جبکہ خان محمد اپنے دوستوں کے ساتھ کرائے کے ایک فلیٹ میں رہ رہا تھا۔

چچی کا بس چلتا تو وہ کہیں سے مائیکرواسکوپ لگا کر اپنے دونوں بچوں کو دیکھتی رہتیں۔ وہ ان کے بارے میں جتنی وہمی تھیں وہ دونوں اتنے ہی لاپرواہ۔

اور اس بار تو خانو نے لاپروائی کی حد ہی کردی تھی۔

چچی کا سارا غصہ زینیا پر نکلا۔ جو پچھلے صحن میں واشنگ مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھی۔

چچی نے دھلی ہوئی بستر کی چادریں، تکیے کے کور، پردے اور بھی نجانے کیا کچھ گول مول کر کے اس کے سامنے لا پھینکا۔

"یہ کون دھوئے گا؟"

"یہ سب تو پچھلے ہفتے دھلا تھا چچی۔"

چچی کو مزید ابال آیا۔ "پچھلے ہفتے دھلا تھا تو اب کیا کبھی نہیں دھلے گا؟ حد ہوتی ہے ہڈحرامی اور کام چوری کی......"

چچی کے غصے کی وجہ وہ جانتی تھی۔ اس نے دل سے خانو کے فون آنے کی دعا کی تھی۔ اسے چچی کی اپنے بچوں سے جنونی محبت کا اندازہ تھا۔ صرف ان کے بہتر مستقبل کی خاطر انہوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر لاہور جانے دیا تھا۔ ورنہ وہ کہاں انہیں اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے دیتی تھیں۔ ہر ماہ بطور خاص پنجیری اور دیگر خشک میوہ جات صاف کر کے تھیلیوں میں بند کر کے چچا کو دیتیں کہ وہ لاہور پہنچا آئیں۔

شاید ہر ماں اپنے بچوں کے لیے اتنی ہی فکرمند رہتی ہوگی۔ زینیا افسردگی سے سوچتی۔

اس نے ماں کی ممتا دیکھی ہی کب تھی؟

وہ کپڑے دھو کر اندر آئی تو دادا کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ دادا کانوں میں روئی ڈالے بے نیازی سے اپنی بندوق کے پیچ پرزے کس رہے تھے۔ زینیا نے کال اوکے کرلی۔

"ضیاء بتا رہا تھا تم نے کالج چھوڑ دیا ہے؟ کیوں بیٹے؟"

"میرا دل نہیں چاہتا بابا!"

دادا نے ایک مسکرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔ اس نے دانستہ رخ موڑ لیا۔ وہ اس کے سامنے آئینہ بن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے۔

سرفراز صاحب اس پر خفا ہو رہے تھے۔ وہ کہہ نہ سکی کہ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے کے بعد اس کے اندر اتنی ہمت نہیں بچتی تھی کہ وہ کتابیں کھول کر ایک نظر انہیں دیکھ لے۔

تھکان زدہ وجود کو اس وقت صرف بستر کی طلب ہوتی تھی۔ صبح ہوتے ہی پھر سے وہی بیگار شروع۔

"آپ کو اپنی پڑھائی نہیں چھوڑنی چاہیے۔ مشال اور خان محمد کو دیکھو جنہوں نے اسٹڈیز کے لیے اپنا گھر، سارا عیش و آرام چھوڑ دیا۔ انسان کو اپنے فیوچر کے بارے میں اتنا کیئرلیس نہیں ہونا چاہیے۔"

میرا ان کے ساتھ بھلا کیا مقابلہ؟ اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

دوسری طرف اب وہ بہت سنجیدگی سے اسے دوبارہ کالج میں داخلہ لینے اور پڑھائی کا ٹوٹا سلسلہ پھر سے جوڑنے کا کہہ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"میں کوشش کروں گی۔" آہستہ سے کہہ کر اس

نے فون بند کر دیا تھا۔"

☆☆☆

اسے چھت سے اترتا دیکھ کر چچی کا پارہ ایک دم ہائی ہوا تھا۔

"یہ تم چھت پر کس خوشی میں مٹرگشت کرتی پھر رہی ہو؟ کب سے کہہ رہی ہوں مشی کے کمرے کی اچھے سے صفائی کر دو۔ سسر ختم ہوتے ہی وہ گھر واپس آئے گی تو کیا اس دھول مٹی سے اٹے کمرے میں رہے گی؟ ویسے ہی اسے ڈسٹ سے الرجی ہے۔ اور تم نے کتنے دنوں سے اس کے کمرے کی ڈھنگ سے صفائی نہیں کی۔"

"میں ابھی کر دیتی ہوں چچی!" اس نے یہی کہنا تھا۔

"اور ہاں جالے وغیرہ اچھے سے صاف کرنا۔"

"یہ کام تم خود کر لو۔" دادا اپنے کمرے کے کھلے دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ چچی نے ناخوشی سے ان کی طرف دیکھا جو بے نیازی سے کہہ رہے تھے۔

"کیونکہ زینی، شیریں کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے حیدر آباد جا رہی ہے۔"

اتنے آرام سے انہوں نے ان کے سر پر بم پھوڑا تھا۔ چچی تو چچی زیجا بھی مارے حیرت کے اچھل پڑی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہیں ابا جی! شاید میں نے ٹھیک سے سنا نہیں؟"

چچی کو آج پہلی بار اپنی قابل رشک سماعت پر شبہ ہوا تھا۔

"میں نے کہا شیریں کا فون آیا تھا کہہ رہی تھی ثمن کی شادی میں زیجا کو شرکت کے لیے حیدر آباد بھیج دیں۔ میں نے ہامی بھر لی۔"

اب کی بار دادا نے ذرا وضاحت سے اپنی بات کو دہرایا تھا۔

"کمال کرتے ہیں ابا جی آپ بھی اتنی دور پرائے لوگوں میں جوان جہان لڑکی کو اکیلے بھیجنے کی کیا تک بنتی ہے بھلا؟"

"پرائے لوگ وہ میرے اور تمہارے لیے ہیں۔ اس کی تو سگی خالہ ہے۔" دادا اطمینان سے بولے۔

"ہونہہ سگی خالہ نے آج تک تو پلٹ کر بھانجی کی خبر نہیں لی۔ اب راتوں رات ایسی کون سی محبت جاگ گئی ہے کہ اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔"

ایسا کہتے ہوئے چچی بالکل بھول گئیں کہ شیریں کو جوڑوں کے درد نے کافی عرصہ سے سفر کرنے سے معذور کر دیا تھا۔ البتہ زیجا کی خیر خیریت کے لیے وہ وقتاً فوقتاً کال کرتی رہتی تھیں اور اکثر اس کے لیے تحائف بھی بھجواتیں۔

چچی کو نظر انداز کر کے وہ منہ کھولے کھڑی زیجا کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تم اپنی پیکنگ وغیرہ کر لو، کل صبح سات بجے والی گاڑی پر روانہ ہونا ہے تمہیں۔"

☆☆☆

فیروزہ چچی پورے گھر میں جلے پیر کی بلی کی مانند چکراتی پھر رہی تھیں۔ ضیاء اللہ نے جیسے ہی اندر قدم رکھا وہ چیل کی طرح ان کی طرف بڑھیں۔

"خیریت؟" سیاہ چرمی تھیلا میز پر رکھتے ہوئے بیوی کا متغیر چہرہ دیکھا۔

"سٹھیا گئے ہیں آپ کے ابا جی۔"

"تمیز سے بات کرو۔" جھک کر جوتے اتارتے ہوئے انہوں نے ناگواری سے ٹوکا۔

"زینی کو حیدر آباد شیریں کی بیٹی کی شادی میں بھیج رہے ہیں۔"

چچی کے تڑخ کر کہنے پر وہ ایک دم چونک کر سیدھے ہوئے۔ "تو؟"

اور اس تو کے جواب میں چچی نے انہیں ناک تک یوں بھرا کہ وہ نتھنے پھلاتے دادا کے کمرے کی طرف بڑھے۔ جہاں زیجا پہلے ہی ان سے بحث کر رہی تھی۔

"آپ میرے ساتھ چلیں گے تو ٹھیک ورنہ میں نہیں جارہی۔"

"میں بڈھا وہاں باراتیوں کے استقبال کے لیے کیا پھول نچھاور کروں گا؟"

زینیا انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ "میں اتنی دور اکیلی.....

"کیا دور دور لگا رکھی ہے۔ بمشکل ڈیڑھ دو گھنٹوں کا سفر ہوگا۔ دنیا چاند تک پہنچ گئی اور تم بھری بس میں بیٹھ کر حیدر آباد تک نہیں جاسکتیں؟"

دادا نے اچھا خاصا جھاڑ کر رکھ دیا۔ اس کے منہ بسورنے پر بولے۔

"خدمت کرا اور چپ چاپ اپنا سامان باندھ۔"

اس نے تذبذب سے ایک بار پھر دادا کا چہرہ دیکھا جبکہ انہوں نے ایک ابرو چڑھا کر اشارہ کیا۔

"جلدی۔"

"میں چلی گئی تو آپ کا خیال کون رکھے گا؟" اس کی پریشانی کی اصل اور سب سے بڑی وجہ یہی تھی وہ بھلا دادا کو چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھی؟

"میں خود رکھ لوں گا۔" وہ بھی گویا تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ ضیاء اللہ نے ادھ کھلا دروازہ زوردار جھٹکے سے کھول کر اندر قدم رکھا تھا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں ابا؟ آپ سرفراز بھائی سے پوچھے بغیر زینی کو اتنی دور اکیلے بھیجنے کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ تو آج تک پڑوس میں اکیلی کہیں نہیں گئی اور آپ اسے اکیلے دوسرے شہر بھیج رہے ہیں؟ مجھے تو آپ کی فہم و فراست پر حیرت ہو رہی ہے۔ آپ ایسا بچکانہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟"

دادا نے اطمینان سے ان کی پوری تقریر سنی۔ اور سکون سے بولے۔

"بس یہی کچھ کہلوا بھیجا ہے تیری بیوی نے؟"

"ابا!" وہ سخت چیں بہ چیں ہوئے۔

"مجھے زینیا کے لیے جو ٹھیک لگے گا، میں وہ کروں گا۔ تمہیں یا تمہاری بیوی کو زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے؟"

ضیاء اللہ لب بھینچے وہاں سے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

چچی کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔ انہیں گھر کے چھوٹے بڑے ہر کام کے لیے بیٹھ کر زینیا پر حکم چلانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اب اس کے جانے کا سوچ کر پورے گھر کا بار انہیں اپنے سر پر پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔

دادا اسے اسٹاپ تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ زینی باہر نکل آئی۔

"میں جاؤں چچی؟" چھوٹا سا بیگ صحن کے فرش پر رکھے وہ چچی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت بیرونی دروازہ کھول کر سلمان اندر آیا۔ زینی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔

"کہاں کی تیاری ہے سوہنیو؟" سر تا پاؤں بغور جائزہ لیا گیا۔ زینیا نے ایک نظر تنا ہوا چہرہ لیے چچی کو دیکھا اور جھک کر بیگ اٹھالیا۔ دادا اپنے کمرے سے نکل کر اسی کی طرف چلے آئے۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ نکما سلمان خان تم سے؟" دروازہ پار کرتے ہوئے پیچھے زینیا سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" زینی نے آہستہ سے جواب دیا۔

رکشے کا ڈنڈا پکڑے وہ دادا سے خفا خفا سی بیٹھی ارد گرد گزرتے دوڑتے مناظر دیکھ رہی تھی۔

"جانتی ہو میں تمہیں حیدر آباد کیوں بھیج رہا ہوں؟"

دادا نے اس کا خفا خفا چہرہ دیکھا۔

"کیوں؟"

"چلو رہنے دو ابھی، جب واپس آجاؤ گی تب بتاؤں گا۔" وہ مبہم سا مسکرائے تھے۔

رکشہ بس اسٹاپ پر رکا تو وہ گہری سانس کھینچتی سیدھی ہوئی۔ ہر طرف شور، دھواں، گاڑیوں کی پاں پاں، اونچی اونچی آوازیں لگاتے کنڈیکٹر، یہ سب کچھ کتنا نامانوس سا تھا۔ اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگوں کا اژدہام

دیکھ کر۔

"میں شادی ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤں گی۔ تب تک آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔" ڈنڈا پکڑ کر پائدان پر قدم دھرتی وہ بولی تھی۔

"خبردار! جب تک میں نہ بلاؤں، واپسی کا سوچنا بھی مت۔"

زجیا کو صدمہ ہوا۔ "آپ مجھے شہر بدر کر رہے ہیں دادا؟"

"ایسا ہی سمجھو۔" وہ بے نیاز بن گئے۔ زجی اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

"زجیا آ گئی۔" ثمن نے اسے دیکھتے ہی زور دار نعرہ بلند کیا تھا۔

"میں شرط ہار گئی۔" اتنے والہانہ اور پرجوش انداز میں وہ اپنی شرط ہارنے کی خوشی منا رہی تھی کہ زجیا کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ اس کی حیران شکل دیکھ کر ثمن ہنس پڑی تھی۔

"دراصل میں نے امی سے شرط لگا رکھی تھی کہ تم نہیں آؤ گی جبکہ امی کو یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔"

ساری بات سمجھ کر زجیا مسکرا دی تھی۔

شیریں خالہ نے جس محبت سے اسے اپنے ساتھ لپٹایا تھا اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیلنے لگی۔ کیسا نامانوس عجیب سا ٹھنڈک دیتا احساس تھا۔ بوا اس کا بیگ اٹھانے لگیں تو ثمن نے روک دیا۔

"یہ میں اٹھالوں گی بوا! آپ کھانے کو دیکھیں۔ زجیا سفر کر کے آئی ہے اس کو بھوک لگ رہی ہوگی۔"

بوا سر ہلاتی کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ ثمن نے اس کا چھوٹا سا بیگ اٹھا لیا اور اسے اپنے ساتھ کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔

"اس طرف واش روم ہے۔ تم فریش ہو جاؤ پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

ثمن کے باہر جانے کے بعد اس نے کھل کر سانس لی تھی۔ وہ کہاں عادی تھی ایسے لمحوں کی، یہ قرب

یہ عنایات اس کے لیے ہی تھیں۔ اور زجیا سرفراز اتنی جلدی نیا پن قبول کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"مجھے تمہاری پسند ناپسند کی بارے میں کچھ خاص اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے بس جو دل کیا وہ بنا لیا۔" ڈائننگ ٹیبل پر ڈھیر سارے پکوان سجائے شیریں خالہ محبت سے بول رہی تھیں۔

"یہ مٹن پلاؤ زریں کو بہت پسند تھا۔"

"امی کو مٹن پلاؤ پسند تھا؟" زجیا نے دہرایا۔ پہلی بار کسی نے اس سے اس کی ماں کی پسند، ناپسند کے بارے میں بات کی تھی۔

"ہاں شادی سے پہلے بہت شوق سے اماں سے پکواتی۔ پھر خود پکانا سیکھ لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں اپنی شادی کے بعد پہلی بار تمہارے خالو کے ساتھ اماں کے پاس گئی تو زریں نے بہت لذیذ مٹن پلاؤ بنایا تھا۔ تمہارے خالو نے اتنی تعریفیں کیں اور وہ خوش ہوتی داد وصول کرتی رہی تھی۔"

خالہ کے لہجے میں گئے دنوں کی میٹھی سی چاشنی گھل گئی تھی۔ وہ بہت محویت سے انہیں سننے لگی۔

"لیکن کریلے سخت ناپسند تھے اسے۔ جس دن اماں قیمہ بھرے کریلے پکاتیں وہ اتنا شور مچاتی کہ کیوں قیمہ ضائع کر رہی ہیں؟"

زجیا نم آنکھوں سے ہنس پڑی۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا ان کے منہ سے ماں کے بارے میں سننا۔ وہ بمشکل ڈھائی سال کی تھی جب اس کی شوخ، چنچل ماں منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔

کھانے کے دوران خالہ اسے ماضی سے جڑے کئی قصے سناتی رہیں۔ کبھی وہ زور زور سے پلکیں جھپک کر آنکھوں میں چھلکتی نمی کو اندر دھکیلتی تو کبھی نم آنکھوں سے بے ساختہ ہنس دیتی۔

☆☆☆

رات کو اس سے باتیں کرتے کرتے اچانک ثمن کے خراٹے گونجنے لگے تھے۔ زجیا نے رشک سے بے خبر، پرسکون سی ثمن کو دیکھا، بے فکری شاید انسان کو ایسا ہی سکون بخشتی ہے جو اس وقت ثمن کے

چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

ثمن کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر وہ دادا کے بارے میں سوچنے لگی۔ نجانے انہوں نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں؟

چچی نے سارا غصہ یقیناً دادا کے پرہیزی کھانے میں تیز مرچ مسالے جھونک کر اتارا ہوگا۔ اس نے افسردگی سے سوچا۔ نیند آج آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

بار بار کروٹیں بدلنے سے کہیں ثمن کی نیند خراب نہ ہو جائے، یہ سوچ کر وہ بیڈ سے اتر کر باہر آ گئی تھی۔

چودھویں کے چاند کی ٹھنڈی میٹھی چاندنی چہار سو پھیلی ہوئی تھی سرسبز بیلوں سے ڈھکا خالہ کا، خوبصورت گھر رات کے اس پہر دودھیا چاندنی میں بہت سحر انگیز لگ رہا تھا۔ وہ پانی پینے کی غرض سے کچن میں آ گئی۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر سیدھی ہوئی تھی کہ اسے وہ کچن کے کھلے دروازے سے اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کے منہ سے بلند و بالا چیخ بلند ہونے کو تھی کہ نو وارد نے اس کا ارادہ جان کر فوراً سے پیشتر اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہونٹوں پر جما دیا۔

"چور، چور......" چیخ زیحیا کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔

"خبردار! آواز مت نکالنا۔"

کچن کے کھلے دروازے سے آتی چاندنی کا راستہ روکے وہ اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ جمائے کرختگی سے بولا تھا۔ زیحیا کی حالت غیر ہونے لگی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں ایک سے بڑھ کر ایک دل دہلا دینے والا خیال اس کے دماغ کی چولیں ہلا گیا تھا۔

اگر وہ کوئی چور اچکا تھا تو کیا چوری کرنے سے پہلے پیٹ پوجا کرنے کے لیے کچن میں چلا آیا تھا۔ یا پھر رات کے اس پہر کچن میں کسی کی موجودگی کا احساس اسے یہاں کھینچ لایا تھا اور اس کے بعد......

اس کے حواس تھوڑا بحال ہوئے تو اس نے پورا زور لگا کر خود کو اس کی آہنی گرفت سے آزاد کرنا چاہا۔

"دیکھو چلانا مت۔ میری بات سنو۔"

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا دیا تھا۔ "میں ارتضیٰ ہوں، ارتضیٰ حیدر۔"

"ہائیں؟ یہ چور ڈاکو کب سے اپنا تعارف کروانے لگے؟"

"تم کون ہو؟" اب کی بار وہ رعب داب انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ زیحیا نے تھوک نگلا۔

"دیکھو تم نے چوری کرنے کے لیے بہت غلط گھر کا انتخاب کیا ہے۔ ہم بہت سفید پوش قسم کے لوگ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غریب سمجھ لو۔ یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔" ڈرتے ڈرتے ہی سہی اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا تھا۔

"اوئے پاگل! میں ارتضیٰ ہوں اور یہ میرا گھر ہے۔"

اس نے میرا پر زور دیا تھا۔ اور زیحیا بی بی کی نہ صرف آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں بلکہ اسی وقت دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

☆☆☆

"اوہ خدایا! یہ میں کیسے بھول گئی کہ خالہ کا ایک عدد بیٹا بھی تو ہے۔ خالہ کا جب بھی فون آتا ان کی باتوں میں اکثر ارتضیٰ کا ذکر نکل آتا۔ دادا نے بھی تو کئی بار اسے بطور خاص انسپکٹر ارتضیٰ حیدر کی شجاعت اور دلیری کے کئی کارنامے سنائے تھے۔

اسے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی خالہ کے ہونہار سپوت نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کہاں کہاں اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ اگر دلچسپی لی ہوتی تو آج اس قدر شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

وہ انگلیاں مروڑتی ثمن کے کمرے میں آ گئی تھی۔ جو ابھی تک بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ زیحیا خاموشی سے آ کر سیدھی لیٹ گئی۔ باقی کی رات آنکھوں میں ہی کٹی تھی۔

رت جگے سے گلابی پڑتی آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مارنے کے بعد بھی وہ ناشتے کے لیے باہر جانے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی تھی۔ جب

ثمن دوسری بار بلانے آئی تو وہ انگلیاں چٹخاتی باہر آ گئی تھی۔

سامنے ہی وہ شیریں خالہ کے ساتھ بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ خالہ نے تیز معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ وہ کنفیوژ سی ہوتی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"ارتضیٰ! تم زینیا سے ملے؟" جوس کا جگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے شیریں خالہ نے ارتضیٰ سے پوچھا۔

"ہوں۔" وہ مختصر جواب دیتا بنا اس پر نگاہ غلط ڈالے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

زینیا کو اس وقت اس کا روکھا پھیکا ہوں غنیمت لگا تھا۔ اگر جو وہ گزری رات کی تفصیل سنانے بیٹھ جاتا تو.....

اس تو کے آگے زینیا نے مزید کچھ سوچا ہی نہیں گیا اس نے جلدی سے جوس کا گلاس لبوں سے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

ثمن اسے اپنی شاپنگ دکھانے کے لیے کمرے میں لے گئی تھی۔ اس کے انداز سے لگتا نہیں تھا کہ وہ زینیا سے پہلی بار ملی ہے۔ اس کا انداز اتنا بے تکلف اور دوستانہ تھا کہ زینیا کا کھویا ہوا اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا تھا۔ اس نے ثمن کی ہر چیز کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔

وہ باہر آئی تو خالہ صوفے پر کسی سوچ میں گم بیٹھی تھیں۔

"کوئی کام ہے تو بتائیں خالہ؟"

"باقی سب کچھ تو ہو گیا ہے بیٹا! بس یہ گھر کی سیٹنگ ذرا بدلنی ہے۔ تاکہ مہمانوں کے لیے زیادہ گنجائش نکل آئے۔ اس جوڑوں کے درد نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بوا بے چاری کو کچن کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ سچ کہوں تو ثمن خود ہی سب کچھ سنبھالتی پھر رہی ہے۔"

انہوں نے محبت لٹاتی نگاہوں سے ثمن کی طرف دیکھا جو چند دنوں کی مہمان تھی اس گھر میں۔

"اس میں کیا مضائقہ ہے امی؟ اب وہ والے زمانے گزر گئے جب دلہن بے چاری کو مایوں کے نام پر آٹھ، آٹھ دن پہلے کمرے کے ایک کونے میں بٹھا دیا جاتا تھا۔" ثمن ہنستے ہوئے بولی۔

"اب میں آ گئی ہوں نا تو اب تم خود کو وہی پرانے زمانے والی دلہن ہی سمجھو۔ باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گی۔"

اس نے کہنے کے ساتھ ہی کمر باندھ لی تھی۔ جھاڑو اٹھا کر گھر کا کونا کونا جھاڑ پونچھ کر چمکا دیا۔ بوا کے ساتھ مل کر کچن میں شادی کے دوران استعمال میں آنے والے برتن وغیرہ سیٹ کر کے رکھے۔

ارتضیٰ کے استری شدہ کپڑے اس کے کمرے میں رکھنے کے لیے آئی تو سوٹ الماری میں ہینگ کرنے کے بعد یونہی ریک میں ترتیب سے رکھی قانون کی ضخیم کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ شیلف پر سجے اعزازی تمغے، فریم شدہ اسناد......

وہ ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھ رہی تھی کہ وہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

"ہاؤ ڈیئر یو؟"

اس اچانک افتاد پر زینیا کے منہ سے چیخ بلند ہوئی اور ہاتھ سے کرسٹل کا واز گر کر کئی کرچیوں میں بٹ گیا تھا۔ ارتضیٰ کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

"ال مینرڈ لڑکی! تمہاری جرأت کیسے ہوئی میری چیزوں کو بغیر اجازت ہاتھ لگانے کی؟"

"وہ...... میں، میں یونہی...... ایم سوری۔"

زینیا اس کے غصے سے خائف ہوتی بس یہی کہہ پائی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔"

وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ اہانت کے احساس سے اس کا چہرہ جلنے لگا تھا۔ شور کی آواز سن کر شیریں خالہ اور ثمن ایک ساتھ اندر آئی تھیں۔

اندر کی صورت حال سمجھنے میں انہیں محض لمحہ ہی لگا تھا۔

"یہ کیا طریقہ ہے ارتضیٰ؟"
خالہ نے سخت خفا لہجے میں اسے تنبیہ کی تو وہ غصے سے سر جھٹکتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ زیجا گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی تھی۔
"حد کرتا ہے یہ لڑکا۔ گھر کو بھی اپنا تھانہ سمجھ لیا ہے۔" خالہ کو حقیقتاً ارتضیٰ کے رویے سے بہت دکھ ہوا تھا۔ "بچی بے چاری کو رلا دیا۔"
ان کی معذرت اور شرمندگی زیجا کو شرمندہ کرنے لگی تھیں۔
"غلطی میری ہے خالہ! مجھے بنا اجازت ان کی چیزوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ ایسے ہی ری ایکٹ کرتا۔"
اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ خالہ اس کا رخسار تھپتھپا کر باہر چلی گئی تھیں۔
وہ ثمن کی ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔
"اصل میں ارتضیٰ بھائی کا مزاج شروع سے ہی سنجیدہ اور ریزرو قسم کا ہے۔ اوپر سے جاب بھی ایسی ملی ہے۔ سونے پر سہاگا۔ سارا دن تھانہ، کچہری، مجرم، سزائیں۔
لیکن اندر سے بہت سوفٹ ہیں۔ انہیں بس بے ترتیبی، شور شرابہ، بے احتیاطی پسند نہیں ہے۔ یقین کرو بوا کے ساتھ ان کی ایک بیٹی ہمارے ہاں صفائی وغیرہ کرنے آتی تھی۔ اسے چھپکلیوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ جہاں کوئی چھپکلی دیکھتی زوردار چیخ مارتی۔ ارتضیٰ بھائی کے ہاتھوں اس کی ایسی شامت آتی کہ بے چاری کی حالت دیکھنے لائق ہوتی۔ آخر میں اس نے یہاں کام کرنا ہی چھوڑ دیا۔"
ثمن ہنستے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔ زیجا نے سوچا یہ جرم تو اس سے بھی سرزد ہو چکا ہے۔
☆☆☆
"تم شادی پر کیا پہنو گی زیجا؟"
ثمن کے پوچھنے پر وہ جو الماری میں اپنے کپڑے رکھ رہی تھی پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس نے کبھی ریشمی، جھلملاتے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ ہمیشہ آرام دہ شلوار قمیص پر ہم رنگ دوپٹہ لیتی۔ اپنے تئیں اس نے یہاں آتے وقت اپنے چند خاص جوڑے بیگ میں رکھے تھے لیکن وہ بھی شادی کی تقریبات میں پہنے جانے کے قابل نہیں تھے۔
"میرے پاس تو یہی سوٹ ہیں بس۔"
قدرے آہستگی سے وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔
"ارے نہیں، میں ان کی بات نہیں کر رہی۔ ہم آج شاپنگ پر چل رہے ہیں نا تو اسی لیے پوچھ رہی ہوں۔ میرے خیال میں تو مہندی کے لیے چوڑی دار پاجامے پر لانگ شرٹ، بارات پر فراک یا میکسی اور ولیمے کے لیے کوئی اچھا سا ایمبرائیڈڈ سوٹ ٹھیک رہے گا ہے نا؟"
زیجا نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔
"میں نے یہ سب کبھی نہیں پہنا۔"
"کوئی بات نہیں ہم زندگی میں بہت کچھ پہلی بار ہی کرتے ہیں۔"
ثمن اس کے انکار کو کسی خاطر میں نہیں لائی تھی۔ اس کی اور خالہ کی محبتیں زیجا کو زیر بار کر رہی تھیں۔
اس کے لیے شاپنگ ہمیشہ بیجی خود ہی کرتی تھیں مناسب کوالٹی کے معمولی پرنٹ کے ہر سیزن کے دو تین جوڑے۔
البتہ اپنی ساری شاپنگ وہ تب کرتی تھیں جب مشی چھٹیوں پر گھر آئی ہوئی ہوتی۔ دونوں ماں بیٹی کے روز بازار کے چکر لگتے۔ واپسی ڈھیر سارے شاپنگ بیگز کے ہمراہ ہوتی۔ مشی کا موڈ ہوتا تو کبھی اس کے لیے فینسی چپل، کبھی سوئٹر تو کبھی کوئی کڑھائی والا کرتا شلوار لیتی آتی۔ اور بیجی اگلے کئی دنوں تک ہر آئے گئے کے سامنے اس برانڈڈ شاپنگ کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتیں۔
شیریں خالہ نے اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود شادی کے تمام فنکشنز کے لیے اس کے لیے بے حد قیمتی اور خوب صورت ملبوسات خریدے بلکہ بہت عمدہ کوالٹی کے کھلتے ہوئے رنگوں کے عام پہننے

Scanned with CamScanner

کے سوٹ بھی خرید لیے۔ میچنگ جوتے، چوڑیاں، جیولری اور بھی نجانے کیا کچھ۔ اس کی ساری شاپنگ کے دوران ثمن کی ایکسائٹمنٹ عروج پر تھی۔

تو زندگی کا ایک رنگ یہ بھی ہے! شہر کے بہترین مال کی برقی سیڑھیاں اترتے زحیا نے سوچا۔

☆☆☆

دادا سے بات کرنے کے لیے وہ موبائل اٹھائے چھت پر آگئی تھی۔

آسمان پر ٹکے ڈھیر سارے ستاروں کی جھرمٹ تلے کھڑی وہ ریلنگ سے نیچے گزرتی ٹریفک دیکھ رہی تھی۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"بہت خوش ہوں، مزے میں ہوں۔ آزادی کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ ہر وقت ملک الموت کی طرح سر پر سوار ہونے کے لیے تم جو نہیں ہو۔"

"آپ میرے بغیر خوش ہیں؟" اس نے دل مسوس کر پوچھا۔

"کوئی ایسا ویسا۔"

دادا کے لہجے میں ایسی ترنگ پہلے تو کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اس کھنکتے ہوئے لہجے میں چھپے مصنوعی پن کو کھوجنا چاہا جبکہ دوسری طرف دادا اسی خوش باش انداز میں اسے وہاں بہت سارا انجوائے کرنے کی ترغیب دلاتے کہہ رہے تھے زندگی میں ایسے مواقع بار بار نہیں ملتے اور بھی اسی طرح کی ہدایات۔

وہ فون بند کر کے پلٹی تو بے ساختہ منہ سے چیخ نکل گئی۔ ارتضیٰ اپنی دھن میں سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا تھا۔

"پھر چیخیں تم؟"

ناگواری سے ماتھے پر بل لیے کسی تفتیشی افسر کی مانند وہ اس کے سر پر کھڑا گھورنے لگا۔

"اب اگر تم چیخیں تو سچ مچ جیل میں ڈال دوں گا۔"

ایک تو اس کی رعب داب والی شخصیت اوپر سے ایسا انداز۔

"میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ ہو جاتا ہے ایسا آپ کو یوں ہر دفعہ غیر معمولی سچوئشن میں اپنے سامنے دیکھ کر......"

"اسٹوپڈ!" ارتضیٰ سر جھٹکتا ریلنگ کی طرف بڑھا تو اس نے سرپٹ سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔

"یہ اتنے خوفناک کیوں ہیں؟" کمرے میں آتے ہی پھولی سانسوں سے پوچھا۔

ثمن نے موبائل سے نگاہ ہٹا کر اس کا گھبرایا ہوا چہرہ دیکھا۔ "کون؟"

"انسپکٹر صاحب اور کون بھلا جو ہر وقت آن ڈیوٹی ہی رہتے ہیں۔" تروٹھے پن سے بولتی وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"ارتضیٰ بھائی؟" ثمن کو ہنسی آگئی۔ "کچھ کہا انہوں نے؟"

"وہ کچھ کہتے تھوڑی ہیں۔" زحیا منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "آنکھوں سے نگل لیتے ہیں سالم۔"

ثمن زور سے ہنس پڑی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ اتنی معصومیت سے بولی تھی کہ ثمن کو بے اختیار اس پر پیار آگیا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز ثمن کو مایوں بٹھا دیا گیا۔

شیریں خالہ کے سسرالی عزیزوں سے بھری ایک ہائی ایس دروازے پر آرکی تھی۔ ثمن کے تایا، تائی، پھوپھیاں اور ڈھیر سارے کزنز۔ گھر میں جیسے ہلچل سی مچ گئی تھی۔ خالہ سب سے بہت تپاک سے ملیں، شوہر کی وفات کے بعد بھی انہوں نے اپنے سسرالیوں سے مثالی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ اس میں بھی بڑا ہاتھ ان کی خوش اخلاقی اور ملنسار طبیعت کا تھا۔

"یہ کون ہے؟" نظر کا موٹا چشمہ چڑھائے ان کی پھوپھی ساس کی نظروں نے فوراً زحیا کو تاڑ لیا

تھا۔

"یہ زینیا ہے میری بھانجی۔"

خالہ نے محبت سے اس کی طرف دیکھا جو سب کی نظریں اپنی طرف پڑتی دیکھ کر کنفیوز سی ہو گئی تھی۔

"پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔" بڑی نند نے سرتاپیر بغور اس کا جائزہ لیا۔

"ہاں پہلی بار یہاں آئی ہے۔" خالہ نے تحمل سے جواب دیا۔

"اچھا......اچھا زریں کی بیٹی ہے۔ ارے وہی جس کے میاں نے بیوی کے سوئم کے بعد ہی امریکہ میں دوسری شادی کرلی تھی۔"

کمن کی تائی غضب کی یادداشت رکھتی تھیں اور یہ کوئی اتنی پرانی بات بھی نہیں تھی۔ یہی کوئی بیس برس پہلے......

"حق ہا بے چاری کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ شوہر نے کمپنی کے مالک کی بیٹی سے بیاہ رچا لیا۔" ایک اور افسردہ آہ ابھری گئی۔

زینیا نے بے ساختہ اپنا نچلا لب ہونٹوں تلے دبایا تھا۔ اسے اپنا یہ تعارف ہمیشہ یونہی اندر سے کھوکھلا کر دیتا تھا۔ وہ بھربھری مٹی کی طرح ڈھے جانے کے خوف سے اپنے قدموں کو مضبوطی سے زمین پر جمائے کھڑی تھی۔

"چہ چہ تب یہ بچی بیچاری تو بمشکل دو ڈھائی سال کی ہی ہوگی۔ اب کہاں پر ہوتی ہو بیٹا آپ؟"

"دادا اور چچا کے پاس۔"

اس نے بنا کسی کی طرف دیکھے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

"باپ کوئی خرچا وغیرہ بھیجتا ہے یا پھر سارا کچھ اس دوسری پر لٹا رہا ہے؟ سنا ہے وہاں سے بھی اس کے بچے ہوئے ہیں۔ خیر سے کتنے ہیں؟"

ایسی کرید، ایسا تجسس......زینیا کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہونے لگا تھا۔

جب خالہ نے اس کی مشکل آسان کی۔

"زینیا! جاؤ بیٹے کچن میں دیکھو بوا نے چائے بنالی ہے یا نہیں؟"

وہ فوراً لاؤنج سے نکل کر کچن میں آ گئی تھی۔

"خدا کی مار! مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا شیریں کا یہ خاندان۔ میرے بس میں ہو تو ان کا واپسی کا کرایہ اپنی جیب سے بھر کر اسی ویگن پر دوبارہ آج ہی واپس روانہ کر دوں۔" بوا بڑبڑاتے ہوئے چائے کپوں میں ڈال رہی تھیں۔

☆☆☆

ہم جانتے ہیں تم ہمیں ناشاد کرو گے
توڑو گے ہمارا دل ہمیں برباد کرو گے
نہ درد کی زنجیر سے آزاد کرو گے
دل پھر بھی تمہیں دیتے ہیں
کیا یاد کرو گے؟ کیا یاد کرو گے؟

کمن کی تایا زاد بہن روحا نے اسٹریو سسٹم کا ریموٹ اٹھا کر والیم فل کر دیا تھا۔ ذیشان اور کرن ڈانس پریکٹس کر رہے تھے۔ زینیا کمن کے لیے گجرے بنانے صحن میں اگے باغیچے سے گلاب اور موتیا کے پھول توڑ کر اپنی جھولی میں بھر رہی تھی کہ اچانک نظر دیوار پر بیٹھی بلی پر پڑی جو امرود کی شاخوں پر بنے گھونسلے میں بیٹھی بلبل اور اس کے ننھے منے بچوں پر گھات لگائے بیٹھی تھی۔

خطرہ محسوس کر کے بلبل نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

"ہش!" اس سے پہلے کہ وہ بلی کو بھگاتی بلی نے دیوار سے امرود کے درخت پر چھلانگ لگا دی۔ زینیا کے ہاتھ سے پلو چھوٹ گیا تھا۔ زوردار چیخ کی آواز پر بلی فوراً گھبرا کر دیوار پر چھلانگ لگاتی دوسری طرف کود گئی تھی۔

بلبل نے ایک دم چپ سادھ لی۔ لیکن زینیا کی سکون بھری سانس آدھی سینے میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔

"سلی گرل!" زینیا نیچے چھوٹی چھوٹی تراشیدہ گھاس پر گرے گلاب اور موتیے کے پھول چنتی پھر سے دوپٹے کے پلو میں ڈالتی جا رہی تھی۔ جب وہ اس

کے قریب بیٹھا پھول چننے لگا۔

"یہ چٹکیں مارنا تمہارا شوق ہے یا عادت؟"

اس کے جھکے سر کو دیکھتا وہ پوچھ رہا تھا۔ گلاب اور موتیا کی خوشبو میں مدغم ہوتی۔ اس بے حد قریب بیٹھے شخص کے کلون کی مہک زیبا کے حواس مختل کرنے لگی تھی۔ اسے اپنا دل ہتھیلیوں میں دھڑکتا محسوس ہوا۔ دوپٹے کا پلو تھامے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

دل پھر بھی تمہیں دیتے ہیں۔

کیا یاد کرو گے۔ کیا یاد کرو گے؟

ریکارڈر کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ اس کے پلو سے ایک گلاب نکل کر ارتضی کے قدموں کے پاس گرا تھا۔ وہ بازو پھلانگتی اندرونی حصے کی طرف بھاگ گئی۔

☆☆☆

الوشے نے بیوٹیشن کا کورس کر رکھا تھا۔ ثمن کو ہلکا پھلکا تیار کرنے کے بعد باری باری سب کو تیار کرنے لگی۔ ٹی پنک کلر کا فراک پہنے زیبا بھی جھجکتے ہوئے اس کے سامنے کرسی پر آ بیٹھی تھی۔

"او مائی گاڈ! شی از سو چھ پریٹی یار!"

اس کی نوک پلک سنوارتی الوشے کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ سب کی ستائشی نگاہیں اس کی جانب اٹھی تھیں۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔ دوپٹہ ایک کندھے پر سیٹ کیے دوسرے کندھے پر بالوں کو سمیٹ کر ڈالا ہوا تھا۔ گلابی ستاروں والا کھسہ پہن کر وہ باہر آ گئی تھی۔ خالہ نے دور سے ہی مسکراتے ہوئے اس کی دل ہی دل میں نظر اتاری تھی۔

وہ پہلی بار اتنے بھرپور طریقے سے تیار ہوئی تھی۔ بے ساختہ دل چاہا اپنی ایک تصویر کھنچوا کر دادا کو واٹس ایپ کر دے۔ اس نے چاروں اور نگاہیں دوڑائیں۔

"بات سنیں!"

اس نے پاس سے گزرتے ثمن کے پھوپھی زاد غفران کو آواز دی تو وہ رک کر پلٹا۔

"میری ایک پک بنا دیں گے پلیز؟"

"شیور؟" وہ بھرپور طریقے سے مسکرایا تھا۔

زیبا نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا اور خود قدرے فاصلے پر پوز بنا کر کھڑی ہو گئی۔

اسٹیج کی لائٹنگ کا کام مکمل کرواتے ارتضی کی اس پر نظر پڑی تو لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسرے لمحے اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"غفران! موبائل مجھے دو۔"

بھاری آواز میں غفران سے کہا تو وہ موبائل اس کے ہاتھ پر رکھ کر خود آگے بڑھ گیا تھا۔

"پک بنوانے کے لیے تمہیں اس پوری تقریب میں صرف یہ گھونچو ہی ملا تھا؟" زیبا کی سمجھ میں نہیں آیا آخر وہ اس پر اتنا رعب کس خوشی میں جما رہا ہے۔

"میں نے دادا کو اپنی پک بھیجنی تھی۔" زیبا نے نروٹھے پن سے کہا۔

"تو محترمہ! آپ کے موبائل میں ایک عدد سیلفی کیمرہ بھی ہے۔ بنا کسی کو زحمت دیے اپنی سویٹ سیلفی بنا کر سویٹ سے دادا کو بھیج دیں۔"

موبائل اس کے ہاتھ میں تھما کر چبا چبا کہتا وہ باہر چلا گیا تھا۔ اس کے منہ پر بہت کچھ کہنے کی حسرت زیبا کے دل میں ہی رہ گئی۔

ستاروں والی زرد جھلملاتی چادر کی چھاؤں تلے ثمن کو اسٹیج کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

فنکشن ختم ہونے کے بعد بوا نے سب کے لیے چائے بناتے ہوئے بڑا سا پتیلا چولہے پر چڑھا دیا تھا۔

"اف خدایا! اس سے زیادہ بدمزہ چائے شاید ہی بوا نے کبھی زندگی میں بنائی ہو؟"

پھولوں کا زیور اتار کر احتیاط سے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتی ثمن نے بمشکل ایک گھونٹ پی کر کپ واپس رکھ دیا تھا۔

"میں تمہارے لیے اچھی سی اسٹرانگ چائے بنا

کرلے آؤں؟"
زینیا کے پوچھنے پر ثمن مسکرائی۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ؟"
زینیا کاؤچ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ باقی سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ رات کی خاموشی میں برآمدے سے تھوڑا آگے نکل کر ارتضیٰ کی مدہم آواز گونج رہی تھی۔ اس کی جانب پشت کیے وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔
"حوالات میں ڈال دو حرام خور کو۔ اور سنو جب تک میں نہ آجاؤں انکوائری شروع مت کرنا۔"
زینیا نے جھرجھری سے لیتے ہوئے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔
"کیا ہوا؟" بستر پر نیم دراز ہوتی ثمن نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"مجھے سچ میں بڑا ترس آ رہا ہے ان بیچاروں پر۔"
"کن بیچاروں پر؟" ثمن کو کچھ سمجھ نہ آئی۔
"وہی جو تمہارے بھائی کے ہتھے چڑھتے ہوں گے۔ مجھے تو لگتا ہے مجرموں پر انہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہوگی۔ ان کی دہشت سے ہی وہ اگلا پچھلا سب اگل کر بڑے آرام سے اقبال جرم کرلیتے ہوں گے۔"
ثمن ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔ "باہر ارتضیٰ بھائی تھے؟"
زینیا نے سر ہلایا۔
"تو اس کا مطلب ہے میں اچھی سی اسٹرانگ چائے کو بھی بھول جاؤں؟"
وہ معصوم شکل بنا کر پوچھ رہی تھی۔
"بالکل!" زینیا نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلایا۔ ثمن نے گہری سانس بھرتے موبائل اٹھا لیا۔ جس کی اسکرین پر مسلسل "شہریار کالنگ" چمک رہا تھا۔ شہریار مسعود جو بہت جلد اس کے فیانسی سے شوہر نامدار کے عہدے پر فائز ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"شیریں! اب تو ثمن خیر سے اپنے گھر کی ہونے والی ہے۔ تم ارتضیٰ کی بھی دلہن لے آؤ۔ ورنہ ایسا اتنا بڑا گھر کیسے سنبھالو گی؟"
شیریں خالہ کی جٹھانی نسیم ہمیشہ موقع محل دیکھے بغیر بات کرنے کی عادی تھیں۔ اب بھی گھر میں ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی۔ آج لڑکے والوں نے مہندی لے کر آنا تھا۔ شیریں خالہ نے ہاتھ میں تہہ شدہ ارتضیٰ کا سوٹ زینیا کو دیا کہ استری کرکے اس کے کمرے میں رکھ دے۔
"جی آپا! میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے۔"
"تو پھر کوئی لڑکی ہے ذہن میں؟" بڑی نند خورشید بھی قریب کھسک آئی تھیں۔
"بھئی پہلا حق تو اپنوں کا ہی ہوتا ہے۔ ارتضیٰ ہمارے مرحوم دیور کی نشانی ہے۔ وقار تو شروع سے ہی جان چھڑکتے ہیں اپنے بھتیجے پر......"
ماں کی بات پر روحا کے چہرے پر مغرورانہ سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ اس نے اپنے لائف پارٹنر کے روپ میں ہمیشہ ارتضیٰ جیسے شان دار انسان کو ہی سوچا تھا۔
"خیر کم عزیز تو ارتضیٰ مجھے بھی نہیں ہے۔ اپنی گودوں میں کھلایا ہے اسے۔ اب جوان جہان گھبرو بھتیجے کو دیکھ کر میرا تو سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔"
خورشید پھوپھو نے کہنے کے ساتھ ہی چپکے سے نمرہ کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اٹھی تھی اور زینیا کے ہاتھ سے ارتضیٰ کا سوٹ لے لیا۔
"لاؤ مجھے دو میں استری کرکے رکھ دوں گی اس کے روم میں۔"
زینیا کے تو دل کی مراد بر آئی تھی۔ فوراً سوٹ اسے تھما دیا۔ خالہ کو وہ انکار نہیں کرسکتی تھی لیکن اس جنگجو کے کمرے میں جانا بھی اس کے لیے کسی بڑے معرکے کو سر کرنے سے کم نہیں تھا۔
مہندی کا فنکشن عروج پر تھا۔
وہ ارتضیٰ اور نگینہ لوگوں کے ساتھ مل کر مہندی کی تھال میں لگی موم بتیوں کو روشن کرنے لگی۔

Scanned with CamScanner

گیندے کے پھولوں سے سجے جھولے پر بیٹھی ثمن کے آگے دولہا کی بہنوں اور کزنز نے گول دائرے کی صورت مہندی کی تھالیاں رکھ دی تھیں۔

برقی قمقموں سے پھوٹتی رنگ برنگ روشنیوں نے رات کے اس پہر دن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ابٹن اور مہندی کی ملی جلی خوشبو میں بکھرے بے فکر قہقہے، شرمیلی مسکراہٹیں، چوڑیوں کی جھنکار رنگین لہراتے آنچل...... سب کچھ بہت خوب صورت اور رومان پرور تھا۔

گولڈن چوڑی دار پاجامے پر سرخ شیفون کی لانگ شرٹ پہنے زجیا دونوں کلائیوں میں سرخ کانچ کی چوڑیاں بھر بھر کر پہنے زور زور سے تالیاں پیٹ رہی تھی۔

تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے
کیا چیز ہو تم، خود تمہیں معلوم نہیں ہے!

محض لمحوں کا کھیل تھا۔ ارتضیٰ نے دیکھا۔ روحا کے آنکھ کے اشارے پر نمرہ نے زجیا کے دوپٹے کا نیچے گرا پلو اٹھا کر جلتی موم بتیوں پر ڈال دیا ریشمی دوپٹے نے فوراً آگ کو پکڑ لیا تھا۔ پنڈال میں ایک ساتھ بہت ساری آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ ارتضیٰ نے بھاگتے قدموں کے ساتھ درمیانی فاصلہ عبور کیا تھا۔ وہ جو وحشت زدہ سی اپنے دوپٹے سے لپٹتے آگ کے شعلے دیکھ کر گنگ کھڑی تھی۔ مارے خوف کے چیخ بھی نہ سکی۔

ارتضیٰ نے اس کو کلائی سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کا دوپٹہ اتار کر پھینکا تھا۔ ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ کر نیچے گری تھیں۔

"ریلیکس زجیا! کچھ نہیں ہوا۔"

سپید پڑتا چہرہ لیے زجیا نے خوف اور وحشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "تم ٹھیک ہو زجیا؟"

شیریں خالہ مجمع کو چیرتی ہوئی آگے آئی تھیں۔ زجیا کو سینے سے لگا لیا۔ ثمن جھولا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اندر چلو زجیا۔" زرد دوپٹہ سر پر لٹکائے وہ اس وقت سب کچھ بھول بھال کر زجیا کو اندر کمرے میں لے گئی تھی۔

"ہائے ربا! ارتضیٰ کے دونوں ہاتھ جل گئے۔" تائی اور پھوپھو ایک ساتھ اس کی طرف بڑھی تھیں۔ بنا کچھ سوچے سمجھے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے زجیا کی قمیص کے پچھلے حصے پر لگی آگ بجھانا شروع کر دی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں پلیز۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر لیے تھے جہاں اس وقت کلائیوں تک شدید جلن محسوس ہو رہی تھی۔ پنڈال سے باہر جاتے ہوئے وہ نمرہ اور روحا کے قریب رکا تھا۔

"کسی انسان کی جان اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے اپنی فضول کی تفریح اور ایڈونچر کی نظر کر دیا جائے۔" چبھتے ہوئے لہجے میں کہتا وہ باہر نکل گیا تھا۔

نمرہ اور روحا کی "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والی حالت ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں عبدالحئی صاحب کو کیا منہ دکھاتی کہ میں ان کی پوتی کا خیال نہیں رکھ سکی۔"

شیریں خالہ اس کے صدقے کے پیسے دے کر واپس کمرے میں آئیں تو اسے اپنے ساتھ لپٹا کر رو پڑی تھیں۔ ثمن الگ افسردہ سی بیٹھی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں خالہ! وہ صرف ایک حادثہ تھا اور حادثہ تو کسی کے ساتھ کہیں بھی ہو سکتا ہے آپ پلیز پریشان مت ہوں۔"

اسے اپنے لیے خالہ اور ثمن کا یوں شرمندہ ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی ان چند دنوں میں جتنی اپنائیت اور مان ان دونوں نے اسے دیا تھا وہ اس کی امید اور توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا۔

آج ثمن کا نکاح اور رخصتی تھی۔ اس نے

تیار ہونے کے لیے پارلر جانا تھا۔
زیتا احتیاط سے اس کی تمام اشیاء بیگ میں رکھنے لگی جو پارلر ساتھ لے کر جانی تھیں۔ دل نہ چاہنے کے باوجود بھی اس نے پرپل کلر کا خوب صورت کڑھائی والا شلوار قمیص پہنا۔ خالہ کی خوشی اور طمانیت کے لیے ہلکی پھلکی تیار بھی ہوگئی۔
وہ ثمن کا بھاری کام دار لہنگا اٹھائے اسے اسٹیج کی طرف لے جا رہی تھی جب بے حد اسٹائلش سی روحا نے چبھتی ہوئی نظر اس کی پشت پر ڈالی۔ کل جو کچھ ہوا تھا ارتضیٰ کا اتنا شدید ردعمل اسے عدم تحفظ میں مبتلا کر گیا تھا۔
ورنہ وہ ہمیشہ سے یہی سمجھتی آئی تھی وہ ارتضیٰ کو بلا مقابلہ جیت چکی ہے۔ نمرہ کو وہ کسی گنتی میں شمار نہیں کرتی تھی۔ معمولی نقوش کی حامل پڑھاکو، چشماٹو نمرہ اس قابل کہاں تھی کہ ارتضیٰ جیسے شان دار انسان کی ہمراہی کے خواب دیکھتی۔ خورشید پھوپھو کی ساری خوش فہمی یقیناً دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔
لیکن اب یہ زیتا۔
روحا کی متلاشی نگاہوں نے ارتضیٰ کو کھوجا لیکن وہ شاید باہر بیرونی دالانے میں تھا۔ ڈھول باجوں کے ساتھ بارات آ گئی تھی۔ ثمن کے پہلو میں شہریار کو بٹھا کر اب نکاح کے بعد کی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔
تب ہی زیتا نے اسے دیکھا۔ شلوار قمیص میں ملبوس مغرور نقوش والا ارتضیٰ اسٹیج پر چڑھ رہا تھا۔ زیتا خاموشی سے نیچے اتر آئی اور قدرے فاصلے پر بچھائی گئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ ارتضیٰ کے ہاتھ جل جانے کی خبر اس تک بھی پہنچی تھی۔
دل مضطر کو سنبھالنا دشوار ہونے لگا تھا۔ ایک نامعلوم سی بے چینی تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ارتضیٰ کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن نگاہ بار بار بھٹک کر اسی کی طرف اٹھ جاتی۔

☆☆☆

ثمن رخصت ہوگئی تھی۔
اس کے جاتے ہی ساری رونق دم توڑ گئی۔ درو دیوار سے لپٹتی خاموشی میں اداسیاں گھلنے لگی تھیں۔
"خالہ! میں آج آپ کے پاس سو جاؤں؟"
دروازے پر کھڑی وہ پوچھ رہی تھی۔
"کیوں نہیں میری جان؟" خالہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائیں۔
وہ ان کے برابر بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
"تم ٹھیک ہو زیتا؟"
اس کا دل چاہا کلر برش اٹھا کر اس سارے منظر پر پھیر دے جو اس کے تصور میں چھم سے آباد ہو گیا تھا۔
"ریلیکس زیتا! کچھ نہیں ہوا۔" اس نے بے بسی سے سر تکیے پر گرا دیا تھا۔ دل آج جس ڈگر پر چل پڑا تھا اس کے قدموں کی چاپ اسے اندر سے ستانے لگی تھی۔
"مجھے گھر جانا ہے خالہ! دادا کی بہت یاد آ رہی ہے۔" رت جگے سے گلابی پڑتی آنکھوں میں بھرتا پانی چھلکنے سے روکنے کے لیے وہ زور زور سے پلکیں جھپکاتی سر جھکا گئی تھی۔
"اتنی جلدی کیوں بیٹے؟ ابھی تو ولیمہ ہونا ہے۔ ارتضیٰ خود تمہیں چھوڑ آئے گا۔" اس نے گھبرا کر سر اوپر اٹھایا تھا۔
"نہیں...... نہیں خالہ! میں آئی بھی تو بس رکی تھی نا۔ تو آسانی سے چلی جاؤں گی۔ آپ انہیں بالکل زحمت مت دیں پلیز......"
وہ خالہ کو کیسے سمجھاتی کہ دوبارہ ان آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہیں ہے اس کے اندر۔ بالکل بھی نہیں۔

☆☆☆

"پچھلے کچھ دنوں سے معدے میں مسلسل درد رہنے لگا ہے۔ میں نے کہا بھی تھا آج کچھ ہلکا پھلکا بنا لیتیں۔"
آدھی کچی آدھی پکی تیز مرچ مسالے والی ماش کی دال دیکھ کر دادا نے کہا تو پھپھی فوراً چمک کر بولیں۔

"اتنا فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس کہ آپ کے فرمائشی پروگرام سنوں اور انہیں پورا بھی کروں۔ اور بھی ہزار کام کرنے ہوتے ہیں مجھے......"

دادا نے گہری سانس بھرتے رکابی اپنے سامنے کھسکائی۔ تب ہی نظر کچن کے دروازے پر فریم کی مانند ایستادہ زجیا پر پڑی تھی۔ فریم کے چوکھٹے میں جڑی تصویر پر دکھ، تاسف اور ڈھیر سارا ملال بکھرا ہوا تھا۔

تو یہ تھے وہ مزے جو وہ اس کے بغیر کر رہے تھے۔ جس کا احوال وہ اسے روز فون پر بڑے زور و شور سے سناتے۔ دادا نگاہ چرا گئے۔

"آ گئیں تم؟" دادا کی سمجھ میں نہیں آیا اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر خوشی کا اظہار کریں یا خفگی کا۔

"آپ اکیلے میرے بغیر مزے کریں یہ میں کیسے برداشت کر سکتی بھلا؟"

اس نے ان کے سامنے سے رکابی اٹھالی تھی۔

"اور آپ اتنی گرمی میں کچن میں کیوں آ گئے؟"

یہ زجیا تھی جو وقت پر انہیں کھانا کرنے میں ہی پہنچاتی، اس کے جانے کے بعد جب پیٹ میں بھوک کے مارے بل پڑنے لگتے تب ناچار انہیں خود ہی کچن کا رخ کرنا پڑتا۔

سدا کی کاہل اور کام چور فیروزہ مارے باندھے جو بھی پکاتی دہیں سامنے لا کر رکھ دیتی۔

"آپ اندر جائیں دادا! میں کھانا لے کر آ رہی ہوں۔"

انہیں اٹھانے کے بعد اس نے نرم سی ذائقہ دار کھچڑی بنائی۔

"ہونہہ! ان ہی چونچلوں نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کل کو بیاہ کر چلی جاؤ گی تو مصیبت میرے سر پر۔ یہ نہیں کھانا...... وہ نہیں کھانا......"

"آپ بے فکر رہیے چچی! میں جہاں بھی جاؤں گی اپنے دادا کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

چچی یوں دل کھول کر ہنسیں جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

"لوگ جہیز میں ٹرک بھر سامان، گاڑیوں کی امید لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ زجیا بی بی اپنے ساتھ بڈھے دادا کو لے کر جائیں گی۔"

چولہے کی گرمی سے زیادہ ان کی تمسخرانہ ہنسی نے اس چھوٹے سے کچن کی دیواروں کو جھلسا دیا تھا۔

وہ بنا کوئی جواب دیے کھچڑی پلیٹ میں ڈال کر دادا کے کمرے میں چلی آئی۔

پانی کا گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھا۔

"جانتی ہو۔ میں نے تمہیں زبردستی وہاں کیوں بھیجا تھا؟"

وہ استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ جو چمچہ بھر بھر کر ایسے کھچڑی کھا رہے تھے جیسے پچھلے کئی دنوں سے بھوکے ہوں۔ زجیا نے آنسوؤں کا گولہ حلق سے نیچے اتارا تھا۔

"کیونکہ مجھے کبھی کبھی فیروزہ اور خود میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ خود غرض، مطلبی جنہوں نے اپنی اپنی غرض کے لیے تمہیں اس چار دیواری میں محصور کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک جیسے دن ایک سی راتیں ...... یکسانیت انسان کو وقت سے پہلے تھکا دیتی ہے۔ اندر سے بوڑھا اور پژمردہ کر دیتی ہے۔"

سیر شکم ہونے کے بعد انہوں نے خالی پلیٹ پرے کھسکا کر آرام سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔ زجیا یونہی ان کے بوڑھے جھریوں زدہ چہرے پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔

"تمہارے بغیر ایک ایک لمحہ گزارنا محال سہی لیکن اپنی زندگی پر تمہارا اتنا حق تو بنتا ہے کہ چند دنوں کے لیے ہی سہی اس چار دیواری سے باہر نکل کر کھل کر سانس لو، زندگی کے نئے رنگ دیکھو......"

زجیا نے خاموشی سے ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

"زندگی کے نئے رنگ بہت خوشنما سہی لیکن وہ ان آنکھوں کے لیے نا آشنا رہتے تو اچھا تھا۔"

☆☆☆

"شکر ہے بٹیا! تم واپس آ گئیں۔ ورنہ یہ گھر تو بہت جلد کباڑ خانے میں بدلنے والا تھا۔"

ضیاء چچا کو اپنی پہلے والی روٹین پر تازہ پراٹھا، آملیٹ اور چائے ناشتے میں ملی تو ان کے لہجے میں بشاشت سی اتر آئی تھی۔

چچی خوش مزاج پہلے بھی نہیں تھیں۔ لیکن سر پر پڑنے والے کاموں کے بوجھ نے مزاج میں مزید چڑچڑاپن اور جھنجلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ زریا نے واپس آ کر سب کچھ پہلے کی طرح سنبھال لیا تھا۔ الجھے تیور، بکھرے بالوں والی چچی نے بھی گویا سکھ کی سانس لی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" برتن خشک کر کے ترتیب سے ریک میں لگاتی زریا اچھل پڑی تھی۔

"ہا! ڈر گئیں؟" عقب میں خباثت سے ہنستے سلمان نے جیسے اس کی حالت سے حظ اٹھایا تھا۔

"دیکھو..... نکلو یہاں سے ورنہ میں دادا کو بلا لوں گی۔"

غیر محسوس انداز میں اس نے قدرے لاپروائی سے لیا دوپٹہ ٹھیک طرح سے اپنے گرد اوڑھ لیا تھا۔

"ہائیں کیا واقعی؟ اوہ میں تو ڈر گیا۔ یہ غضب مت کرنا۔"

ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے زریا کی دھمکی کو خوب انجوائے کیا۔

"وہ دادا بے چارے جو خود ادھار کی سانسوں پر بمشکل چل رہے ہیں تمہاری ایک پکار پر دوڑے چلے آئیں گے۔ ہے نا؟"

زریا کے پکارنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی دادا اس کے جناتی قہقہوں کی آواز سن کر از خود کچن میں چلے آئے۔ تھے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر بری طرح بھڑک گئے۔ چچی اس شور شرابے پر افتاں و خیزاں بھاگتی چلی آئی تھیں۔

"آج میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اپنے ہاتھوں سے گولی اس کے سینے میں اتاروں گا۔" دادا کو بروقت اپنی تاریخی بندوق کا خیال آیا تھا۔

"چلیے دادا! پلیز۔" ان کے ہچکولے کھاتے وجود کو زریا نے بمشکل تھام رکھا تھا۔

چچی نے مزید سیاپا ڈال دیا۔ بات بننے کے بجائے زیادہ بگڑ گئی۔ ضیاء اللہ گھر آئے تو سامنے ایک تماشا ان کا منتظر تھا۔

"یہ خبیث آتا ہی کیوں ہے یہاں؟"

دادا کا غصہ کسی طور ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"دنیا جہان کے بھائی اپنی بہنوں سے ملنے ان کے گھر جاتے ہیں۔ ایسا کون سا دنیا سے انوکھا کام کر دیا ہے میرے بھائی نے جو آپ یوں آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔"

"بہن سے ملنے کے لیے آئے۔ یہاں وہاں کیوں منہ مارتا پھرتا ہے؟"

دادا پھر سے اپنی بندوق اٹھانے کے لیے لپکے تھے۔ زریا نے کندھوں پر ہاتھ سے دباؤ ڈال کر پھر سے کرسی پر بٹھا دیا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے؟"

ضیاء اللہ زچ ہوا تھے تھے۔

"ارے ہونا کیا ہے اتنی سی بات کا آپ کے ابا جی نے پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے ہی بلایا تھا سلمان کو۔ اماں کا کچھ سامان ادھر رہ گیا تھا وہ بھجوانا تھا۔ جب یہ آیا تو میں واش روم میں تھی۔ مجھے ڈھونڈتا ہوا کچن میں چلا آیا۔ سامنے زریا کھڑی تھی۔ اسی بات پر ابا جی نے اتنا شور ڈال دیا۔"

چچی نے نقطوں کو ملا کر پوری کہانی گھڑ لی تھی۔

"ابا! آپ بھی نا بس......" چچا نے سر جھٹکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"چپ کر نامراد! اگر دوبارہ وہ پہاڑی بکرا مجھے زری کے آس پاس بھی دکھائی دیا تو میں نے وہ حشر کرنا ہے کہ ساری ہیرو پنتی بھول جائے گا۔"

دادا کا سانس پھولنے لگا تھا۔ زریا نے پانی کا گلاس بھر کر ان کے لبوں سے لگایا۔ آہستہ آہستہ

Scanned with CamScanner

پشت سہلاتی انہیں پرسکون کرنے لگی۔

باہر سیڑھیوں کی اوٹ میں کھڑے سلمان پر فیروزہ بیگم دبی آواز میں برس پڑی تھیں۔

"کیا ضرورت تھی اتنا اتاؤلا پن دکھانے کی؟ تم اپنا کام خود ہی خراب کرو گے سلمان میں تمہیں بتائے دے رہی ہوں۔"

"تو اور کیا کروں آپا؟ کب سے تمہیں کہہ رہا ہوں زینی سے میری شادی کروا دو۔"

سلمان خود عاجز ہوا کھڑا تھا۔ بات زینی کو دھمکانے، ڈرانے اور اس پر استحقاق جتانے کی حد تک رہتی تو اچھا تھا۔ دادا اور چچا کا بیچ میں کود پڑنا اسے مہنگا پڑ سکتا تھا۔

"ہاں تو میں نے تم سے کہا ہے نا میں بات کروں گی ضیاء سے۔ زینی کی شادی تم سے ہی ہو گی۔ لیکن تم مجھے تھوڑا وقت دو۔ ضیاء کو راضی کروں گی تو ہی وہ سرفراز بھائی کو قائل کریں گے۔ لیکن مجھے لگتا ہے تمہاری یہ حرکتیں سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیں گی۔"

"کیا کروں آپا! اب صبر نہیں ہوتا قسم سے۔"

سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ اس انداز سے بولا تھا کہ فیروزہ دانت پیس کر رہ گئیں۔ انہیں اب جلد ہی ضیاء اللہ سے اس سلسلے میں بات کرنی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ مشی اور خانو کو اچانک سامنے دیکھ کر وہ سب کچھ بھول بھال گئیں۔

انہیں ضیاء اللہ کے ساتھ خاندان میں ایک دعوت پر جانا تھا۔ اس لیے زینیا سے کہا اپنے اور دادا کے لیے شوربے والے ٹنڈے پکا لے۔ لیکن اب مشی اور خانو کی وجہ سے انہوں نے دعوت پر جانا کینسل کیا اور مینیو بھی فوراً تبدیل کیا تھا۔

زینیا کچن سے سارا کام نپٹا کر باہر نکلی تو موبائل اٹھا کر سیڑھیوں کی جانب بڑھتا خانو اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

"ہیلو نیچرل بیوٹی! کیسی ہو؟"

سیاہ پینٹ پر سفید ٹی شرٹ پہنے وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔ وہ عمر میں زینیا سے چھوٹا تھا لیکن قد کاٹھ میں کئی گنا بڑا دکھتا۔

"اچھی ہوں۔" زینیا مسکرائی۔

"ہاں، وہ تو تم ہو۔" ہنستا ہوا وہ سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ زینیا دادا کے کمرے میں آئی تو مشی کمرے کے وسط میں کھڑی دونوں بازو کمر پر ٹکائے تنقیدی نظروں سے ادھر ادھر پھیلی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

دادا کی ٹارچ، سیرپ کی بوتلیں، تیل کی شیشی، جوتے، ٹشو...... زینیا ہر بار بھی ان سب چیزوں کو سیٹ کر ان کی جگہ پر رکھتی واپسی پر اسے سب کچھ یونہی پھیلا ہوا ملتا۔

"کتنی بے ترتیبی ہے آپ کے کمرے میں دادا!"

مشی ناک چڑھا کر کہہ رہی تھی۔ ٹخنوں سے اوپر تک کے پائنچوں والے ٹراؤزر پر سرخ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بالوں کو اس بار نئے کلر میں رنگا ہوا تھا۔

"بے ترتیبی میں ہی زندگی کا اصل حسن چھپا ہوتا ہے نادان لڑکی! زندگی کی ساری ہلچل، ساری رونق...... کہ ہاں کوئی زندہ ہے جو متحرک ہے۔ ورنہ سیدھی، سپاٹ، ترتیب شدہ لکیریں تو موت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ساکت، خاموش، کوئی شور شرابا، کوئی ہنگامہ کچھ نہیں۔ سناٹا یعنی موت سب ختم۔"

یہ دادا کا فلسفہ تھا جو زینیا کو ازبر ہو گیا تھا۔

"اف اتنی مشکل باتیں۔ یہ زینی کا ہی دل گردہ ہے جو آپ کی ایسی بھاری بھرکم الجھی ہوئی باتیں سن لیتی ہے اور شاید سمجھ بھی۔"

مشی نے گویا جھرجھری سی لی۔ دادا شدومد سے اپنی عزیز بندوق کو چمکانے میں لگے ہوئے تھے۔

"ہائے واوے دادا! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس بندوق میں صرف ایک گولی ہی بچی ہے۔ کس کی سینے میں اتارنا پسند کریں گے؟"

Scanned with CamScanner

وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ گولی ایک ہے اور ٹارگٹ کئی ایک......" دادا اپنی بے چارگی سے بولے تھے کہ زینیا اور مشی ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

☆☆☆

چچی کو ان کی پڑھائی سے زیادہ فکر ان کے کھانے پینے اور آرام کی رہتی تھی۔ ان کا بس چلتا تو دنیا جہاں کی ساری آسائشات لا کر ان کے قدموں کے پاس ڈھیر کر دیتیں۔

"اوہو اماں! اٹھائیں ان کو...... میں نے یہاں سے بھینس بن کر واپس نہیں جانا۔"

دیسی گھی میں تر بتر تیل دار پراٹھے دیکھ کر مشی کو ابکائی آ گئی تھی۔ خانو البتہ بہت رغبت سے کھا رہا تھا۔ اس کا معدہ قابل رشک حد تک اچھا تھا۔ کھایا پیا سب ہضم۔

ماں کی لاکھ منتوں، ترلوں کے باوجود مشی نے چند لقمے سلائس کے چبائے اور چائے کا مگ اٹھا کر چھت پر آ گئی۔

جہاں زینیا خانو کی بھاری بھرکم پینٹس نچوڑ نچوڑ کر تار پر پھیلا رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑی مشی کی طرف چلی آئی۔ جو بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سنو زینی! وہاں حیدرآباد میں کسی نے تمہیں گلاب کا پھول تو نہیں دے مارا تھا۔ کیونکہ خوشبوؤں میں مہکتی ایسی گلابیاں پہلے تو کبھی تمہارے وجود سے پھوٹتی محسوس نہیں ہوئی تھیں۔"

زینی نے گھبرا کر پلکیں یوں جھکا لیں جیسے وہ اس کے اندر کا سارا حال عیاں کر دیں گی۔ ایسا حال جو وہ خود سے بیان کرنے سے بھی ڈرتی تھی۔

"ایسا کوئی آ گیا ہے کیا لائف میں؟"

زینیا نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا؟ سنو میری زندگی میں آ گیا ہے وہ...... عظام الحسن۔ میرے خوابوں کا شہزادہ۔" ایک آنکھ دبا کر وہ اسے رازداری سے بتا رہی تھی۔

"کون؟ کس کی بات کر رہی ہو تم؟ چچی کو پتا ہے؟"

"بے وقوف! انہیں کون بتائے گا؟"

ہوا سے اڑتے اپنے سنہری بالوں کو ہاتھ سے سمیٹ کر کان کے پیچھے اڑستی وہ لاپروائی سے بول رہی تھی۔

"میرے ساتھ یونی میں پڑھتا ہے۔ بہت ہینڈسم ہے۔ جان چھڑکتا ہے مجھ پر۔ اور مجھے تو لگتا ہے ایک دن بھی اس کے بغیر گزارنا محال ہے۔ اب بھی وہ کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ اس کے ڈیڈ ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ اس لیے میں یہاں آ گئی۔ ورنہ جب وہ ساتھ ہو تو چھٹیوں میں بھی کہاں دل چاہتا ہے گھر آنے کے لیے......"

وہ یہ کون سی رام لیلا سنا رہی تھی۔ زینی نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"آئی ایم ان لو۔" دونوں بازو اٹھا کر ہوا میں بلند کیے وہ عجب سرشاری کے عالم میں بول رہی تھی۔

یہ خوش نصیبی بھی کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ دل میں مچلتے ارمانوں کو زباں ملے۔ اسے آج ایک بار پھر مشی پر رشک آیا تھا۔

☆☆☆

جب تک مشی اور خانو یہاں رہے گھر میں ہلچل سی مچی رہی۔ گو کہ مشی زیادہ تر اپنے کمرے میں موبائل پر مصروف رہتی اور خانو کی اپنی مصروفیات تھیں لیکن گھر کا ماحول ضرور بدل جاتا۔

"چچی کو بتا دو مشی!" جانے سے پہلے اس نے مشی سے کہا۔

"وقت آنے پر بتا دوں گی۔" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے اپنی پیکنگ کر رہی تھی۔

"کیا تم واقعی سنجیدہ ہو اس کے بارے میں؟ وہ تمہارے ساتھ دل لگی تو نہیں کر رہا۔"

بیگ کی زپ بند کرتے مشی کے ہاتھ تھمے تھے۔ پھر سیدھا ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہیں محبت نہیں ہوئی ہے نا اس لیے بے خبر ہو کہ دل کی لگی کیسے دل کو لگ جاتی ہے۔ پھر سامنے والے پر اعتبار کرنے کے علاوہ اور کوئی راہ بچتی ہی نہیں۔"

"اعتبار ہمیشہ اسی پر کرنا چاہیے جو اعتبار کے قابل ہو۔ ورنہ محبت کے نام پر اندھی کھائی میں دھکیلنے والوں کی کوئی کمی تو نہیں ہوئی اس جہان رنگ و بو میں۔"

زینیا نے اسے نجانے کیا سمجھانا چاہا۔ مشی کندھے اچکا کر مسکرا دی تھی۔

ان کے جانے کے بعد پھر سے وہی اکتاہٹ بھرے دن رات شروع ہو گئے۔

دن اتنا طویل ہو جاتا کہ سارے کام ختم ہو جاتے ڈھلنے کا نام نہ لیتا۔ اور رات اس پر امتحان بن کر اترتی۔ "یہ تم کہاں دل لگا آئیں زینیا؟ نہ وصل کی کوئی امید نہ قرب کی چند ساعتیں دسترس میں۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آ جاتا۔

دادا کال پر بات کر رہے تھے۔ آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔

"میں جانتا تھا تیرا جواب یہی ہو گا۔ لیکن پھر بھی نجانے کیوں ہر بار تجھ سے امید باندھ بیٹھتا ہوں۔ بڈھا ہو گیا ہوں نا۔ سٹھیایا ہوا۔" ان کے منہ سے مارے غصے کے جھاگ نکل رہا تھا۔ زینیا نے ان کے ہاتھ سے موبائل لے کر کال کاٹ دی۔

"انہیں ان کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے آپ؟ ان کی مجبوری بھی تو سمجھیں۔ وہاں ان کا بزنس ہے گھر بار، بیوی بچے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر کیسے آ سکتے ہیں؟"

تیل کی بوتل اٹھا کر وہ آہستہ سے ان کے بالوں میں مالش کرنے لگی تھی۔

"اور تم؟ تم کچھ نہیں لگتیں اس کی؟" دادا بھڑکے۔

"میرے پاس آپ جو ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں۔ سگے باپ کی بھی نہیں۔" اس کا لہجہ کانپا ضرور تھا لیکن اس نے قابو پا لیا۔

"ڈرامہ ہے سب۔" دادا نے اس کے ہاتھ جھٹکنے چاہے لیکن وہ اسی طرح نرمی سے اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان کا مساج کرتی رہی۔

"ہم کتنے عجیب لوگ ہیں نا دادا؟ ڈرامہ دیکھ کر روتے ہیں اور جب اصل میں کسی کے ساتھ ہو رہا ہو تو کہتے ہیں ڈرامہ ہے سب۔"

دادا نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔

"میرے لیے نہ سہی تمہارے لیے آ جاتا۔" کیسا بے چارگی بھرا شکوہ تھا۔

اور زینیا سوچتی کاش "آپ کے لیے ہی ایک بار آ جاتے دادا!"

باہر سے ضیاء چچا کے زور سے دھاڑنے کی آواز سنائی دی تو وہ بوتل پر ڈھکن لگا کر جلدی سے کھلے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ باہر جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

چچا پہلی بار چچی پر یوں چلا رہے تھے۔

"پڑھائی کے نام پر یہ کچھ کرتا پھر رہا ہے تمہارا لاڈلا اور تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔"

انہوں نے سگریٹ کے پیکٹ، لائٹر اور چند دوسری ممنوعہ چیزیں لا کر ان کے قدموں کے پاس پھینکی تھیں۔ چچی حق دق کھڑی تھیں۔

"اس کے کمرے سے لے کر آیا ہوں۔" چچا کو ان کی حیرت پر مزید غصہ آیا۔

"ابھی..... ابھی فون ملاؤ اس کو۔ پوچھو کیا اس کی کسر رہ گئی تھی؟ زندگی بھر اس کے باپ دادا نے ان حرام چیزوں کو چھوا تک نہیں اور یہ......"

انہوں نے غصے سے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"وہ آ جائے گا تو میں پوچھوں گی۔ ایسی باتیں بھلا فون پر کہاں پوچھی جاتی ہیں۔" چچی کو کچھ لمحوں میں پسینہ آ گیا تھا۔

انہوں نے کہا ابھی کال کرو اس کو اور اسپیکر آن کرو۔ چچا کے آج تیور بدلے ہوئے تھے۔

فیروزہ نے خائف سا ہوتے اس کا نمبر ملایا۔ دو تین بار کال ملانے کے بعد اس نے اٹینڈ کر لی تھی۔

"اُفوہ اماں! کیا مصیبت آ گئی ہے۔ جو آپ مسلسل فون کر رہی ہیں۔ پتا بھی ہے اس وقت میں کلاس میں ہوتا ہوں۔"

اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"خانو! تمہارے کمرے سے سگریٹ کے پیکٹ ملے ہیں۔" فیروزہ بات اس سے کر رہی تھیں دیکھ ضیاء اللہ کو رہی تھیں۔

"تو؟"

"تو کیا تم اسموکنگ کرنے لگے ہو؟"

"توبہ ہے اماں! آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔ اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے۔ یہاں تو وہ بھی سگریٹیں پھونک رہے ہوتے ہیں جن کے پاؤں بھی ابھی موٹر بائیک کے پیڈل تک نہیں پہنچے۔ حد کرتی ہیں آپ بھی......"

اس کے لہجے میں لاپروائی زیادہ تھی یا خودسری۔ وہ بھی اندازہ نہیں کر پائی تھیں۔ ضیاء اللہ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ان کے دھواں دھواں ہوتے چہرے پر ڈالتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

☆☆☆

سلمان اور اماں نے فون کر کر کے ان کا دماغ پلپلا کر کے رکھ دیا تھا۔

ضیاء اللہ کے موڈ کے پیش نظر انہوں نے ان دونوں کو فی الحال اپنے گھر آنے سے روک رکھا تھا۔ لیکن سلمان کا اتاؤلا پن انہیں شدت سے احساس دلانے لگا کہ اگر اس سلسلے میں مزید دیر کی گئی تو وہ ضرور کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھے گا۔

"ضیاء! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارا خانو ابھی بچہ ہے۔ نادان ہے۔ یہاں آئے گا تو میں اسے سمجھاؤں گی۔ آپ پلیز ٹینشن مت لیں۔"

رات کو وہ ان کے قریب بیٹھی ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے نرمی سے بہت محتاط لہجے میں بول رہی تھیں۔ ضیاء اللہ نے گہری سانس بھر کر انہیں دیکھا۔ وہ ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دیں۔ اور یہ تو طے تھا خواہ کچھ بھی ہو جائے شوہر کو رام کرنے کے ہنر سے بھی خوب واقف تھیں۔

مزید چند دن گزرنے کے بعد اسی محتاط، بے حد نرم لہجے میں انہوں نے زینیا کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"سرفراز بھائی ہم پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔ یقیناً ان کے دل میں یہ خیال ہوگا کہ ہم نے زینی کو پالا پوسا۔ اب اس کی شادی کے بارے میں بھی سوچ رکھا ہوگا۔ ہمیں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے بھی اب زینی کی شادی کی عمر ہو چکی ہے۔ پرائی اولاد اوپر سے لڑکی ذات خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ہمارے زندگی بھر کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

"ہاں لیکن تو تم ٹھیک رہی ہو۔" ضیاء اللہ کو وہ ہمیشہ ٹھیک ہی لگتی تھیں۔ "لیکن کوئی مناسب رشتہ بھی تو ہو۔"

"اپنا سلمان ہے نا۔ دیکھا بھالا گھر کا لڑکا ہے۔"

"سلمان؟" انہوں نے قدرے حیرت سے فیروزہ کا چہرہ دیکھا۔

"کیا برائی ہے سلمان میں؟ اچھا خاصا خوش شکل ہے۔ اپنا جنرل اسٹور چلاتا ہے۔ خاندان والوں کو تو آپ نے دیکھ لیا ہے۔ سرفراز بھائی کی دوسری شادی کی وجہ سے کسی نے آج تک زینی کے لیے رشتہ نہیں ڈالا۔ اب ہمارا سلمان غیروں سے تو ہزار درجہ بہتر ہے۔ بری بھلی جو کہیں گے سن لے گا۔ بہت خوش رکھے گا زینی کو۔"

بات کرنے کے دوران وہ برابر شوہر کے چہرے کے بنتے، بگڑتے زاویوں پر نگاہ جمائے بیٹھی رہیں۔

"ابا نہیں مانیں گے۔انہیں سلمان سخت ناپسند ہے۔"

"اباجی کو آپ چھوڑیں نا۔ یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر یونہی آپے سے باہر ہونے لگتے ہیں۔اب ساری زندگی ان کی دیکھ ریکھ کے لیے ہم زینی کو گھر پر تو نہیں بٹھا سکتے نا؟ میری مانیں تو آپ سرفراز بھائی سے بات کریں۔ بلکہ بات کیا کرنی ہے انہیں قائل کریں۔

ابھی تو اماں اور سلمان اتنی چاہ سے زینی کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔لڑکی کی عمر گزر جائے تو کہاں اچھے رشتے ہاتھ آتے ہیں۔"

ضیاء اللہ کے چہرے پر قائل ہو جانے والے تاثرات دیکھ کر فیروزہ نے گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔انہوں نے مشکل مرحلہ سر کر لیا تھا۔

☆☆☆

فیروزہ کے مشورے پر ضیاء اللہ نے اباجی کے کان میں بات ڈالنے کے بجائے ڈائریکٹ سرفراز بھائی سے بات کرنے کو مناسب سمجھا تھا۔اب وہ کال پر وہی باتیں من وعن دہرا رہے تھے جو فیروزہ نے ان سے کہی تھیں۔

"دیکھ لو یار! اگر تمہیں مناسب لگ رہا ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس زینی کی رضامندی لازمی ہے۔"

"ہاں ہاں بھائی جان کیوں نہیں؟ سب کچھ زینی کی رضامندی اور خوشی سے ہی ہوگا۔"

"تم پیسوں کی فکر بالکل مت کرنا۔ سب کچھ بہت اعلیٰ طریقے سے ہونا چاہیے۔"

"فیروزہ چچی کا دل بلیوں اچھلا تھا۔انہیں امید نہیں تھی سب کچھ اتنی جلدی اور اتنے اچھے طریقے سے ہو جائے گا۔اس وقت انہوں نے کال کر کے اماں اور سلمان کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دے ڈالی۔"

☆☆☆

"لگتا ہے آج آندھی آئے گی۔"

کچن کے کام نپٹا کر زینیا باہر نکلی تو عجیب گھٹا سا موسم ہو رہا تھا۔گرد آلود آسمان پر اڑتی چیلیں موسم کو مزید وحشت زدہ سا بنا رہی تھیں۔خیالی، ابھی ہوئی سہ پہر اونگھتی ہوئی منڈی دیوار پار کر گئی تو پژمردہ سی شام نے سر اٹھایا۔

کشش بیگ گھسیٹتے ہوئے اندر آئی تھی۔ چچی نے کچھ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔وہ آج بھی بنا اطلاع کے آ گئی تھی۔"خالو نہیں آیا؟"

انہیں لگا وہ اسموکنگ والی بات کی وجہ سے شاید ابھی ماں باپ کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

"اچھے وقت پر آئی ہو۔ آج تمہاری نانی لوگوں کی خاص دعوت ہے ہمارے ہاں۔" انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اسے سرپرائز دینے والے انداز میں بتایا۔

"اچھا؟" بنا کوئی دلچسپی ظاہر کیے وہ جھک کر اپنے جوتے کے اسٹریپ کھولنے لگی تھی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

چچی کے متفکر لہجے پر اس کے ہاتھ لحہ بھر کے لیے تھمے تھے پھر آہستہ سے اٹھ کر جوتے ریک میں رکھتے بولی۔

"ٹھیک ہوں میں.....بس ذرا تھک گئی ہوں آرام کروں گی۔"

چچی کو اس کے غیر معمولی انداز چونکا گئے تھے۔ مشی نظریں چرانے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیا کرتی تھی۔کوئی بات تو ضرور ہے۔

کریدنے کا وقت نہیں تھا۔ویسے بھی وہ اچھی طرح جانتی تھیں جب تک مشی خود کچھ نہیں چاہے گی اس سے پوچھنا بے کار ہے۔

"میں ذرا زینی کو دیکھ لوں۔کام ختم کیا اس نے یا نہیں۔" اسے آرام کرنے کا کہتی وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھیں۔

☆☆☆

چچی نے سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت پورے

خاندان میں سلمان اور زینیا کی شادی کی خبر پھیلا دی گئی۔ ابھی صرف انگوٹھی پہنا کر منگنی کی رسم ادا کرنی تھی۔ اگلے ماہ نکاح اور رخصتی کا فیصلہ کیا گیا۔ سلمان منگنی کے بجائے ڈائریکٹ نکاح اور رخصتی پر زور دے رہا تھا۔

وہ ایک ماہ بھی انتظار کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

آپا کی بات ماننا مجبوری تھی ورنہ اپنی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو وہ ٹھوکروں کی زد پر رکھنے کا قائل تھا۔

اور یہ تو پھر زینیا تھی جس کی معصوم ہرنی جیسی آنکھوں میں پھیلا ہراس اسے دیوانہ کر گیا تھا۔ آج اس کی تیاری اور اعتماد دیکھنے لائق تھا۔

نیلے شوخ رنگ کی شرٹ پر مالٹا رنگ کی فینسی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سیاہ چشمہ سر پر ٹکائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔

"ارے زینی مٹھائی لے آؤ بھئی۔"

کھانے کے بعد وہ برتن سمیٹ کر کچن صاف کر رہی تھی جب چچی کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس نے فریج سے کھیر کا باؤل نکالا اور لاؤنج میں چلی آئی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟ آدھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔"

فریدہ بیگم نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا تھا۔ دوسری جانب سلمان بیٹھا تھا۔

"پہلے رسم کر لیتے ہیں پھر منہ میٹھا کریں گے۔"

چچی کا لہجہ آج شہد ٹپکا رہا تھا۔

"ہاں بھئی تو اجازت ہے؟" مخملیں کیس کھولے انگوٹھی نکال کر فریدہ بیگم نے اجازت طلب نظروں سے ضیاء اللہ کی طرف دیکھا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

چچی نے ایک نظر زینی کے فق چہرے پر ڈالی اور ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بسم اللہ کریں اماں!"

☆☆☆

تو پھر یہ طے ہے کچھ سفر لاحاصل ہوتے ہیں۔

نہ راستوں کی خبر، نہ منزل کا کچھ پتا۔ بس چلتے جاؤ یہاں تک کہ قدموں تلے بچھا نارسائی کا ریگستان پاؤں جھلسا دے۔ ناامیدی کے ببول دامن سے لپٹ جائیں اور دل کے اجڑے گلستان کا ایک ایک پھول مرجھا جائے۔

ارتضیٰ نے کسی بے حد قیمتی متاع کی طرح کتاب میں رکھے اس سوکھے گلاب کی مہک کو اپنی سانسوں میں اتارا تھا۔ وہ ایک گلاب جو اس کے موتیا اور گلابوں سے بھرے پلو سے نکل کر اس کے قدموں کے پاس گر گیا تھا۔

اور وہ چند ٹوٹی ہوئی سرخ چوڑیاں۔ جلی ہتھیلیوں پر بکھرتے گلال نے اس کے دل میں کب عشق کی آگ بھڑکائی اسے کچھ خبر نہیں ہو سکی تھی۔

احساس تو تب ہوا جب دل نے دیدہ دلیری سے اس ڈری، سہمی خوف زدہ لڑکی سے محبت کا اعتراف کیا۔

اس کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانکا وہ ایک لمحہ صدیوں پر بھاری پڑ گیا تھا۔ وہ جو آئی اور چلی گئی اپنے ساتھ اس کی سب سے قیمتی متاع اس کا دل لے گئی۔

اور میں ارتضیٰ حیدر جس کے نام سے ہی بڑے بڑے مجرم کانپنے لگتے ہیں اس نازک سی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو بیٹھا۔

اسے دل کے اعتراف کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے تھے۔ ابھی وہ اپنے دل کی عدالت میں پوری طرح سرخرو بھی نہیں ہوا تھا کہ زنجیر ہلا دی گئی۔

امی کہہ رہی تھیں روحا یا نمرہ میں سے جس کا انتخاب کرو گے وہی تمہاری شریک سفر بن کر اس گھر میں آئے گی۔ خاندان کا معاملہ ہے۔ تمہارے تایا جان اور پھوپھو نے بہت صاف لفظوں میں اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ مجھے صرف تمہاری خوشی اور رضامندی درکار ہے۔ باقی سب ثانوی چیزیں ہیں......"

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بنا زرینا کا نام لے دیتا لیکن کل ہی تو اس نے سنا تھا ای کس کون پر بتا رہی تھیں۔

"زرینا کی سلمان سے شادی ہو رہی ہے۔"

بے بسی کی انتہا تھی جس کو اس نے زندگی میں پہلی بار چھوا تھا۔

☆☆☆

"ایک منٹ..... کیسی رسم؟ کیا ہو رہا ہے۔ یہاں پر؟"

نیوز بلیٹن سننے کی غرض سے لاؤنج میں بیٹھے دادا چونکے۔

"زرینا کی سلمان کے ساتھ منگنی کی رسم۔"

چچی نے مسکراتے ہوئے بم پھوڑا تھا۔ زرینا نے ششدر سا ہو کر چچی کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

"کیا بکواس ہے؟" دادا ریموٹ پھینکتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"تمہیں میری پوتی کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا حق کس نے دیا؟ اس کا باپ ابھی زندہ ہے ملک سے باہر ہے خدانخواستہ دنیا سے باہر نہیں چلا گیا۔"

"ابا جی! سرفراز بھائی کی رضامندی سے ہی ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔ انہوں نے سلمان کے لیے زرینا کے رشتے کی ہامی بھری تھی تب ہی تو بات یہاں تک پہنچی ہے۔" ضیاء اللہ تحمل سے انہیں سمجھانے لگے۔ زرینا سانس نہیں لے سکتی تھی۔

"سرفراز راضی ہے اس رشتے پر؟" دادا کو یقین نہیں آیا تھا۔

"بالکل راضی ہیں۔ میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا ابا جی!"

ضیاء اللہ کی بات سن کر وہ طیش میں آ گئے۔

"وہ..... الو کا پٹھا..... ناخلف اتنا ہی بیٹی کا خیر خواہ ہوتا تو اسے تمہارے در پر پھینک کر نہ چلا جاتا۔ لیکن میں ابھی زندہ ہوں..... اس کا دادا اس کا سرپرست..... اس رشتے سے انکار کرتا ہوں۔"

سلمان نے تڑپ کر ماں اور آپا کی طرف دیکھا تھا۔

"ارے ایسے کیسے انکار کرتے ہیں۔ زبان دی ہے۔ عزت دار لوگوں کے لیے زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔"

فریدہ بیگم نے واویلا مچا دیا۔ فیروزہ نے انہیں آرام سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دادا کی طرف رخ موڑا۔

"ابا جی! آپ کی بلاوجہ کی ضد اور انا کی وجہ سے ہم زرینا کی خوشیاں داؤ پر نہیں لگا سکتے۔ بات سارے خاندان میں پھیل چکی ہے۔ کیوں لوگوں کو ہنسنے کا موقع دے رہے ہیں..... پہلے ہی لوگوں نے سرفراز بھائی کی دوسری شادی کی وجہ سے رائی کے کئی پہاڑ کھڑے کر لیے ہیں اب مزید جگ ہنسائی کی ہمت نہیں ہے ہمارے اندر....."

دادا نے بہت تحمل سے ان کی ساری جذباتی تقریر سنی اور سکون سے انگلی اٹھا کر بولے۔

"بات سنو تم۔ یہ سلمان اگر دنیا کا آخری مرد بھی ہوتا تب بھی میں اپنی زرینی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دیتا۔"

انہوں نے سپید پڑتا چہرہ لیے زرینی کا ٹھنڈا ہاتھ تھاما اور باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر کہا۔

"اگر اس کی جگہ تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا تم اس کا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دے دیتیں؟"

انہوں نے سوال نہیں کیا تھا فیروزہ چچی کے منہ پر چابک دے مارا تھا۔ سلمان کی آوارہ گردیوں اور لوفرانہ طبیعت سے سارا خاندان واقف تھا۔

☆☆☆

سلمان نے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ فیروزہ چچی نے آخر میں ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اس کو ابھی یہاں سے لے جاؤ اماں! خدا کے لیے۔"

"میں اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا آپا! تم دیکھنا اسی بڈھے کے سامنے اس کی پوتی کو اٹھا کر لے

Scanned with CamScanner

جاؤں گا۔ بھاڑ میں گئی منگنی۔ نکاح......"

وہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔ ابھی تو تتلی کے خوشنما پروں سے رنگ اتار کر اپنی پوروں کو رنگین بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اڑ گئی بلکہ اڑا دی گئی۔

اس نے ہتھیلی کا مکا بنا کر دیوار پر دے مارا تھا۔ وہ اتنا ہی جنونی تھا۔

فریدہ بیگم بمشکل اسے بہلا پھسلا کر لے گئی تھیں۔

"تم نے زینی سے اس کی رضامندی نہیں پوچھی تھی؟" غصے سے چکر کاٹتے ضیاء اللہ نے فیروزہ چچی کو گھورا۔

وہ خاموش بیٹھی تھی۔ لڑکی ذات کی خاموشی کا اور کیا مطلب ہوتا ہے ضیاء صاحب!" چچی تڑخ کر بولی تھیں۔

"یہ تو آپ کے ابا ہیں جنہوں نے میری ہر بات کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھ رکھا ہے؟ چچی نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام رکھا تھا۔

دادا کمرے میں آکر زینی پر برس پڑے تھے۔ "گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نہ بولتا تو کیا چپ چاپ انگوٹھی بھی پہن لیتیں؟"

زینیا نے جھکا سر اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے یقین تھا آپ ضرور بولیں گے دادا!"

اور دادا کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بے دم ہو کر بستر پر گر سے گئے۔

"ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سنا ہے کبھی؟"

اس نے سر ہلاتے ہوئے ان کا ضعیف ہاتھ تھاما۔ "ڈوبتے کو صرف سہارا چاہیے ہوتا ہے۔ چاہے وہ شہتیر کا ہو یا پھر تنکے کا۔" دادا نے اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھا۔

"کیا کوئی ہے ایسا جس پر میرے بعد تم اعتبار کرسکو؟ جو تمہیں زمانے کی سرد و گرم سے بچا کے اپنی مضبوط پناہ میں رکھے تا عمر......؟"

"یہ کیا پوچھ لیا دادا نے؟ اس نے اپنی نگاہیں جھکالی تھیں۔ لب کپکپائے تھے۔ ایک لمحہ میں جیسے دل کی بستی تہہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ دادا کو کیا بتاتی کہ ہاں ہے ایک ایسا شخص جس پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جس کے لمحہ بھر کے لمس نے اس کے دل کے تاروں کو اتنی شدت سے ہلایا تھا کہ وہ آج تک قابو میں نہیں پا سکی تھیں۔ ہاں تھا ایک ایسا شخص جو زینیا سرفراز کے دل تک دستک دیے بنا ہی چلا آیا تھا۔

"زینی!" دادا اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بہت غور سے، بہت محبت سے۔

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ دادا نے گہری سانس اپنے اندر اتاری۔

"تو پھر مجھ پر یقین رکھو میں تمہارے بارے میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کروں گا۔" اس نے ان کے لرزتے ہاتھوں پر اپنا رخسار ٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

"اگر اس کی جگہ پر تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا تم ایسے شخص کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیتیں؟"

چابک اتنی زور سے ان کے چہرے پر مارا گیا تھا کہ تکلیف کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے مشی کا زرد کملایا ہوا چہرہ دیکھا۔

وہ ابھی ابھی اٹھ کر کے نڈھال سی بیٹھی تھی۔ چچی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جب سے آئی تھی کمرے میں بند تھی۔ کھانا بھی برائے نام ہی کھایا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

ماں کے سوال پر غیر محسوس انداز میں دوپٹا اپنے گرد لپیٹا۔ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو رہی تھیں۔ الجھے، روکھے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹ کر پونی میں باندھ رکھا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے...... یہ وہ مشی تو نہیں تھی۔ دائیں بائیں دونوں طرف ہاتھوں سے بیڈ کے نرم گدے پر دباؤ ڈال کر بیٹھی وہ اپنی ناہموار سانسیں درست کر رہی تھی۔

فیروزہ کا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا تھا۔ انہیں شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"منشی!" ایک سرسراتی ہوئی آواز ان کے لبوں سے نکلی تھی۔ اور کب سے خود پر ضبط باندھے منشی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مجھے معاف کردیں اماں! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ میں بہک گئی تھی۔ بھٹک گئی تھی۔ مجھے معاف کردیں......"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے کرلاتا دیکھتی رہیں۔

"اس نے کہا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھ سے شادی کرے گا۔ اس نے اپنا وقت رنگین کرنے کے لیے میرے چہرے پر سیاہی انڈیل دی۔ اس رات کی تاریکی نے میرے وجود کو داغدار کردیا ہے۔ اب وہ کہتا ہے میرے گھر والے نہیں مان رہے......وہ میرا فون نہیں اٹھاتا۔ میں اس کا کیا کروں اماں! یہ اذیت یہ گناہ کا احساس مجھے مار ڈالے گا۔"

وہ رو رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی اور فیروزہ کو لگا وہ اگلا سانس نہیں لے سکیں گی۔

"یہ......یہ کیا کردیا ہے میں نے......ہاں سارا کیا دھرا میرا ہے۔ تم نے تو صرف کاٹا ہے۔ بویا تو میں نے تھا......دوسروں کی اولاد کی راہ میں کانٹے بچھاتے بچھاتے اپنی اولاد کی انگلیاں فگار کر بیٹھی۔ یہ کیا کردیا ہے میں نے؟ کیا کردیا ہے؟؟"

فیروزہ زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز بہت اجنبی سی معلوم ہوئی تھی۔ چڑیوں کے لیے مٹھی بھر باجرہ پھیلاتی زیتا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی ضیاء اللہ نے پورا دروازہ کھول دیا تھا۔

"بھائی جان؟"

زیتا کے ہاتھ سے باجرے سے بھری کٹوری گر گئی تھی۔ شور کی آواز پر باجرہ چگتی چڑیاں پھر سے اڑ گئی تھیں۔

"ابا جی! دیکھیں تو کون آیا ہے؟"

سرفراز صاحب سے بغل گیر ہوتے وہ پرجوش آواز میں دادا کو آوازیں دینے لگے۔ دادا کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ لو بھر کو جیسے پتھر ہوئے۔

"میں نہیں جانتا اسے۔" کپکپاتی آواز میں بولتے ہوئے رو رخ موڑ گئے تھے۔

سرفراز نے تڑپ کر ان کے قدموں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"اپنا جوتا اٹھا کر میرے سر پر دے ماریں۔ لیکن ایسا مت کہیں ابا!" وہ لمبا چوڑا مرد باپ کے قدموں میں بیٹھا رو پڑا تھا۔

"سیدھے ہو جاؤ ناخلف! یا پھر تمہیں اٹھانے کے لیے میں ہی جھکوں؟"

وہ فوراً سیدھے ہوئے تھے۔ "یہ زیتا ہے؟"

بت بنی زیتا کو دیکھا۔

"پہچانتے ہو اسے؟" دادا کے طنزیہ لہجے پر وہ پرامان کر بولے۔

"کیسی باتیں کررہے ہیں ابا! بیٹی ہے یہ میری۔"

"شکر ہے تمہیں یہ تو یاد رہا اس دنیا میں تمہاری ایک اور بیٹی بھی ہے جسے تم لاوارث چھوڑ کر چلے گئے تھے۔"

دادا لڑکھڑاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ جتنے بھاری ان کے الفاظ تھے وہ خود ہی ان کا وزن سہار نہیں پائے تھے۔

"لاوارث کیوں؟ آپ کے اور ضیاء اللہ کے حوالے کرکے گیا تھا اس کو۔"

دادا نے تاسف سے انہیں دیکھا۔ "باپ کے زندہ ہوتے ہوئے دادا اور چچا کب سے سرپرست ہونے لگے؟"

سرفراز نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔ دادا کہہ رہے تھے۔

"تم کوئی بکری یا بلی کا بچہ ہمارے پاس نہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ جسے ہم نے صرف پال پوس کر بڑا

کرتا تھا۔ جیتی جاگتی انسان، اپنی اولاد، اپنے وجود کا حصہ یہاں چھوڑ گئے تھے اور پھر اس سے غافل ہو گئے۔ ماں مر جائے تو کیا باپ بھی ساتھ ہی مر جاتا ہے؟"

زیتا گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی تھی۔

"کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میرے بھجوائے گئے پیسوں سے اس کی ساری ضروریات تو پوری ہو جاتی ہوں گی لیکن خواہشات...... کیا وہ بھی؟ ہر کلاس میں پوزیشن لینے والی نے "میرا پڑھائی میں دل نہیں لگتا" کہہ کر کالج چھوڑ دیا تو اسی کو سچ مان بیٹھے۔ چچی نے اپنی مرضی سے رشتہ طے کر دیا۔ چچا نے نکاح کی تاریخ دے دی۔ اور باپ کا فرض پیسے بھجوا کر شادی کا خرچہ اٹھانا تھا بس؟"

لرزتے، کپکپاتے لہجے میں برسوں کا غبار بہہ نکلا تھا۔

مشی سرسوں کا پھول بنی دروازے کی چوکھٹ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ فیروزہ نگاہ نہیں چرا پائی تھیں۔ اپنے اعمال آئینہ بن کر سامنے آ کھڑے ہوں تو نظریں چرانے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔

مشی سے نگاہ ہٹا کر روتی ہوئی زیتا کو دیکھا آج تک کوئی شکوہ اس کے لبوں کی دہلیز نہیں چھو سکا تھا۔ لیکن ان بہتے آنسوؤں پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ خود پر اتنا حق تو رکھتی تھی زیبی!

وہ آہستہ سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی زیتا اور سرفراز کے درمیان آ کر ٹھہر گئی تھیں۔

"مجھے معاف کر دیں سرفراز بھائی! آپ کے ہیرے کی قدر نہیں کر سکی۔ اپنے کوئلوں کو ہی چمکانے میں لگی رہی۔"

زیتا کے رونے میں اور شدت آ گئی۔ چچی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

☆☆☆

"تم نے ٹھیک کہا تھا زیبی! اعتبار صرف اس پر کرنا چاہیے جو اعتبار کے لائق ہو۔ ورنہ اس جہان رنگ و بو میں محبت کے نام پر جھانسہ دے کر اندھی کھائی میں دھکیلنے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

بدروح بن کر بھٹکتی مشی پر اسے زندگی میں پہلی بار ترس آیا تھا۔ بہت ٹوٹ کر۔ اور زیبی...... جو کہتی تھی میرے پاس دادا ہیں مجھے اور کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ آج اپنے باپ کے سینے سے لگی تو احساس ہوا مضبوط، شفیق پناہ میں آنا کیسا ہوتا ہے۔ ان کے سینے سے لگی وہ آنکھیں بند کیے اس احساس کو اپنی رگ و پے میں اترتا محسوس کرتی رہی۔

"ایسا نہیں تھا کہ صوفیہ نے مجھے کبھی پاکستان نہ جانے کی قسم دے رکھی تھی۔ یا پھر ذوالنورین اور آئمہ میری راہ کی رکاوٹ تھے۔ بس مجھے لگا۔ تم اپنوں کے درمیان ہو۔ ہر ماہ رقم بھیج کر میں نے خود کو تمہاری ہر ذمہ داری سے عہدہ برآ سمجھ لیا تھا۔ لیکن میں غلط تھا۔ بیٹیوں کے باپ کو اتنا بے حس اور لاپروا نہیں ہونا چاہیے جتنا میں ہو گیا تھا۔"

زیتا کے آنسو ان کی شرٹ بھگونے لگے تھے۔

"کیا میں اپنی وجہ سے بہائے جانے والے یہ آخری آنسو سمجھوں؟" اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے وہ پوچھ رہے تھے۔ زیبی بھیگی آنکھوں سے ہولے سے ہنس دی۔

اس رات اسے بہت سکون کی نیند آئی تھی۔

نجانے وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔ سورج کی تیز شعاعوں نے بند کھڑکی کے شیشے پر دستک دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ چپل پاؤں میں اڑستی وہ کچن کی طرف بھاگی۔ کچن کے ادھ کھلے دروازے پر قدم تھمے تھے۔

آج کا دن بہت مختلف تھا۔

چچی نے دونوں چولہوں پر دیگچے چڑھا رکھے تھے۔

"نہیں چچی! یہ میں کر لیتی ہوں۔" وہ آگے بڑھ آئی تھی۔

"تم ہی تو کرتی رہی ہو زندگی بھر......" چچی اس کی طرف دیکھ کر آزردگی سے مسکرائیں یہ صرف ایک مسکراہٹ نہیں تھی۔ زیبی نے گہری سانس اپنے اندر

اتاری۔

"آج کوئی دعوت ہے؟"

"ہاں دعوت ہی سمجھو۔ ابا جی کے بہت خاص مہمان آئے ہوئے ہیں۔ رات کو دیر سے پہنچے تھے۔ تب تک تم سو چکی تھیں۔ میں آئی تھی تمہارے پاس پوچھنے کے لیے......"

"کیا پوچھنے کے لیے؟" وہ ٹھٹکی۔

"ابا جی نے تمہارا نکاح طے کر دیا ہے۔ وہ لوگ اسی سلسلے میں آئے ہیں۔ آج ظہر کی نماز کے بعد نکاح ہے۔"

اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

"پوچھو گی نہیں کون ہے وہ؟"

کوئی اور وقت ہوتا تو چچی کا یہ بدلا روپ، لہجہ اور الفاظ اسے خوش گوار حیرت کے سمندر میں ڈبو دیتے لیکن اس وقت بولی بھی تو صرف یہی۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تم فریش ہو کر تیار ہو جاؤ۔" چچی اب پھرتی سے سلاد کاٹ رہی تھیں۔

وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ آج وہ شخص شدت سے یاد آیا تھا جسے بھول جانے کی دعا وہ شدت سے مانگتی تھی۔

دادا نے کہا تھا" وہ ان پر یقین رکھے وہ اس کے بارے میں کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔" وہ دادا کے یقین کو ٹوٹنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس نے نہا کر کپڑے بدلے۔ بال بھی بنائے۔ سنگھار کرنے کو اس کا دل نہیں چاہا تھا۔ اب دل کی وہ اتنی تو مان ہی گئی تھی۔

اس کا بلاوا آیا تو وہ بنا کسی کی طرف دیکھے خاموشی سے دادا کے ساتھ صوفے پر نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ مانوس سے کلون کی مہک ایک بار پھر چاروں اور مہکتی اس کے حواسوں پر چھانے لگی تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ اس کے خیال کو جھٹک نہیں پا رہی تھی جب نکاح خواں تیسری بار اس کا نام دہرا رہا تھا۔

"ارتضیٰ حیدر بن حیدر جلال......"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا جھکا سر اوپر اٹھایا تھا۔ بالکل سامنے چچا کے ساتھ بیٹھی ثمن ابرو اچکا کر مسکرائی۔ "بولو کیسا؟"۔

دادا کے دوسری طرف شیریں خالہ بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ......"اف خدایا!"

"بولو بیٹا! قبول ہے؟" بابا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے بے یقینی سے دہرایا۔

"قبول ہے!"

☆☆☆

نکاح ہو گیا تھا جب سلمان اور فریدہ بیگم افتاں و خیزاں بھاگتے چلے آئے۔

"ستیاناس! اے فیروزہ تیرا ککھ نہ رہے تو نے بھائی کی منگیتر کا نکاح کسی اور کے ساتھ کروا دیا۔"

انہوں نے آتے ہی دھاوا بول دیا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا آپا! اپنے بھائی کی جگہ کسی اور کو کیسے لینے دی تم نے؟" سلمان آپے سے باہر ہونے لگا تھا۔ فیروزہ نے تحمل سے اس کا بازو تھاما۔

"میری بات سنو سلمان! صرف میرا بھائی ہونا کافی نہیں ہے میرے ویر! اپنے اندر ایسے اوصاف پیدا کرو کہ کوئی بھی زینیا خوشی سے تمہارا ہاتھ تھام لے۔"

سلمان ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اس جانے پہچانے خوبرو انسپکٹر پہ ڈالی اور آہستہ سے کہا۔ "چلو اماں!"

دونوں آگے پیچھے خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔

"بڑی کوئی بے وفا نکلی ہو تم تو بھئی! واپس گئیں تو پھر پلٹ کر خبر تک نہیں لی۔ اور ہمیں دیکھو کیسے تمہاری محبت میں دوڑے چلے آئے ہیں۔"

ثمن اسے اپنے ساتھ لپٹائے محبت سے کہہ رہی تھی۔

"میری مجبوری ہے میں بار بار سفر نہیں کر سکتی۔

اب آئی ہوں تو اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔"

شیریں خالہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

زیتا کی تو بے یقینی ہی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ دادا کو دیکھا جو آسودگی سے مسکراتے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شیریں خالہ اب سرفراز اور ضیاء اللہ سے رخصتی وغیرہ کے معاملات کے بارے میں بات کرنے لگی تھیں۔ زیتا چپکے سے اٹھ کر باہر آ گئی۔

☆☆☆

آسمان پر تنی گرد کی چادر ہٹ گئی تھی۔ اس کی جگہ اب روئی کے سفید گالوں کی طرح بادلوں کے ٹکڑے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔

باغیچے میں سر اٹھائے گلاب کے پودوں پر کھلتے ڈھیر سارے پھولوں کی مہک کو اپنے اندر اتارتی وہ چونکی۔ ایک اور خوشبو بھی تھی جو اس کی مشام جان مہکانے لگی تھی۔

"جانتی ہو زیتا! تمہیں پانے کی جستجو کیے بغیر ہی تمہیں کھو دینے کا احساس میرے وجود سے جان نکال گیا تھا لیکن عبدالحئی صاحب کی اس غیر متوقع فون کال نے میرے بے جان وجود کے اندر جیسے نئی روح پھونک دی تھی۔"

زیتا حیرت کا مجسمہ بنی اسے دیکھے گئی۔ یہ وہ کون سی کہانی سنا رہا تھا۔ تو کیا محبت کے اس سفر میں وہ تنہا نہیں تھی۔ وہ بھی تھا جس نے اس راستے پر قدم رکھ دیے تھے منزل کی خبر دونوں کو نہیں تھی۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ اتنے چپکے سے میرے دل پر واردات کی کہ میں تمہارے جانے کے بعد ثبوت ہی ڈھونڈتا رہ گیا۔" اس کے سامنے سینے پر بازو باندھے وہ کہہ رہا تھا۔ زیتا نے سر جھکا لیا۔

"بائی داوے اس دن کیا فرمایا جا رہا تھا کہ مجرم بے چارے تو ایسے خوف ناک قسم کے انسپکٹر کے ہتھے چڑھتے ہی خود بخود اقبال جرم کر لیتے ہوں گے؟"

زیتا نے مسکراہٹ دبائی۔ "تو کیا غلط کہا تھا؟"

"غلط اور صحیح کا تو پتا نہیں۔ البتہ آج معجزوں پر یقین بڑھ گیا ہے۔ تمہیں کھو کر پانا میرے لیے کسی معجزے سے کم نہیں۔"

زیتا کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا تھا۔ خفیف سا رخ موڑے وہ بولی۔

"یاد رہے میں وہی اسٹوپڈ، سلی گرل ہوں جسے چھینکیں مارنے کے جرم کی پاداش میں آپ اندر کروانے کی دھمکی دے چکے ہیں۔"

ارتضیٰ اس کی بات پر دلکشی سے مسکرایا تھا۔

"اب تو صرف اتنا یاد ہے کہ میرے اپنے دل نے اس اسٹوپڈ، سلی گرل کی محبت میں گرفتار ہو کر عمر بھر کے لیے قید با مشقت کی سزا سنا دی ہے۔"

زیتا بے اختیار اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جس کی آنکھوں میں لودیتا احساس اس کے دل کی بستی کے پھول کھلانے لگا تھا۔

"اچھا سنو! تمہاری کچھ امانتیں رہ گئی تھیں میرے پاس۔"

زیتا چونکی...... "میں نے تو آپ کو کچھ نہیں دیا تھا۔"

"میں نے کب کہا کہ تم نے دی تھیں؟ وہ تو قدرت کی طرف سے تحفتاً ملی ہیں جنہیں میں نے امانت سمجھ کر سنبھال کر رکھ دیا۔"

ٹہنی سے ایک گلاب توڑ کر اس کی طرف بڑھاتا وہ گمبھیر لہجے میں بول رہا تھا۔ زیتا نے مسکراتے ہوئے گلاب تھام لیا۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... فریحہ اعجاز

میک اپ .... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

مریم انصاری

بلا عنوان

ایک دم اتنی بہت ساری پریشانیوں نے جیسے اسے گھیر لیا ہو۔ اس ہجوم میں اس کا عکس بھی متاثر ہو رہا تھا۔ اسے وہاں سے فرار ہونے کے لیے کوئی راہ بھی میسر نہ تھی۔

"مہنگے کپڑے کی شرٹ ہے۔ اللہ جانے کتنی قیمت ہوگی؟ میں تو کبھی بھی اس نقصان کا مداوا نہیں کر سکتی۔ پھر مستقل گاہک کے چھوٹ جانے کا ڈر۔"

پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا؟ میں اتنی بے وقوف اور لاپروا بھی تو نہیں۔

رابعہ کی رنگت زرد تھی اور وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔ سلائی مشین اس نے دھکیل کر پرے کر دی تھی۔

"کیا ہوا؟ اماں! اب کیا پریشانی ہے جو اتنی بدحواس ہو رہی ہیں۔ ابھی آئیں گی مسز رضوانہ رحمانی سلائی مکمل کر لیں۔" کتنی تاکید کر کے وہ گئی تھیں کہ انہیں ابھی جانا ہے۔ شادی اٹینڈ کرنے۔

"بیٹے!" رابعہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ادعیہ جو اپنا اکلوتا یونیفارم دھو رہی تھی، ہاتھ دھو کر ماں کے پاس آئی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کسی انہونی کا جلدی سے اس نے شکنجبین کا گلاس بنایا اور ماں کے پاس لے آئی۔ وہ ٹھنڈی یخ ہو رہی تھیں۔

اسی لمحے دروازہ بجا۔ ادعیہ نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ مسز رحمانی تھیں۔ رابعہ کو دیکھ کر وہ آگے بڑھیں

"کیا ہوا؟" رابعہ نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

مسز رحمانی نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھامے۔ "رابعہ ایسا نہیں کرتے مجھے بات بتاؤ۔ کیا ہوا ہے؟"

مجھ سے غلطی ہو گئی۔ قمیص کی کٹنگ کرتے ہوئے غلطی ہو گئی۔ آپ کی قمیص کا کپڑا۔ اف! قینچی چل گئی۔ شرٹ اب نہیں بن سکتی۔"

مسز رحمانی نے سر تھام لیا۔

"بس اتنی سی بات۔ رابعہ! تم نے تو میری جان نکال لی تھی۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے یہ شرٹ مجھ سے بھی تو خراب ہو سکتی تھی۔ میں استری کرتے ہوئے اسے جلا سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری وارڈ روب میں بھلا کپڑوں کی کمی ہے۔ کوئی بھی پہن کر چلی جاتی ہوں لو پیو شکنجبین اور سنبھالو اپنا آپ۔"

مسز رحمانی نے رابعہ کے لرزتے ہاتھ تھام کر انہیں اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

"ذرا تمہارے ہاتھ تو سونے کے ہیں اتنا ہنر ہے ان ہاتھوں میں مجھے تو کسی اور کی سلائی اچھی ہی نہیں لگتی۔"

مسز رحمانی رخصت ہو گئیں۔ رابعہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ادعیہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو ادعیہ چونکی اور ماں کو گلے لگا کر رونے لگی۔

"اماں! ہمارا رب کتنا پیارا ہوگا۔ جس نے اتنے پیارے انسان بنائے ہیں۔"

☆☆

راشدہ رفعت

آخری پڑاؤ

کہتے ہیں شادی بور کا لڈو ہے جو کھائے وہ پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ ان کہنے والوں میں اکثریت ان کی ہوتی ہے۔ جن کے خیال میں جب دونوں صورتوں میں پچھتانا ضرور ہے تو یہ لڈو کھا ہی لیا جائے۔

بہرکیف عمیر کا شمار ان لوگوں میں نہ ہوتا تھا وہ اس اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتی تھی، جو یہ سوچتے تھے کہ شادی کے بعد پچھتانا ہی ہے تو بور کا لڈو کھا کر منہ کا ذائقہ کیوں خراب کیا جائے۔ بری یا بھلی جیسی زندگی گزر رہی ہے گزار لی جائے۔ یہ اور بات کہ دنیا والے اس نقطۂ نظر سے قائل نہ ہوتے اور دنیا والوں کا نمبر تو بعد میں آتا تھا وہ تو ڈیڈی کو ہی اپنا نقطۂ نظر سمجھانے میں کامیاب نہ ہوئی۔

ڈیڈی جلد از جلد اس کا گھر بسانے کے خواہش مند تھے۔ اس کی گریجویشن مکمل ہونے سے قبل ہی انہوں نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈو مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ اس عجلت کی ایک وجہ تو بڑی روایتی سی تھی اس بھری پری دنیا میں عمیر کا ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی بیٹی کے فرض سے سبک دوش ہو کر اسے اپنے گھر میں بستا بستا دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ بیٹی کی شادی نمٹانے کے بعد وہ خود اپنی زندگی کا دوسرا بور کا لڈو ٹرائی کرنا چاہ رہے تھے۔

عبیر کی امی کا انتقال دس برس قبل ہو گیا تھا۔ ان کے بعد ڈیڈی نے عبیر کی خاطر دوسری شادی نہ کی لیکن اب جب عبیر خود شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی تو ڈیڈی اسے اس کے گھر بار کا کر کے از سر نو اپنا گھر بسانا چاہ رہے تھے۔

عبیر ڈیڈی کی قربانیوں کی معترف تھی، اسے ان کی دوسری شادی پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر وہ دوسری شادی زوبی آنٹی سے نہ کر رہے ہوتے۔ ڈھائی برس، پہلے زوبی آنٹی ایک کرائے دار کی حیثیت سے ان کے گھر کی اوپری منزل میں آ کر رہنے لگی تھیں لیکن وہ خیمے میں گھسا وہ اونٹ ثابت ہوئی تھیں جو پورے خیمے پر قابض ہونا چاہتا تھا۔

عبیر کو زبردستی ماڈرن بنی وہ شاطر سی خاتون ایک آنکھ نہ بھائی تھیں۔ وہ ایک بے اولاد بیوہ تھیں۔ ملازمت پیشہ خاتون لیکن عجیب چالاک اور خرانٹ سی شخصیت کی مالک۔

مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڈی کو وہ چالاک عورت معصوم اور بھولی بھالی سی دوشیزہ لگتی تھی۔ ڈیڈی کا بس چلتا تو وہ عبیر کی شادی سے قبل ہی زوبی آنٹی کو دلہن بنا کر اوپر سے نیچے لے آتے لیکن یہ زوبی آنٹی تھیں، جنہوں نے ان کو بڑے دلار سے سمجھایا کہ بیٹی کی شادی سے قبل اپنا گھر بسانا مناسب طرز عمل نہیں۔

عبیر نے ڈیڈی سے منوانے کی بہت کوشش کی کہ وہ مزید پڑھنا چاہتی ہے۔ یہ سچ تھا کہ وہ کبھی بھی بہت لائق فائق اسٹوڈنٹ نہ رہی تھی لیکن اتنی تعلیم حاصل کرنا اس کا حق تھا۔ جس کی بنیاد پر وہ کوئی معقول اور باعزت کیریئر اپنانے کے قابل ہو سکتی۔ آج کے دور میں فقط گریجویشن کی کوئی اہمیت تھی بھلا، لیکن محبت کرنے والے ڈیڈی، آج کل صرف زوبی آنٹی کی محبت میں ڈوبے تھے۔ ان کے کانوں سے سنتے اور ان کی آنکھوں سے دیکھتے اور ظاہر ہے زبان بھی ان ہی کی بولتے تھے۔

آگے پڑھنے کی عبیر کی ضد بالآخر منت میں بدلی لیکن ڈیڈی کا فیصلہ نہ بدلا۔ زوبی آنٹی کے مشورے پر عبیر کا بر ڈھونڈنے کے لیے شادی دفتروں سے رجوع کیا گیا۔ ڈیڈی اپنے خاندان کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ ننھیال والوں نے عبیر کی امی کے انتقال کے بعد بھانجی سے تعلق رکھنا گوارا ہی نہ کیا تھا، سو عبیر کے لیے قریبی رشتہ داروں میں سے رشتہ آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رشتے کے لیے شادی دفتر کا سہارا لینا مجبوری تھی۔

شادی دفتر والے جس طرح کے رنگ برنگے رشتے بھیج رہے تھے عبیر کا دم خشک ہوا جاتا تھا۔ زوبی آنٹی تو ہر رشتے کے پلس پوائنٹ ڈیڈی کو گنوا دیتی تھیں لیکن غنیمت تھا کہ ڈیڈی کا دل بھی ان رشتوں پر نہیں ٹک رہا تھا۔ پھر جو رشتہ آیا وہ کسی شادی دفتر کی معرفت نہیں آیا بلکہ ان کے گھر، کام کرنے والی ماسی صغریٰ کے توسط سے آیا۔

صغریٰ کافی عرصے سے عبیر کے گھر جز وقتی ملازمہ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ اس کی ایک بہن حمدان کے ہاں کام کرتی تھی۔ وہ لوگ اچھے گھرانے کی لڑکی کے متلاشی تھے، یہاں ڈیڈی کو عبیر کے لیے کوئی مناسب اور معقول گھرانہ درکار تھا۔ قسمت میں عبیر اور حمدان کا سنجوگ لکھا تھا۔ سو دونوں طرف کی ملازماؤں کے وسیلے سے دونوں خاندانوں کا میل ملاپ ہوا۔

حمدان کی امی اور آپا نے عبیر کو فوراً ہی سند قبولیت بخش دی تو ڈیڈی نے بھی حمدان کو اوکے کر دیا۔ وہ پڑھا لکھا، برسر روزگار اور جاذب نظر شخصیت کا مالک تھا۔

حسنہ آپا نے ہی عبیر کو بھائی کی تصویر دی تھی۔ پہلی نگاہ میں ہی عبیر کو وہ اچھا لگا تھا۔ لیکن دل عجیب سے وسوسوں میں مبتلا تھا۔ اسے شادی سے ڈر لگتا تھا تو اس کی بڑی وجہ ذہن میں سسرال کا تصور تھا۔

وہ ساری زندگی رشتوں سے محروم رہی تھی۔ امی کے بعد اس کی زندگی میں ڈیڈی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اسے رشتوں کو برتنے کا کوئی سلیقہ نہ تھا۔ فلموں، ڈراموں اور کہانیوں کی وجہ سے دماغ میں سسرال کا

روایتی تصور جڑ پکڑے ہوئے تھا۔

رہی سہی کسر اس کی نام نہاد دوستوں نے پوری کردی۔ جب انہیں پتا چلا کہ اس کے سسرال میں ایک بوڑھی ساس کے علاوہ ایک مطلقہ نند ہے تو انہوں نے اس کے ہولناک مستقبل کی پیشن گوئی کردی تھی۔

"جس گھر میں دو عورتوں کی حکمرانی ہو وہاں بہو کی دال کبھی نہیں گلتی۔ تم لکھ لو تمہاری ساس نند تمہیں اول روز سے دبا کر رکھیں گی۔"

یہ حصہ تھی جو حمران کی تصویر دیکھ کر دل ہی دل میں تھوڑا جیلس ہوئی تھی اور خود بھی نہ جانتی تھی کہ عمیر کو اس ان دیکھے خوف میں مبتلا کرنے کی ایک وجہ اس کے دل میں چھپی جلن ہے۔

"ویسے تو حسنہ آپا بہت ملنسار لگتی ہیں اور میری ساس بے چاری تو ویسے ہی کئی بیماریوں میں مبتلا ہیں، دونوں خرانٹ تو کہیں سے نہیں لگتیں۔" اس نے حصہ کی بات سے اختلاف کرنے کی کوشش کی۔

"یہ بظاہر ملنسار اور بے چاری سی لگنے والی ساس نندیں ہی تو اصل میں فتنہ ثابت ہوتی ہیں۔ میری آپی کا حشر پتا نہیں تمہیں، صرف دو سال ہوئے ہیں شادی کو، شادی سے پہلے ساس نندیں واری صدقے جاتی تھیں اور اب اتنا جینا دوبھر کر دیا ہے کہ ہم آپی کو گھر بٹھانے کا سوچ رہے ہیں۔"

اس بار تجزیہ پیش کرنے والی ہما تھی۔

اس بار عمیر چپ ہو گئی وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد اسے جتنے بھی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے پاس گھر بیٹھنے کا آپشن نہ ہوگا کیونکہ اس کی شادی کے بعد اس گھر میں زوبی آنٹی کا راج ہوگا۔ حالات جیسے بھی ہوں اسے سسرال میں گزارہ کرنا پڑے گا۔ ساس نند کی تیزی طراری کو تو شاید وہ بھگت ہی لے بس اگر حمران اس کی ڈھال بن جائے۔

عجیب بات یہ تھی کہ بات پکی ہونے اور شادی کی تاریخ طے ہونے کے باوجود حمران نے نہ ہی اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا نہ ٹیلی فونک رابطہ استوار کرنے کی کوشش کی۔ آج کے دور میں یہ ناقابل یقین بات تھی اور عمیر کی دوستوں کے بقول حمران، اپنی ماں اور آپا کے رعب میں ہوگا اور ان ہی کے منع کرنے پر رابطہ کرنے کی ہمت نہ کر پایا ہوگا۔

"اچھا اب تم اتنا بھی پریشان مت ہو ایک بار شادی ہو لینے دو۔ شوہر کو مٹھی میں کرنا اتنا بھی بڑا مسئلہ نہیں۔ میری بھابیوں کو دیکھ لو۔ میرے لمبے تڑنگے بھائیوں کو کیسا کاٹھ کا الو بنا رکھا ہے۔"

اس بار حصہ کو اس کی بے چاری شکل دیکھ کر ترس آیا تو اسے تسلی سے نوازا۔ عمیر پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

ان ہی خدشات میں گھرے ہوئے شادی کی تیاری کا آغاز کیا۔ زوبی آنٹی ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات پیش کر رہی تھیں۔ ڈیڈی کو بھی ان کی صلاحیتوں پر بھروسا تھا۔ شادی کی تیاری کے لیے انہوں نے زوبی کو ہی عمیر کا سرپرست بنا دیا تھا۔ روپے پیسے بھی ان ہی کے حوالے تھے۔

عمیرا کنامکس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اسے چند دنوں میں ہی اندازہ ہو گیا کہ زوبی آنٹی، اس کے نام پر کی جانے والی شاپنگ میں اچھی خاصی ہیرا پھیری کر رہی ہیں۔ ایک بار ڈیڈی کو بتانے کی کوشش کی لیکن وہ الٹا اس پر ہی بگڑ گئے۔

"زوبی ٹھیک کہتی ہے۔ تم اسے ماں کے روپ میں قبول کرنے پر آمادہ ہی نہیں اس لیے تو میں خود نکاح کرنے سے گریز کر رہا ہوں تمہیں تمہارے گھر کا کر رہا ہوں۔ اس بے چاری عورت کے خلاف تم نے اپنے دل میں کتنا عناد پال رکھا ہے۔"

"لیکن ڈیڈی......!" اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"بس بیٹا! اب ایک لفظ اور نہیں میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہے کہ تم اپنی ماں کی جگہ کسی اور کو دو لیکن میرا بھی تو سوچو ایک طویل عرصے سے تنہائی کا عذاب بھگت رہا ہوں۔ اب اگر ایک بھلی عورت میری تنہائی بانٹنے میری شریک حیات بننے جا رہی ہے تو تمہیں یہ گوارا نہیں۔ تمہیں اول روز سے زوبی سے چڑ ہے پتا نہیں یہ بلا وجہ کی چڑ کب ختم ہو گی۔"

ڈیڈی آزردہ تھے۔ وہ ان سے بڑھ کر آزردہ ہوئی اور سوری ڈیڈی کہہ کر پلٹ گئی۔ اس کے بعد اس نے شادی کی شاپنگ کی ساری ذمہ داری از خود زوبی آنٹی کے سپرد کردی۔

"آپ تجربہ کار ہیں۔ مجھ سے بہتر خریداری کر سکتی ہیں۔ پلیز یہ شاپنگ خود ہی نمٹا لیجیے۔ مجھے ویسے بھی بازاروں میں پھرنے سے وحشت ہوتی ہے۔"

"اوہ کم آن ڈارلنگ فکر کیوں کرتی ہو۔ میں ہوں نا۔ تم گھر پر ریسٹ کرو۔ ویسے بھی شادی سے پہلے بازاروں میں لور لور پھرنے سے چہرے کی شادابی ختم ہو جاتی ہے۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔" وہ دلار سے بولیں۔

عبیر نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی جس کی شادابی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کی سہیلیاں مہندی کے فنکشن پر کچھ ہلا گلا کرنا چاہ رہی تھیں لیکن عبیر نے انہیں ٹال دیا۔ سسرال والوں نے بھی ان رسومات میں قطعاً کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہ کیا۔ مہندی کا جوڑا تو درکنار انہوں نے چوڑیاں اور گجرے تک بھیجنے کی زحمت نہ کی۔

"آج کے دور میں اتنی ڈل اور بورنگ شادی کیا ہو گیا ہے عبیر ڈارلنگ! مہندی کا فنکشن تو ہونے دو۔" زوبی آنٹی نے بھی اسے ٹوکا تھا۔

"آپ نے جو جوڑا میری مہندی کے لیے بنوایا ہے وہ آپ کی اپنی مہندی پر کام آجائے گا زوبی آنٹی! آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں۔"

اس نے جواباً ان سے زیادہ دلار بھرے لہجے میں انہیں مخاطب کیا تھا پھر بھی جانے کیوں ان کے شاداب سے چہرے کے زاویے اتنے بگڑے کہ عبیر کو ان پر کسی ویمپائر کا گمان ہونے لگا۔ زوبی آنٹی نے اس کی گستاخیوں کا بدلہ ایک انتہائی اوسط درجے کے پارلر میں اس کی بکنگ کروا لیا تھا۔

"آپ نے کتنے فیشل لیے ہیں۔" بیوٹیشن اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ایک بھی نہیں۔" اس نے سپاٹ سے انداز میں جواب دیا۔

"اوہ میرے خدا! آپ برائیڈل میک اپ کروانے بیٹھی ہیں اور فیشل تک نہیں کروایا۔" وہ چلائی عبیر نے جواب دینے کے بجائے فقط ایک تیکھی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"اچھا خیر اسکن تو آپ کی خاصی اچھی ہے۔ گزارہ ہو جائے گا۔" بیوٹیشن نے جیسے اس کو تسلی دی۔

"شادی اپنوں میں ہو رہی ہے یا غیروں میں؟" بیوٹیشن باتونی تھی۔

"غیر ہیں شاید اپنے بن جائیں۔" اس بار خود کلامی عبیر نے کی تھی۔

"بعض اوقات غیر اپنوں سے اچھے نکل آتے ہیں۔ اب مجھے دیکھیں نکے۔ ماموں کے گھر شادی ہوئی تھی لیکن مامے کا گھر بھی سسرال بن کر۔۔۔" بیوٹیشن کے پاس اپنے سسرال کی دہشت ناک کہانی تھی۔

"اوہ ناٹ اگین۔" عبیر ایک اور سسرال نامہ سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ لیکن وہ جس باتونی بیوٹیشن کے ہتھے چڑھی تھی۔ اس نے میک اپ کے ساتھ سسرال نامہ بھی سنا کر دم لیا۔ یہ اوسط درجے کا پارلر تھا لیکن دیکھے دل والی بیوٹیشن کے ہاتھ میں واقعی مہارت تھی۔ عبیر نے تیار ہونے کے بعد آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو پہلی بار ایک دھیمی مسکان اس کے لبوں پر پھیلی تھی۔

"بہت خوب صورت ہیں آپ۔ میں تو دن رات دولہنیں تیار کرتی ہوں لیکن ایسا روپ کسی کسی پر چڑھتا ہے۔" اس نے فراخ دلی سے کریڈٹ اپنے ہنر کے بجائے اس کی خوب صورتی کو دے دیا تھا۔

زوبی آنٹی اسے لینے آئیں تو وہ بھی اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئی تھیں۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو ڈارلنگ!" انہوں نے تعریف کی لیکن چہرے کے تاثرات الفاظ کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ آنکھوں میں عجیب سی جلن اور ناپسندیدگی چھپی تھی اور یہ جلن اور بڑھ گئی جب دلہن بنی عبیر کو نکاح کے بعد حمدان کے پہلو میں لا بٹھایا گیا۔

اگر میر آسمان کی حور لگ رہی تھی تو حمدان بھی کسی سے کم نہ تھا لیکن وہ حد سے زیادہ سنجیدہ اور خشک مزاج شخص ثابت ہو رہا تھا۔

میر کی سہیلیوں کے شوخ فقروں اور چھیڑ چھاڑ کے جواب میں اس کے پاس مسکراتا ہوا کوئی جملہ تو دور کی بات اس کے لبوں پر مسکراہٹ تک نہ پھٹکی تھی۔

"حمدان بھائی تو ماں بہن کے پورے کنٹرول میں ہیں۔ ان ہی کی ہدایت ہو گی کہ دلہن والوں کو ذرا لفٹ نہ کرانا۔"

ہما کی سوچ کا ہر تانا بانا ساس نند پر ہی جا ملتا تھا اس نے میر کے کان میں سرگوشی کر کے اپنے تحفظات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ ایسی باتیں سن کر اب میر کی بس ہو چکی تھی۔

"اب اوکھلی میں سر دے دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ ایک بار سسرال پہنچ جاؤں پھر دیکھ لوں گی سب کو۔"

اس لیے اس نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ ہاں وہ ڈر کر یا کسی سے دب کر زندگی نہیں گزارے گی۔ وہ اپنے کالج کی کرکٹ ٹیم کی سب سے اچھی بلے باز تھی اور ہمیشہ بیک فٹ کے بجائے فرنٹ فٹ پر کھیلنے کو ترجیح دیتی تھی۔

شادی کے بعد زندگی کی جو نئی اننگز شروع ہونے جا رہی تھی۔ اس میں بھی اس نے فرنٹ فٹ پر کھیلنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر پہنچ کر اس کا دل شانت ہو گیا تھا۔ رخصتی کے ٹائم بھی اس نے روایتی دلہنوں کی طرح رونا دھونا نہ مچایا تھا، جب ڈیڈی نے اسے خود سے لپٹا کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تو ایک لمحے کو اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اگر آج وہ پرائی ہو رہی تھی تو کچھ دنوں بعد ڈیڈی نے بھی تو پرایا ہو جانا تھا، اب قدرت کا کوئی معجزہ ہی زوبی آنٹی کو اس کی سوتیلی ماں کے عہدے پر فائز ہونے سے روک سکتا تھا۔ میر تو ساری امیدیں ترک کر کے پیا دیس سدھار گئی۔

☆☆☆

سسرال پہنچ کر حسنہ آپا نے بہت چاؤ سے رسموں کا آغاز کرنا چاہا مگر جب دولہن کے ساتھ دولہا بٹھانا چاہا تو دولہا میاں ندارد۔

"حمدان! کہاں ہو بھئی جلدی آ جاؤ۔ مووی میکر کب تک انتظار کرے گا۔" وہ آوازیں دیتے ہوئے اس کے کمرے تک آ گئیں۔ وہ کمرے میں ہوتا تو جواب دیتا۔ حسنہ آپا نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا پھر پریشان ہو کر واپس لاؤنج میں آ گئیں۔

"حمدان کہاں ہے اماں؟" انہوں نے ماں سے پوچھا۔ وہ بیٹی کا سوال سن کر اس سے بھی زیادہ پریشان ہو گئیں۔

"کہاں ہے حمدان؟" متوحش ہو کر بیٹی کا سوال اسی کو لوٹایا۔

"بھائی تو چینج کر کے پچھلے دروازے سے باہر گئے ہیں۔" یہ اطلاع دینے والا کاشان تھا۔ سترہ، اٹھارہ برس کا کاشان، جو حمدان کا چھوٹا بھائی تھا۔

"کاشی کے بچے! جب بھائی باہر جا رہا تھا اسی وقت مجھے کیوں نہیں بتایا۔" حسنہ آپا نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا تھا وہ آپ لوگوں کو بتائے بغیر جا رہے ہیں۔" کاشان نے صفائی دی۔

میر کی چھٹی حس نے کچھ غلط ہونے کا سگنل دے دیا تھا۔ یہ گھر والے بلاوجہ پریشان نہیں ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے تو حسنہ آپا نے مووی میکر کو چلتا کیا تھا پھر میر کو اس کے بیڈروم میں لے جانا چاہا۔

"آپ کا بھائی کہاں گیا ہے۔" شرم اور جھجک بالائے طاق رکھتے ہوئے میر نے ان سے ڈائریکٹ پوچھ لیا۔ اس سوال پر ان کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"حسنہ! میرا بی پی لو ہو رہا ہے۔ دل بیٹھا جا رہا ہے بیٹے۔" اماں نے بھی اسی لمحے بیٹی کو مخاطب کیا۔ ان کی حالت واقعی خراب لگ رہی تھی۔

"اُفوہ اماں! آپ تو ہمت پکڑیں۔ کاشی جلدی اماں کو لیموں پانی بنا کر لا دے۔" حسنہ نے بھائی کو پکارا۔

میر دل ہی دل میں صورت حال کا تجزیہ کرنے لگی۔ حمدان کا گھر سے باہر جانا اتنی بھی اچنبھے کی بات

نہیں تھی وہ یار دوستوں سے ملنے بھی جا سکتا تھا لیکن گھر والوں کے حواس باختہ چہرے بتا رہے تھے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ حسنہ آپا سے مزید استفسار کرنے کا مطلب تھا کہ اماں جی کا بلڈ پریشر مزید نیچے گر جاتا۔ اس نے اپنا سوال دوبارہ نہ دوہرایا۔

"مجھے پلیز میرا کمرہ دکھا دیں۔ بیٹھے بیٹھے میری کمر اکڑ گئی ہے میں ریلیکس ہونا چاہتی ہوں۔" اکتائے ہوئے لہجے میں اس نے نند کو مخاطب کیا۔

"ہاں ہاں آؤ...... تم ریسٹ کرو حمدان بس ابھی آجائے گا۔" حسنہ کا انداز ایسا تھا جیسے اس سے زیادہ خود کو یقین دلا رہی ہوں۔

بیڈروم میں آ کر ایک موہوم امید کے سہارے اس نے گھنٹہ بھر حمدان کا انتظار کیا تھا لیکن نہ حمدان آیا تھا نہ گھر کے کسی بندے نے دوبارہ اندر جھانکا تھا۔ عمیر کی برداشت بس اتنی ہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے پور پور سجے وجود پر ایک تھکی ہوئی نگاہ ڈالی۔ انتظار فضول تھا۔

گہنے اتار کر رکھے، ہیر اسٹائل سے نبرد آزما ہونے میں کچھ وقت ضرور لگا پھر دھلے ہوئے منہ کے ساتھ سوتی جوڑا پہنے وہ پھر سے لاؤنج میں موجود تھی۔

وہاں تو لگتا تھا وقت رکا ہوا ہے۔ پریشان چہرے والی وہ دونوں عورتیں ہنوز اسی پوزیشن میں براجمان تھیں۔ کاشی البتہ صوفے پر نیم دراز اونگھ رہا تھا۔

"کچھ سراغ ملا آپ کے بھائی کا؟" عمیر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ حسنہ آپا نے بے چارگی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"فون اٹھا نہیں رہا یا بند جا رہا ہے؟" عمیر نے تفتیش کا دائرہ آگے بڑھایا۔ حسنہ آپا نے چونک کر اپنی گود میں رکھا فون دیکھا۔

"بیل جا رہی ہے۔ اٹھا نہیں رہا۔" اقرار جرم کے سے انداز میں جواب دیا۔

"آپ کا بھائی اس شادی پر راضی نہیں تھا، یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ کیوں نہیں تھا اس بات کا جواب مجھے آپ لوگ دیں گے۔" وہ کڑے انداز میں پوچھ رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بس بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ گئیں۔

"چلیں مان لیا کہ اس کے راضی نہ ہونے کی کوئی وجہ ہوگی یقیناً کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہوگا جو آپ لوگوں کو پسند نہ ہوگی لیکن میرے اس سوال کا جواب تو آپ کو دینا پڑے گا کہ بیٹے کے راضی نہ ہونے کے باوجود آپ لوگوں نے اس کی زبردستی مجھ سے شادی کیوں کروائی۔ آپ لوگوں کو چاہیے تھا کہ شادی سے پہلے ہمیں صورت حال سے باخبر کرتے۔" اس کی آواز دھیمی لیکن انداز کٹیلا تھا۔

"ارے نہیں عمیر! ایسی کوئی بات نہیں۔" حسنہ آپا نے ہکلاتے ہوئے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں حسنہ! اب اس بچی کو مزید اندھیرے میں مت رکھو۔" اماں نے تھکی تھکی آواز میں بیٹی کو ٹوکا۔

"ہمیں معاف کر دو بیٹا! ہم واقعی تم پر ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں۔" اس شفیق سی بڑھیا نے عمیر کے آگے ہاتھ ہی جوڑ دیے۔

عمیر بری طرح سٹپٹائی۔ یہ سچ تھا کہ سسرال پہنچ کر اسے جو سچویشن فیس کرنا پڑی تھی اس سے وہ سخت کبیدہ خاطر ہوئی تھی۔ ردعمل کے طور پر ان لوگوں کو انڈر پریشر بھی لے آئی تھی۔ بھلے سے یہ اس کے مجرم تھے لیکن اتنی مسکین شکل والے مجرم تھے کہ اسے خود بخود ان پر ترس آ گیا۔

"پلیز یہ نہ کریں آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔" اس نے ساس کے بندھے ہاتھوں سے نگاہ چراتے ہوئے انہیں ٹوکا۔ زبان سے یہ تمر والبتہ خود بخود پھسلا تھا وہ اتنی جلدی کسی کو اپنی ماں کی جگہ پر نہ دیتی تھی جانے کیسے ساس کو فوراً اماں کا رتبہ دے ڈالا۔

"جیتی رہو۔" ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "ہمارا خیال تھا تم جیسی خوب صورت بیوی پا کر وہ فریحہ کو بھول جائے گا لیکن یہ ہم دونوں کی خام خیالی تھی۔ وہ ہمارے دباؤ پر تمہیں بیاہ تو لایا لیکن اپنے طرز عمل سے ہمیں باور کروا گیا ہے کہ اس رشتے کی اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں کاش وہ شادی سے پہلے

ہی تمہارے مجبور کرنے پر مجبور نہ ہوا ہوتا تو آج ہم تمہارے سامنے مجرم نہ بنتے۔"

"یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا ناماں جی!" وہ ذرا تلخی سے بولی۔

"آپ ماؤں کے پاس بیٹوں سے بات منوانے کے بہت سے جذباتی حربے ہوتے ہیں اور نہیں تو قیامت کے دن دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے دیتی ہیں اولاد بے چاری مجبور ہو جاتی ہے۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "اچھا چھوڑیں مجھے فریحہ کا حدود اربعہ بتائیں کون ہے وہ لڑکی، ان کے ساتھ پڑھتی تھی یا ساتھ کام کرتی تھی۔ آپ لوگوں نے بیٹے کی پسند کیوں نہ اپنائی؟"

عمیر سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔

"میرے دیور کی بیٹی ہے۔ دو گلی چھوڑ کر گھر ہے ان لوگوں کا۔" اماں نے دھیرے سے بتایا۔

"اوہ......" عمیر نے ہونٹ سکوڑے۔ "یقیناً دیورانی، جیٹھانی والی روایتی چپقلش اسی وجہ سے آپ دیور کی بیٹی کو بہو نہ بنانا چاہ رہی تھیں۔" وہ جیسے فوراً نتیجے پر پہنچی۔

"اندازے لگانے میں اتنی عجلت سے کام مت لو دلہن!" اماں نے اسے ٹوکا۔ عمیر نے ابرو اچکا کر انہیں اس انداز میں دیکھا گویا کہہ رہی ہو پوری بات تفصیل سے بتائیں۔

"آٹھ برس پہلے میں نے خود فریحہ کی انگلی میں حمدان کے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس کے بڑے بھائی توقیر سے میری حسنہ کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے وسیلے پر فریحہ اور حمدان کی منگنی کی رسم ہوئی تھی۔ شادی کے فقط ڈیڑھ برس بعد حسنہ طلاق کا ٹھپہ لگوا کر واپس گھر آ گئی۔ ان لوگوں نے بیٹے کی شادی تو کر دی لیکن بیٹے میں شراکت گوارا نہ کر سکے۔ توقیر نے جب کبھی بھی بیوی کو اس کا جائز مقام دینے کی کوشش کی ماں بہن آڑے آ گئیں۔"

"اوہ ایک اور سسرال نامہ۔" عمیر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"فریحہ توقیر کی لاڈلی بہن تھی جب توقیر کی زندگی میں بیوی آئی تو ظاہر ہے وہ بیوی کو بھی توجہ دینے لگا۔ فریحہ اور اس کی ماں نے حسنہ کے خلاف محاذ کھول لیا۔ نہ رشتے داری کا لحاظ کیا اور نہ ہی یہ خیال کیا کہ کل کو فریحہ نے بھی اس گھر میں بہو بن کر آنا ہے۔ گھر کی کشیدہ فضا سے تنگ آ کر توقیر اپنے دوست کے بلانے پر دبئی چلا گیا۔ وہیں دوست کی بہن سے شادی رچالی اور میری حسنہ کو طلاق کا پروانہ بھیج دیا۔ میں کیسے اس لڑکی کو اپنی بہو بناتی جس کی وجہ سے میری بیٹی کا گھر اجڑ گیا۔" اماں نے مختصر لفظوں میں ساری رام کتھا سنا دی۔

"تو آپ کا بیٹا کیوں اس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے جس کی وجہ سے اس کی بہن کا گھر اجڑا۔" عمیر خود کو پوچھنے سے نہ روک پائی۔

"وہ اس معاملے میں فریحہ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ مرد کی عقل پر جب کسی کے عشق کی پٹی بندھ جائے نا تو وہ اسی کی آنکھوں سے دیکھتا اور اس کے کانوں سے سنتا ہے۔ اسے سمجھانا دنیا کا ناممکن ترین کام ہوتا ہے۔" اماں آزردگی بھرے لہجے میں بولیں۔

عمیر کو ڈیڈی اور زوبی آنٹی کا خیال آیا تھا اماں کا تجزیہ تو سچا تھا لیکن ابھی اسے ان کی بات کی صداقت پر پورا بھروسا نہ تھا۔ یہ ایک یک طرفہ کہانی تھی۔ ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ اس کہانی میں اس کی اینٹری سب سے زیادہ مظلومانہ تھی۔ حد ہوتی ہے بھئی، لاعلمی میں اس کا جوگ ایسے شخص سے جڑ گیا تھا جو پہلے ہی کسی کی زلف کا اسیر تھا۔ اگر پیچھے اس کا میکہ تگڑا ہوتا تو وہ یقیناً اس گھر میں ایک منٹ اور نہ رکتی۔ اسے تو ڈائجسٹوں میں چھپنے والی ان کہانیوں کی ہیروئنوں پر بھی سخت تاؤ چڑھتا تھا، جو زبردستی کسی کی زندگی میں شامل ہونے کی حقیقت کھلنے کے باوجود اپنی خدمت گزاریوں سے ہیرو کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ شوہر کی بے اعتنائی چپ چاپ سہتی ہیں اور اپنے گھر والوں کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنے دیتیں۔

اس کے مطابق تو ایسے شوہروں پر لعنت بھیج کر گھر
واپسی کی راہ لینی چاہیے لیکن آج جب یہ سب اس پر بیتا
تو احساس ہوا کہ شوہر پر لعنت بھیج کر گھر واپس پلٹنا اتنا
بھی آسان نہیں۔ ان بے چاری مظلوم ہیروئنوں کی بھی
کوئی نہ کوئی مجبوری ہوتی ہوگی جو وہ اپنی عزت نفس کچل
کر شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتی ہیں۔

عبیر کی مجبوری کا نام تو زوبی آنٹی تھا۔ حالانکہ
اسے یقین تھا کہ اگر وہ اس وقت ڈیڈی کو فون کرکے
صورت حال سے آگاہ کرتی ہے تو وہ طیش کے عالم
میں اسے فوراً لینے پہنچ جائیں گے لیکن اس کے بعد کیا
ہوگا۔ ڈیڈی نے پہلے ہی اس کی شادی کی خاطر اتنا
صبر سے کام لے لیا تھا اب وہ اپنی شادی میں مزید
تاخیر نہیں کرنا چاہیں گے اور زوبی آنٹی ایسی ہستی
تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اس عجلت بھرے انداز والی
شادی پر بھی راضی ہوگئی تھی۔ اپنے گھر میں اسے اس
عورت کا وجود گوارا نہ تھا کوئی راستہ نہ پاکر اس نے
زوبی آنٹی کے لیے میدان خالی چھوڑ کر خود ہی اس گھر
سے جانے کا فیصلہ قبول کرلیا تھا۔

زوبی آنٹی کا وجود اس کے لیے اب بھی اتنا ہی
ناقابل برداشت تھا۔

عبیر نے نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے
صورت حال کا تجزیہ کیا۔ عقل مندی کا تقاضا یہی تھا
کہ وہ فی الحال کوئی جذباتی قدم نہ اٹھائے اور صورت
حال واضح ہونے کا انتظار کرے۔ جن ساس نندوں
سے خائف ہوکر وہ شادی سے کترا رہی تھی فی
الوقت وہ دونوں عورتیں بھی بہت مظلوم اور مجبور لگ
رہی تھیں۔ حالانکہ مسئلہ بھی ان ہی کا پیدا کردہ تھا لیکن
عبیر کو ان کی حالت دیکھ کر ان پر ترس آرہا تھا۔

"آپ لوگ پلیز ریلیکس رہیں۔ حسنہ آپا!
آپ ماں جی کو کمرے میں لے جائیں۔ انہیں
سلائیں۔ خود بھی سونے کی کوشش کریں۔ آپ کا
بھائی اپنے ساتھ کوئی سازوسامان تو لے کر گیا نہیں،
وہ صرف آپ لوگوں سے ناراضی کے اظہار کے طور پر
گھر سے نکلا ہے واپس لوٹ کر یہیں آئے گا۔ صبح
تک انتظار کریں۔ کل ویسے کا فنکشن تو رات کو ہے
ناں، کل تک نہ آیا پھر دیکھیں گے کیا کیا جائے۔ فی
الحال تو سوئیں جاکر۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ میں
بھی سونے کی کوشش کرتی ہوں۔"

اس نے رسان بھرے لہجے میں انہیں مخاطب
کیا پھر دوبارہ اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ ان کے
سامنے تو خود کو مضبوط ظاہر کردیا لیکن کمرے میں آکر
برداشت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کی زندگی میں تھوڑے
سے رشتے اور گنی چنی محبتیں تھیں۔ زندگی نے اس نئے
موڑ پر بھی اپنی ازلی کنجوسی سے کام لیتے ہوئے اسے
محبت سے محروم رکھا تھا۔

شریک حیات کے حوالے سے اپنی پلکوں پر کتنے
خواب سجا کر وہ اس گھر آئی تھی۔ سسرال والوں سے کوئی
خوش گمانی نہ تھی لیکن حمدان کی ذات سے ڈھیروں
امیدیں اور توقعات تھیں۔ معاملہ اس کے برعکس نکلا تھا۔
تکیے پر سر رکھ کر اس نے ڈھیروں آنسو بہا ڈالے روتے
روتے کب آنکھ لگی اسے خود بھی پتا نہ چلا۔

دروازے پر دستک کی آواز سے آنکھ کھلی تو یوں
لگا کہ وہ چند منٹوں کے لیے ہی سوئی ہے۔ لیکن دیوار
گیر گھڑی پر نگاہ پڑی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔
اس نے کسل مندی سے اٹھ کر دروازہ کھولا باہر حسنہ
آپا کھڑی تھیں۔

"حمدان واپس آگیا ہے۔" نہایت خوشی کے
عالم میں اسے اطلاع دی گئی۔

"آپ تو ایسے خوش ہورہی ہیں جیسے وہ اولمپکس
میں گولڈ میڈل جیت کر آیا ہے۔" عبیر بدمزہ ہوکر
واپس پلٹی تھی۔

"میں تمہاری فیلنگز سمجھ سکتی ہوں چندا لیکن
تمہیں سمجھداری اور درگزر سے کام لینا ہوگا۔ بس یوں
سمجھو کہ صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آگیا ہے۔ تم اس
کی بیوی ہو اور اللہ نے میاں بیوی کے رشتے میں کچھ
ایسی کشش....."

حسنہ آپا تو اسے جانے کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں
عبیر نے تمسخرانہ انداز میں گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے

ان کی بات کاٹی۔
"صبح کا بھولا رات کو نہیں، رات کا بھولا صبح واپس لوٹا ہے اور مائنڈ اٹ! وہ بھولا کوئی عام بھولا نہیں بلکہ دولہا ہے، ایسا دولہا جس کی نئی نویلی دولہن نے سہاگ رات اکیلے سو کر گزاری ہے۔"
اس نے کاٹ دار لہجے میں انہیں جتایا تھا۔
"صحیح کہہ رہی ہو۔" ان کا جوش و خروش سرد پڑا تھا۔ نہایت شرمندگی سے انہوں نے اس کی بات کی تائید کی۔
"اماں نے اس کی خوب کلاس لی ہے اور اماں کی طبیعت کا خیال کر کے ہی وہ واپس لوٹا ہے اب تم ......" ان کی بات پھر ادھوری رہ گئی تھی سامنے سے حمدان چلتا آ رہا تھا۔
"میں چلتی ہوں تم لوگ ریسٹ کرو۔" حسنہ آپا کو اپنا وجود غیر ضروری لگا انہوں نے وہاں سے فوراً کھسکنا چاہا۔
"آپا رکیے پلیز۔" عمیر نے انہیں آواز دے کر روکا۔ وہ پلٹی تھیں
"رات بھی آپ لوگوں نے اپنی ٹینشن میں مجھے کھانے کا نہیں پوچھا، اب مجھے زبردست بھوک لگی ہے، آپ پلیز میرا ناشتہ بنا دیں اور ہاں چائے ایک دم کڑک ہونی چاہیے۔"
اس نے ان سے بے تکلفی بھرے انداز میں فرمائش کی۔ کمرے میں داخل ہوتے حمدان کو تو جیسے اس نے دیکھا تک نہیں حمدان نے البتہ ایک اچٹتی نگاہ اس پر ضرور ڈالی تھی۔
"رات کو تو واقعی کھانے کا پوچھنا یاد ہی نہ رہا۔ تم فریش ہو جاؤ میں جھٹ پٹ تم دونوں کا ناشتہ بناتی ہوں۔ حمدان کو میرے ہاتھ کے آلو کے پراٹھے بہت پسند ہیں۔ تم بتاؤ آلو کے پراٹھے کھاؤ گی یا کاشان سے کہہ کر حلوہ پوری منگواؤں یہاں قریب میں بہت لذیذ حلوہ پوری ملتی ہے۔"
"فی الحال آلو کے پراٹھے بنا لیں۔ حلوہ پوری پھر کبھی ٹرائی کریں گے۔" وہ مسکرا کر بولی تو حسنہ آپا اثبات میں سر ہلاتی پلٹ گئیں۔
حمدان بیڈ کے سرے پر بیٹھا خاموشی سے جوتے، جرابیں اتار رہا تھا عمیر دروازہ بند کر کے اس کی سمت آئی۔ حمدان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"گونگے تو نہیں ہیں کبھی پتا چلے یہاں بھی میرے ساتھ دھوکا ہو گیا۔ کل ہمارے گھر بھی ایک لفظ نہیں بولے اب بھی لب بھینچے بیٹھے ہیں۔" عمیر نے اسے مخاطب کیا۔ حمدان نے سرد سی نگاہ اس پر ڈالی مگر بولا پھر بھی نہیں۔
"اوہ اس کا مطلب ہے گونگے کے ساتھ بہرے بھی ہیں۔ چچ چچ۔"
"شٹ اپ۔" وہ بھنا کر بول پڑا۔
"میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کر کے شٹ اپ کال بھی مجھے دے رہے ہیں۔" وہ تیز ہوئی۔
"میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ اماں اور آپا کو صاف بتا دیا تھا کہ میں اس شادی پر قطعاً راضی نہیں۔ اس معاملے میں قصوروار بھی انہیں ہی ٹھہراؤ۔"
"اماں اور آپا کے بجائے آپ کو یہ بات ہم لوگوں کو بتانی چاہیے تھی۔ مجھ سے نکاح آپ نے کیا ہے۔ میں قصوروار بھی آپ ہی کو ٹھہراؤں گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
"بھلے سے ٹھہراؤ میری صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسا تھا۔ طیش کی شدید لہر نے عمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن فی الحال جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا عقل مندی کا تقاضا تھا۔
"اگر آج ولیمے کا فنکشن اٹینڈ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بتا دیں ورنہ میں اپنے ڈیڈی کو فون کرتی ہوں کہ وہ مجھے آ کر لے جائیں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سپاٹ سے انداز میں پوچھا تھا۔
"جب شادی کا فنکشن بھگتایا ہے تو ظاہر ہے ولیمے کا کڑوا گھونٹ بھی پی لوں گا۔" سیدھے سوال کا ٹیڑھا سا جواب آیا۔
"کڑوا گھونٹ ہو یا میٹھا۔ بس یہ خیال رہے کہ

آپ کے چہرے کے زاویے بگڑتے نہ ہوں۔ کل بھی آپ کے چہرے کے بگڑے زاویوں نے ہماری طرف کے بہت سے لوگوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔"
عمیر نے اسے وارننگ کے سے انداز میں سمجھایا تھا۔ حمدان جواب میں کچھ نہ بولا۔ دل ہی دل میں اس لڑکی کے تیکھے پن پر حیران ضرور ہوا تھا وہ تو ایک مغموم اور افسردہ سی لڑکی کا سوچ کر گھر لوٹا تھا۔ دل میں کسی حد تک شرمندہ بھی تھا لیکن نئی نویلی دولہن نے آتے ہی جیسے اس کی کلاس لی تھی شرمندگی کا احساس یکسر ختم ہو گیا تھا۔ اب پھر سے جھنجلاہٹ اور کوفت کا غلبہ ہونے لگا تھا۔
"میں تھکا ہوا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔ زحمت نہ ہو تو کمرے سے چلی جاؤ ویسے بھی تمہیں بہت بھوک لگی تھی۔ تمہارا ناشتہ بننے والا ہوگا۔"
حمدان نے صاف صاف اسے کمرے سے نکلنے کا کہہ دیا تھا۔ عمیر نے اسے گھورا مگر پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے چلی ہی گئی۔
☆☆☆
ولیمے کا فنکشن محدود پیمانے پر ہوا تھا۔ حمدان وغیرہ کی طرف سے گنے چنے رشتے دار شامل تھے اور دوست، احباب کو تو جیسے اس نے مدعو کرنے کا تکلف ہی نہ کیا تھا۔ اس چھوٹے سے فنکشن کے باوجود حسنہ آپا نے اسے مہنگے ترین پارلر سے تیار کروایا تھا۔ شادی والے دن وہ اگر آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی تو آج پرستان سے آئی ایک پری۔ ہر نگاہ میں اس کے لیے ستائش تھی۔ لیکن جس نگاہ میں وہ اپنے لیے ستائش دیکھنے کی دل سے متمنی تھی اس نے آج بھی نگاہ غلط ڈالنے کا تکلف نہ کیا ہاں غنیمت تھا کہ وہ آج لبوں پر مسکراہٹ سجا کر لوگوں سے مبارک باد وصول کر رہا تھا۔
اب اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ یہ عمیر کی تنبیہ کا اثر تھا یا آج ان کی اپنی طرف کا فنکشن تھا اس لیے اخلاق دکھا رہا تھا۔ بہرکیف وہ آج ڈیڈی سے بھی خاصے ادب اور تمیز سے ملا تھا۔
زوبی آنٹی گول گول آنکھیں گھما کر حمدان کو گھورے ہی جا رہی تھیں گویا نظر لگا کر دم لیں گی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ بلا کا جاذب نظر اور خوبرو تھا۔ عمیر نے خود سارا وقت اپنے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے رکھی۔ تقریب کے اختتام پر ڈیڈی نے رسم کے مطابق ان دونوں کو اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔
"ابھی کچھ تھکاوٹ ہے سر! پھر حاضر ہو جاؤں گا ہاں اگر عمیر جانا چاہیں تو انہیں ساتھ لے جائیں۔"
حمدان نے شائستگی سے معذرت کی۔
"ایک دو دن میں یہ دونوں اکٹھے ہی چکر لگا لیں گے۔ کیوں عمیر؟"
حسنہ آپا نے فوراً گفتگو میں مداخلت کی۔ عمیران کا خدشہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ گھر جا کر ڈیڈی کو سب کچھ نہ بتا دے۔ ان بے چاری کو کیا خبر تھی کہ عمیر کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے حسنہ آپا کی بات سن کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اوکے ڈیئر پھر ملاقات ہوگی۔" زوبی آنٹی نے اس کے گال چٹاچٹ چومے پھر ڈیڈی کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔
"یہ تم لوگوں کی کرائے دار تمہارے گھر کے ہر معاملے میں بہت دخیل ہے۔ ہم تو جب بھی تمہارے باوا سے ملے یہ ہر ملاقات میں موجود ہوتی تھی۔"
تقریب کے اختتام پر واپسی کے سفر میں اماں کو کچھ خیال آیا تو پوچھ بیٹھیں۔
عمیر جانتی تھی کبھی نہ کبھی یہ سوال ضرور کیا جائے گا لیکن وہ اپنی کمزوری کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"ہاں زوبی آنٹی بہت جلد ہماری فیملی کا باضابطہ حصہ بننے والی ہیں۔ میں اسی شرط پر شادی پر راضی ہوئی تھی کہ ڈیڈی بھی اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں۔ انہوں نے بہت تنہائی بھگت لی۔ میرے کہنے پر وہ زوبی آنٹی سے شادی پر راضی ہوئے ہیں۔"
یہ اس کے اپنے دل کا چور تھا جو وہ سب کو باور کروا رہی تھی کہ اس کی بات مان کر ڈیڈی شادی پر راضی ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ٹکڑے ہونے کا تاثر قائم رکھنا چاہتی تھی۔ کبھی کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ باپ اپنی مرضی

اور پسند سے شادی رچا کر بیٹی سے غافل ہو جائے گا۔
"لیکن یہ عورت تو مرتضیٰ صاحب سے عمر میں بھی بہت بڑی لگتی ہے۔" حسنٰی آپا نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔
"عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے۔ میاں بیوی میں انڈر اسٹینڈنگ ہونی چاہیے۔ ویسے بھی بیوہ خاتون ہیں انہیں سہارا مل جائے گا اور ڈیڈی کی تنہائی دور ہو جائے گی۔"
"ٹھیک کہہ رہی ہو اللہ دونوں کو خوش رکھے اور عمروں میں بھی کہاں اتنا فرق ہو گا۔ وہ بے چاری دکھیاری عورت اپنی عمر سے بڑی لگتی ہوگی اور مرتضیٰ میاں تو ویسے ہی عمر چور ہیں، جب ہم پہلی بار ان سے ملے تو حیران رہ گئے تھے۔ وہ تو لڑکی کے باپ سے زیادہ بڑے بھائی دکھ رہے تھے۔" اماں مسکرا کر بولیں۔ میر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"میرے ڈیڈی عمر چور نہیں بلکہ وہ جتنے لگتے ہیں، اصل میں اس سے بھی دو چار برس کم کے ہی ہیں دراصل ڈیڈی میری دادی کے اکلوتے بیٹے تھے ان کی بائیسویں سالگرہ سے پہلے دادی نے ان کے سر پر سہرا سجا دیا تھا اور وہ تئیس سال کے تھے کہ میں ان کی گود میں آ گئی۔ ان کے جو ایک دو بچپن کے دوست ہیں سب کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ڈیڈی نے بیٹی کی شادی بھی بھگتا دی۔"
بات کے آخر میں باپ پر آیا پیار کسی قدر خفگی میں بدل گیا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتا حمدان دل ہی دل میں قدرے حیران تھا، اس لڑکی نے کتنی جلدی اس کی ماں بہن سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ کس بے تکلفی سے یہ آپس میں محو گفتگو تھے کون کہہ سکتا تھا پٹر پٹر بولنے والی یہ ایک دن کی دلہن ہے۔
"تمہاری ماں بہت کم عمر لکھوا کر لائی تھی بیٹا! تمہارے باپ نے جس ہمت اور حوصلے سے تمہاری پرورش کی وہ قابل ستائش ہے۔ مناسب عمر میں تمہیں گھر بار کا کر دیا۔ شریک سفر کے بغیر یہ سب مرحلے نمٹانا آسان نہیں۔"
اماں ڈیڈی کو سراہ رہی تھیں۔ وہ ان سے اختلاف تو کیا کرتی ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔
اس کے مستقبل کے حوالے سے ڈیڈی نے جو فیصلہ کیا، اس کا سبب ان کی عجلت پسندی بنی تھی یا یہ اس کا نصیب تھا۔ سپاٹ چہرے والے ڈرائیور کو دیکھ کر وہ فقط سوچ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

حمدان کے سنگ نہ سہی مگر اس گھر میں وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر چکی تھی۔ یہ گھر ویسا گھر نہیں تھا جیسا وہ سوچ کر آئی تھی۔ وہ سسرال کا تصور ذہن میں بٹھا کر، سسرال والوں سے نمٹنے کے بلند و بانگ عزائم کے ساتھ یہاں آئی تھی لیکن اس گھر کو سسرال کہنا تو شاید لفظ سسرال کی بھی توہین ہی تھی۔ یہاں اسے ساس نند اور دیور سے نہیں بلکہ اماں، آپا اور کاشی سے واسطہ پڑا تھا۔
شروع شروع میں تو وہ یہ سمجھی تھی کہ وہ لوگ حالات کے پیش نظر، اس کے دباؤ میں آ کر اس سے اس قدر حسین سلوک برت رہے ہیں۔ لیکن جلد ہی اس کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔
ان لوگوں کا تو خمیر ہی محبت اور مروت سے اٹھا تھا۔ ہاں اماں اور حسنٰی آپا اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے اس کے سامنے بار بار شرمندگی کا اظہار تو کرتی تھیں لیکن اسے اب ان کا شرمندہ ہونا خود شرمندگی میں مبتلا کر دیتا۔
"ہم نے سوچا تھا اتنی حسین اور کم عمر بیوی پا کر وہ فریحہ کو بھول بھال جائے گا لیکن یہ سب سوچتے ہوئے ہم نے تمہارے بارے میں نہیں سوچا۔ شادی کے بعد اگر شوہر ہی بیوی کو اس کا جائز مقام نہ دے تو لڑکی کی زندگی تو برباد ہی ہوگئی نا۔ حمدان سے زیادہ ہم تمہارے مجرم ہیں۔ ہمیں معاف کر دینا بیٹی۔"
اماں کے لہجے میں صدیوں کی تھکن ہوتی۔ اولاد کی خوشی دیکھنے کے معاملے میں وہ کتنی بدنصیب تھیں۔ برسوں پہلے بیٹی کی شادی کی، وہ شادی بھی کامیاب نہ ہوئی بیٹی اجڑ کر دوبارہ ان کی دہلیز پر آن

جیٹھی۔ اب بیٹے کے سر پر سہرا سجایا تو وہ اپنی بیوی سے قطعی لاتعلق اب بھی اپنی محبوبہ کی زلف کا ہی اسیر تھا۔

ان کی شرمندگی کے اظہار پر میرب اب ان سے باقاعدہ خفا ہو جاتی۔ "مجھے یہ گھر سسرال نہیں بلکہ اپنا گھر لگنے لگا ہے۔ میری ساری زندگی بہت محرومیوں سے عبارت رہی ہے اماں! ہوش سنبھالا تو سر پر ماں کا سایہ نہ تھا بہن بھائی قدرت نے نہ دیے۔ میں تین سال کی تھی جب امی کو کینسر کی تشخیص ہوئی۔ ڈاکٹرز نے فیملی بڑھانے کی اجازت نہ دی۔ چھ سات برس تک امی کینسر کے ساتھ جنگ لڑتی رہیں کبھی وہ بیماری پر غالب آ جاتیں کبھی بیماری انہیں پچھاڑ دیتی۔ آخرکار اس موذی مرض نے ہمیشہ کے لیے میری ماں کو چھین لیا۔ میرے پاس صرف ماں اور باپ کا رشتہ تھا ان دو میں سے بھی ایک رشتہ چھن گیا۔

دادی، دادا تو کب کے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ امی کے بعد دو برس تک نانی حیات تھیں تو کسی حد تک ان کی محبت ملی، ان کے بعد ماموں، ممانیوں نے پلٹ کر نہیں پوچھا۔ دنیا میں ڈیڈی میرا واحد رشتہ تھے۔ ڈیڈی نے مجھے بھرپور توجہ دی لیکن انہیں اپنے کام اور کاروبار کو بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے گھر میں بے کیف صبحوں، اداس دوپہروں اور تنہا شاموں کے ساتھ زندگی گزاری ہے اماں! اس گھر میں آ کر میں نے پہلی بار رشتوں کا ذائقہ محسوس کیا ہے۔ ماں کی شفقت کیا ہے۔ بڑی بہن کا کیا روپ ہوتا ہے۔ چھوٹے بھائی کے لاڈ کیسے اٹھائے جاتے ہیں، یہ سب مجھے اس گھر میں آ کر پتا چلا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے حمران نے بیوی کی حیثیت میں قبول نہیں کیا ہے لیکن مجھے یہاں آ کر اور اتنی محبتیں ملی ہیں کہ میں اپنی زندگی کی اس کمی پر بھی شاکر ہوں۔" اس نے اماں کے ہاتھ تھام کر پورے خلوص سے اپنی دلی جذبات سے آگاہ کیا تھا۔

"میری بچی! اللہ تجھے خوش و خرم رکھے۔ شاد آباد رکھے۔" اماں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"حمران بدنصیب ہے جو ہیرے کی قدر نہیں کر رہا۔" آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے ان کی تان پھر وہیں ٹوٹی تھی۔

"آپ دعا کرتی رہیں اس کی بدنصیبی خوش نصیبی میں بدل جائے۔" وہ ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"میرا اللہ اس کی آنکھوں پر پڑا پردہ ضرور ہٹائے گا اسے جب ان لوگوں کی اصلیت پتا چلے گی، لوٹ کر یہیں آئے گا۔" ان کے لہجے میں یقین تھا۔ میرب نے مسکراتے ہوئے آمین تو کہہ دیا تھا۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ اسے ایسی کوئی خوش گمانی نہ تھی۔

☆☆☆

حمران اس گھر میں مہمانوں کی طرح رات کے چند گھنٹے گزارنے آتا تھا۔ رات گئے وہاں سے لوٹتا تھا مزے کی بات تھی کہ وہ لوگ اسے کھانا کھلانے کا تکلف بھی نہیں کرتے تھے۔

حسنا آپا اس کے انتظار میں جاگتی رہتی تھیں۔ وہ ہی اب تک اس کے کپڑے لتے کی ذمہ داری نبھا رہی تھیں۔ دھلے دھلائے استری شدہ کپڑے، چمکے چمکائے جوتے، مزے دار ناشتہ، آفس کے لیے تیار لنچ باکس۔ وہ بنا ماتھے پر شکن لائے سارے کام انجام دیتیں۔

حمران تنخواہ کا ایک حصہ گھر دے کر اپنے تئیں ساری ذمہ داریاں بھگتا دیتا۔ آفس جانے سے پہلے کھڑے کھڑے رسمی انداز میں اماں کی خیریت اور ان کی دوائیوں کے بارے میں پوچھ کر اچھا بیٹا ہونے کا ثبوت بھی دے دیتا۔

میرب کو اس سے یا اس کو میرب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ رات گئے گھر آتا تو میرب گہری نیند سوئی ہوتی۔ صبح اگر اس کے آفس جانے سے پہلے جاگ بھی جاتی تو اس سے ہم کلام ہونے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔

اس گھر میں اس کے لیے بہتیری مصروفیات تھیں۔ چھوٹا سا باغیچہ جو اس کی شادی سے پہلے اجڑی حالت میں تھا اب سرسبز و شاداب ہو چکا تھا۔ کاشی کے پالتو پرندے بھی اب دیور، بھابھی دونوں کی

مشترکہ ذمہ داری تھے۔ کاشان کو پڑھائی میں بھی اس کی مددگار رہی۔

عبیر خود ایک اوسط درجے کی اسٹوڈنٹ سہی مگر اچھے تعلیمی اداروں میں پڑھنے کی وجہ سے اسے انگریزی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ کاشان کی اسپوکن بھی کمزور تھی اور گرامر بھی۔ عبیر بہت توجہ اور دل جمعی سے اسے پڑھانے کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے تھی۔ کرکٹ بھی دونوں کا مشترکہ شوق اور دلچسپی تھی۔ میچ پاکستان کا ہوتا تو وہ پورے اہتمام سے میچ دیکھتے۔ کولڈ ڈرنک، چپس نمکو، پکوڑوں کا دور چلتا رہتا اور ہر اچھے شاٹ یا مخالف ٹیم کی وکٹ گرنے پر مل کر شور مچاتے۔

حسنہ آپا کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ گھر کے کاموں میں ان کا بھرپور ہاتھ بٹاتی۔ ہاں ان کے لاٹ صاحب بھائی کا کوئی کام کرنا اسے ہرگز گوارا نہ تھا اس کے علاوہ وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ حسنہ آپا کو زیادہ سے زیادہ آرام دے۔

اس گھر میں اگر اسے کسی پر سب سے زیادہ ترس آتا تو وہ حسنہ آپا ہی تھیں۔ اپنی ذات یکسر فراموش کرتے ہوئے گھر کے ہر بندے کی خدمت کے لیے مستعد اور چاق و چوبند۔ وہ اچھی بھلی خوش شکل تھیں لیکن اپنے آپ پر ذرا توجہ نہ دیتیں۔

"طلاق یافتہ ہونے کا یہ مطلب نہیں حسنہ آپا کہ آپ زندگی کا ہر رنگ اور ہر خوشی خود پر حرام کرلیں اور یہ آپ کیا بڈھوں جیسا حلیہ بنائے پھرتی ہیں۔ خود پر توجہ دیا کریں۔ آپ بہت خوب صورت ہیں اور زندگی بھی اتنی بدصورت نہیں۔ زندگی کی رعنائیوں میں سے اپنا حصہ ضرور لیں۔" وہ انہیں پیار سے سمجھاتی۔

"زندگی کی رعنائیوں میں اب میرا کوئی حصہ نہیں۔ میں اپنی زندگی جی چکی ہوں چندا!"

ان کے لبوں پر مغموم سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ عبیر کا بس نہ چلتا وہ کیسے ان کے لبوں کو مسکرانے پر مجبور کردے۔ کیسا ظالم انسان تھا جو اس خوب صورت اور خوب سیرت بیوی کو طلاق کا پروانہ تھما کر خود ایک ہنستی بستی نئی زندگی کا آغاز کرچکا تھا۔ اس ظالم انسان سے بڑھ کر ظالم وہ بھائی تھا۔ جو بہن کی اجڑی زندگی کا سبب اس کی اپنی عادتوں کو قرار دیتے ہوئے اپنی محبت میں مست، مگن تھا۔

"میں نے آپ کے ساتھ اتنا کم وقت گزارا ہے۔ مجھے آپ کے مزاج اور عادتوں کا اتنی اچھی طرح پتا چل گیا ہے تو آپ کا وہ عقل کا اندھا بھائی کیسے کہتا ہے کہ آپ کے گھر نہ بسانے کا سبب آپ خود تھیں۔" اماں سے حسنہ آپا کی بیتی زندگی کی ساری کہانی سن کر وہ حسنہ آپا کے ہی سر ہو جاتی۔

"وہ وہی کہتا ہے جو فریحہ کہتی ہے۔ میں زبان دراز تھی۔ توقیر کو اس کی ماں، بہنوں کے خلاف ورغلاتی تھی۔ میری وجہ سے اس گھر میں ہر وقت ٹینشن پھیلی رہتی تھی، میں نے توقیر کو اس کی اکلوتی لاڈلی بہن سے بدگمان کرنے کی بھی بہت کوشش کی، میری وجہ سے توقیر پردیس جا بسا اور میری وجہ سے ہی وہ ماں بیٹی اپنے بیٹے اور بھائی کی شکل دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔"

حسنہ آپا پھیکی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اپنے خلاف چارج شیٹ پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ عبیر تاسف بھرے انداز میں انہیں دیکھے گئی۔

"سچ کہوں تو عبیر! بیتے برسوں میں، میں نے اپنے متعلق یہ سب اتنے تواتر سے سنا ہے کہ مجھے کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ وہ لوگ سچے اور میں خود جھوٹی ہوں۔"

"آپ نے کبھی حمدان کو اپنی طرف کا سچ بتانے کی کوشش کیوں نہ کی؟" وہ ناراض ہوتے ہوئے پوچھتی۔

"شروع شروع میں کرلی تھی، وقتی طور پر حمدان یقین بھی کرلیتا تھا لیکن فریحہ کے آنسو میری باتوں سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ وہ توقیر کو بھی ان آنسوؤں سے اپنا ہم نوا بنالیتی تھی۔ جب مجھے احساس ہوگیا کہ حمدان کے لیے فریحہ کا سچ ہی قابل اعتبار ہے تو میں نے اپنا سچ اپنے پاس رکھ لیا۔" وہ دھیرے سے بولی تھیں۔

"فریحہ سے اس دھواں دھار عشق کے باوجود وہ مجھ سے شادی پر راضی کیسے ہوگیا۔" عبیر حیران تھی۔

"وہ فریحہ کو ہی اس گھر میں دلہن بنا کر لانا چاہتا

تھا۔اماں اپنی تمام تر نرم مزاجی کے باوجود اس بات پر راضی نہ تھیں۔ ہر دوسرے دن گھر میں یہ ہی بحث چھڑ جاتی پھر اس روز اماں کا بی پی خطرناک حد تک ہائی ہو گیا۔ خدا نے کرم کیا کہ ناک سے خون آ گیا ورنہ برین ہیمرج کا خطرہ تھا۔

ڈاکٹرز نے اماں کی ممکنہ کنڈیشن کا ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ وہ مجبور ہو کر اماں سے اقرار کر بیٹھا کہ وہ اماں کی بات مان لے گا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اماں اس برق رفتاری سے اس کا رشتہ بھی طے کر دیں گی۔ پھر جو ہوا میں اسے معجزہ ہی کہوں گی جانے کیسے اس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے قول اور اماں کی زبان کا پاس رکھا۔ ہمیں لگتا تھا کہ وہ یہ قول شادی کے بعد بھی نبھائے گا۔ رشتہ جڑنے کے بعد اسے ایمان داری سے نبھائے گا۔ کیا خبر تھی کہ وہ پھر سے اپنی ہٹ دھرمی پہ اتر آئے گا۔"

ان کے کہنے پر عمیر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میاں بیوی کے رشتے میں اللہ نے بہت کشش رکھی ہے عمیر! تم اسے اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش تو کر سکتی ہو۔ چند گھنٹوں کے لیے سہی وہ گھر آتا تو ہے۔ بناؤ سنگھار کر کے اس کا استقبال کرو۔ تمہاری بری کے کپڑے کتنے خوب صورت ہیں۔ اتنے چاؤ سے بنوائے تھے ہم نے تم کوئی خوب صورت سا جوڑا پہن کر اچھا سا میک اپ کر کے....."

"پلیز حسنہ آپی!" عمیر نے یکدم ان کی بات کاٹی۔ "میری بھی خواہش ہے کہ میں حمدان کے سنگ ایک نارمل زندگی جیوں لیکن میں ہرگز نہیں چاہتی کہ وہ کسی وقتی کشش کے زیر اثر مجھ تک آئے۔ رشتہ تب ہی پائیدار ہوتا ہے جب دونوں فریق پوری دلی آمادگی کے ساتھ ایک دوسرے کو قبول کریں اور بہرحال مجھے اپنی عزت نفس کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ عزیز ہے۔"

اس نے صاف اور واضح الفاظ میں اپنا موقف بتا دیا تھا۔

بات غلط نہ تھی حسنہ آپا کیسے اختلاف کرتیں لیکن وہ دل کی گہرائیوں سے اس کانچ سی لڑکی کی خوشیوں بھری زندگی کے لیے دعاگو تھیں۔ عین یہ ہی جذبات ان کے لیے اس کانچ سی لڑکی کے بھی تھے۔

قدرت نے پہلے ایک کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دیا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد عمیر محض دو تین بار میکے گئی تھی۔ پہلی بار اماں نے بہت منت سماجت کر کے حمدان کو بھی اس کے ہمراہ بھیجا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ کسی مصروفیت کا بہانا کر کے اجازت لے کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد عمیر نے اماں کو منع کر دیا تھا کہ وہ حمدان کو ساتھ جانے پر مجبور نہ کیا کریں۔

وہ کاشی کے ساتھ چلی جاتی اور ڈیڈی کے پاس چند گھنٹے گزار کر کاشی کے ہمراہ ہی واپس لوٹ آتی۔ ڈیڈی نے دو تین بار حمدان کے بارے میں استفسار ضرور کیا لیکن اس نے اس کے آفس ٹائمنگ کا ٹف شیڈول بتا کر انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

آج کل کاشی کے پیپرز ہو رہے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت دنوں سے ڈیڈی کی طرف چکر نہ لگا پائی تھی۔ ڈیڈی خود آج کل مصروف تھے۔ انہوں نے اپنی شادی کی ڈیٹ فکس کر لی تھی۔ عمیر کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈیڈی سادگی سے شادی بھگتانا چاہ رہے ہوں گے لیکن زوبی آنٹی کی فرمائشوں کی وجہ سے وہ آج کل ٹھیک ٹھاک مصروف ہوں گے وہ ایسے میں ڈیڈی کی مصروفیت میں مخل نہ ہونا چاہتی تھی لیکن اس دن ڈیڈی کا خود ہی فون آ گیا۔

"بہت مصروف ہو گئی ہو بیٹا۔ باپ کو تو بالکل ہی بھلا دیا۔" اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے تھکے تھکے انداز میں شکوہ کیا۔

"کیا ہوا ہے ڈیڈی؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" وہ ان کی آواز اور انداز پر ٹھٹکی تھی۔

"ٹھیک ہوں بیٹا! مجھے کیا ہونا۔" دوبارہ اسی انداز میں جواب دیا۔

"نہیں آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ زوبی آنٹی کہاں ہیں اور آپ لوگوں کی شادی کی تیاری کہاں تک پہنچی۔" اس نے پوچھا۔

"نام نہ لو اس حرافہ کا میرے سامنے۔" وہ متنفر بھرے لہجے میں بولے۔

"حرافہ؟" میر کو تو گویا چار سو چالیس واٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

"تم آجاؤ بیٹا! تمہارے باپ کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔" ڈیڈی ضرورت سے زیادہ نڈھال تھے۔

"میں پہنچتی ہوں ڈیڈی! آپ فکر نہ کریں۔ آرہی ہوں میں۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر ڈیڈی کے پاس پہنچ جائے۔

"میں گھر جا رہی ہوں اماں! ڈیڈی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"ارے رکو تو سہی کاشی کو تو آلینے دو۔" اماں نے اسے روکنا چاہا۔

"میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔" وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اماں ارے، ارے ہی کرتی رہ گئیں۔

ڈیڈی کے پاس پہنچی تو وہ غم سے نڈھال تھے۔

"کیا ہو گیا ہے ڈیڈی! کہیں زوبی آنٹی سے کوئی جھگڑا وگڑا تو نہیں ہو گیا۔" میر کی سوچ کے گھوڑے بس یہیں تک دوڑ پائے تھے۔

"زوبی نہیں زبیدہ بیگم۔" ڈیڈی چبا چبا کر بولے۔ میر نے حیرت سے انہیں دیکھا مگر کچھ بولنے کے بجائے ان کے مزید بولنے کا انتظار کیا۔

"عمر میں بھی مجھ سے دو چار نہیں پورے آٹھ برس بڑی تھی۔"

"لگتا ہے آپ نے ان کا شناختی کارڈ دیکھ لیا۔ عورتیں عمر بتاتے ہوئے ڈنڈی مار لیتی ہیں ڈیڈی! اس میں ایسا کیا غضب ہو گیا۔" اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ڈیڈی اس بات کی وجہ سے اتنے سنجیدہ ہیں۔

"دو چار برس کی بات ہوتی بیٹا! تو میں ڈنڈی مارنے کا مارجن دے دیتا۔ یہ تو ڈنڈی نہیں سراسر ڈنڈا تھا۔" ڈیڈی حد سے زیادہ برہم تھے۔

"تو آپ ان کی غلط بیانی پر ان سے خفا ہیں۔" میر نے پوچھا۔

"بات غلط بیانی کی ہوتی تو خیر تھی بیٹا! شکر کرو میں اس عورت کے غلط ارادوں کی بھینٹ نہیں چڑھا۔ اللہ نے تمہارے ڈیڈی کی جان بچالی۔"

"آپ پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہیں ڈیڈی! کھل کر بتائیں۔" میر قدرے جھنجلائی تھی۔ ڈیڈی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"پرسوں وہ عورت میرے ساتھ شادی کا جوڑا لینے کے لیے شاپنگ مال گئی، وہاں اللہ نے طیب کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا۔ طیب یاد ہے نا تمہیں میرا دوست بہت عرصے بعد اس سے ملاقات ہوئی۔ جب سے اس نے حیدرآباد میں گارمنٹس کا کام شروع کیا ہے وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ طیب زبیدہ بیگم کو دیکھ کر چونکا تو وہ زبیدہ بیگم بھی اسے دیکھتے ہی طبیعت خرابی کا بہانہ بنا کر رفو چکر ہو گئی۔ میں تو پریشان ہو کر اس کے پیچھے لپک رہا تھا۔ طیب نے ہی مجھے روکا اور اسی نے مجھے اس عورت کی اصلیت بتائی۔ وہ محض بیوہ نہیں اس سے پہلے دو بار کی مطلقہ بھی تھی۔ تیسری طیب کے چچا زاد بھائی سے شادی رچائی طیب کا کزن میری طرح رنڈوا تھا اور بے چارہ بے اولاد بھی۔ اچھا بھلا ہٹا کٹا انسان شادی کے کچھ عرصے بعد ہی جس انداز میں اللہ کو پیارا ہوا خاندان والوں کو وہ طبعی موت نہیں بلکہ پلاننگ کے تحت کیے جانا والا قتل لگی تھی۔

اس عورت کے خلاف ڈھیروں ثبوت بھی پولیس کے ہاتھ لگے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے جیل کی ہوا کھائی لیکن اس شاطر عورت نے جو پیسہ سابقہ شوہروں سے ہتھیایا تھا وہ پانی کی طرح بہا کر اپنے اوپر لگا قتل کا داغ دھو ڈالا۔ مرحوم بے اولاد تھا۔ بھائی ملک سے باہر۔ طیب وغیرہ نے ایک حد تک تو کیس کی پیروی کی مگر اس مصروف دور میں کون مرے ہوؤں کی خاطر وقت اور پیسہ لگاتا ہے۔

عدم پیروی اور پولیس کی نالائقی اور ملی بھگت کے سبب ٹھکڑے ثبوت ناکافی ثبوتوں میں بدل گئے اور یہ عورت کسی اور ٹھکڑے مرغے کو پھانسنے کے لیے رہا ہو گئی۔ میرے تو سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں کہ اگر طیب مجھے نہ ملتا تو یہ عورت میرا کیا حشر کرتی۔ میرا پیسہ ہتھیا کر پھر سے خود پر مطلقہ کا ٹھپہ لگواتی یا بیوہ ہونا پسند کرتی۔"

"او مائی گاڈ۔" عمیر کو یہ سن کر باقاعدہ جھرجھری آگئی تھی۔ "اللہ کا شکر ہے ڈیڈی! آپ محفوظ رہے۔" اس نے فرط جذبات سے ان کے ہاتھ چوم لیے تھے۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں بیٹا! تم نے کتنی بار اس عورت کے لیے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی، اس کی ہیرا پھیریوں کے متعلق مجھے بتانے کی کوشش کی اور میں یہ سمجھتا رہا کہ یہ صرف تمہاری جیلسی ہے کہ تم اسے اپنے باپ کی زندگی میں برداشت نہیں کر پا رہی ہو۔"

ڈیڈی کو اب جا کر احساس ہو رہا تھا کہ عمیر نے کب کب انہیں زوبی کے متعلق بتانے کی کوشش کی تھی۔

"اس عورت کی حرکتیں تو مجھے ہمیشہ ہی قابل اعتراض لگتی تھیں ڈیڈی! لیکن وہ اتنے کرمنل ریکارڈ کی مالک ہوگی یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔" عمیر خود شاک کی حالت میں تھی۔

اس نے بہت بار زوبی کو گھر کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرتے دیکھا۔ ایک بار تو اس نے عمیر کی سونے کی چین تک چرائی تھی جو اس کی مرحومہ ماں کی نشانی تھی۔ عمیر نے ڈیڈی کے سامنے برملا اپنے شک کا اظہار کیا تھا کیونکہ گھر کے ہر کونے تک صرف زوبی کی رسائی تھی۔ ڈیڈی نے چین کے گم ہونے کو بیٹی کی لاپروائی قرار دیا تھا، ان کے خیال میں وہ قیمتی چین کہیں گرا بیٹھی ہے۔

عمیر کو یاد تھا کہ وہ جس وقت نہانے کے لیے واش روم گئی تھی تو اس وقت اس کے کمرے میں زوبی آنٹی ہی آئی تھیں۔ وہ تو ان کی پائل کی تک تک سے بھی ان کو بنا دیکھے پہچان سکتی تھی لیکن ڈیڈی عمیر کی بات سن کر اس پر باقاعدہ بگڑ گئے تھے۔

اس دن کے بعد عمیر نے اپنی قیمتی چیزوں کی ٹھیک سے حفاظت تو شروع کر دی لیکن ڈیڈی سے زوبی آنٹی کے خلاف لچھ بھی کہنا بند کر دیا۔ وہ عورت تو اتنی گری ہوئی حرکتیں کرتی تھی کہ فریزر سے گوشت کے پیکٹ اور فریج سے دودھ کے ڈبے تک اٹھا کر چپکے سے چلتی بنتی۔

عمیر شروع شروع میں تو خوب کڑھتی پھر یہ سوچ کر خود کو سمجھا لیا کہ آنے والے کل میں اس عورت نے اس گھر کی باقاعدہ مالکن بن ہی جانا ہے تو ان ذرا ذرا سی چیزوں کی چوری پر اپنا دل کیوں جلائے۔

وہ اسے چھوٹی موٹی چورنی سمجھتی رہی لیکن وہ تو اتنی خطرناک عورت نکلی۔ اس وقت ڈیڈی کو مزید کچھ جتانا ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ یہ باپ کو تسلی دینے اور ان کی دل جوئی کرنے کا موقع تھا نا کہ ان کو ماضی کی باتیں یاد دلا کر شرمندہ کرنے کا۔

وہ اتنے دل گرفتہ تھے کہ عمیر نے گھر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اماں کو فون کر کے اس نے دو تین دن یہیں رکنے کا کہہ دیا۔

رات گئے اس کے فون پر حمدان کی کال آئی۔ سپاٹ سے انداز میں وہ اس کے باپ کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔ عمیر کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ یقیناً اماں کی زور، زبردستی کا نتیجہ ہوگا۔

"اگر انکل کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانے کے لیے میری مدد کی ضرورت ہو تو بتا دینا میں آ جاؤں گا۔" لٹھ مار انداز میں اپنی خدمات بھی پیش کر دیں۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ ڈیڈی کافی بہتر ہیں۔ شکریہ۔"

اس نے بھی اسی سپاٹ سے انداز میں جواب دیا تو دوسری طرف سے اوکے کہہ کر فون بند کر دیا گیا البتہ اگلے دن اماں اور حسنہ آپا ڈیڈی کی خیریت دریافت کرنے آ گئے تھے۔

حسنہ آپا مریض کے لیے سوپ بنا کر لائی تھیں۔ ڈیڈی بے چارے وضاحت بھی نہ کر پائے

کہ وہ بیمار نہیں فقط زود رنج ہیں۔ خیر حسنہ آپا کا لایا سوپ انہوں نے بہت رغبت سے پیا تھا۔ غنیمت رہا کہ اماں کو زوبی آنٹی کے متعلق پوچھنا یاد نہ رہا لیکن تین دن بعد جب عمیر گھر گئی تو اس نے اماں اور حسنہ آپا سے کچھ نہ چھپایا۔ شادی کے شروع شروع میں وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں ہلکان رہتی تھی لیکن اب اسے اپنا وہ رویہ بے وقوفی لگتا تھا۔

اماں تو اب اس کی اماں تھیں اور حسنہ آپا بڑی بہن کی جگہ لے چکی تھیں ان لوگوں سے اپنے مسئلے چھپانے سے کیا حاصل تھا۔ دونوں کو ہی ڈیڈی کا قصہ سن کر ان سے دلی ہمدردی ہوئی تھی۔

"فکر مت کرو بیٹا! بلکہ شکر کرو کہ اس عورت سے مرتضٰی میاں کی جان چھوٹ گئی اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اللہ تمہارے باوا کو کسی نیک اور صالح عورت کا ساتھ نصیب کرے سمجھاؤ انہیں کہ ایک عورت سے دھوکا کھا کر اپنا دل چھوٹا نہ کریں اللہ بہتر نعم البدل عطا کرے گا۔"

اماں اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں سمجھا رہی تھیں ان کی بات سن کر اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

"بہترین نعم البدل۔" اس نے زیر لب دہرایا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

☆☆☆

دو چار دن نہیں اس نے پورا مہینہ اس بات پر غور و خوض کیا تھا پھر بہت ہمت کر کے اپنا مدعا لے کر اماں کے پاس جا پہنچی وہ اس کی بات سن کر اتنی ہی حیران ہوئیں جتنی اسے توقع تھی۔

"حسنہ اور مرتضٰی میاں لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ حیرانی بھرے لہجے میں استفسار کر رہی تھیں۔

"اس میں ناممکن والی تو کوئی بات نہیں اماں! حسنہ آپا ساری زندگی تنہا تو نہیں گزاریں گی نا۔ میں نے خود آپ کو کتنی بار رب کے حضور گڑگڑاتے سنا ہے آپ کی اپنی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ از سر نو گھر بسا کر ایک خوش و خرم زندگی گزاریں۔ اگر میرے ڈیڈی سے ان کا رشتہ جڑ جاتا ہے تو نہ صرف میرے ڈیڈی کا بھلا ہو جائے گا بلکہ حسنہ آپا بھی ایک بھرپور زندگی جی پائیں گی۔ اس بارے میں سوچیں تو سہی۔"

وہ اماں سے منت بھرے لہجے میں مخاطب تھی لیکن ان کے چہرے پر پھیلا تذبذب کم نہ ہوا۔

"ڈیڈی کی عمر کچھ اتنی زیادہ بھی نہیں۔ وہ خوش شکل ہیں۔ مالی لحاظ سے مستحکم پھر بے انتہا شریف۔ اپنے ڈیڈی کے کردار کی گواہی مجھ سے بہتر کون دے سکتا ہے۔ جب وہ مسلسل تنہائی اور اکیلے پن سے گھبرا گئے تب بھی انہوں نے کبھی کسی غلط راستے کی طرف قدم نہ بڑھائے۔ بلکہ وہ از سر نو نکاح کے مقدس بندھن میں بندھنا چاہتے تھے۔ بس ان سے شریک حیات کے انتخاب میں غلطی ہو گئی، میں نہیں چاہتی وہ دوبارہ کسی ایسی غلطی کا ارتکاب کریں۔

میرے ڈیڈی جتنے اچھے ہیں وہ اتنی ہی اچھی شریک سفر ڈیزرو کرتے ہیں اور مجھے ان کے لیے حسنہ آپا سے بہتر کوئی نہیں لگا۔ پلیز اماں آپ میرے ڈیڈی کے بارے میں سوچیں تو سہی۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ ان کے لبوں سے فوراً اقرار سن لے۔

"مرتضٰی میاں کی اچھائیوں سے کس کو انکار ہے بیٹا! جس شخص نے تن تنہا اپنی بیٹی کی پرورش اتنے بہترین خطوط پر کی ہے، وہ خود کیسا ہو گا اس بارے میں کوئی دو رائے ممکن ہی نہیں۔ اگر حسنہ کی زندگی میں ان جیسا شخص آتا ہے تو یہ حسنہ کی خوش قسمتی ہو گی میں مرتضٰی میاں کی وجہ سے رشتے سے انکاری نہیں ہوں بیٹا لیکن مجھے حسنہ کا جواب پتا ہے وہ دوسری شادی پر ہامی بھرتی تو اب تک میں اس کے فرض سے فارغ نہ ہو چکی ہوتی۔ اس کی طلاق کے بعد برے، بھلے دو چار رشتے تو آئے تھے لیکن اس نے جیسے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ دوسری شادی کے بارے میں سوچے گی بھی نہیں۔

وہ اپنے پہلے تجربے سے ہی اتنی خوف زدہ ہے کہ دوبارہ اس تجربے سے گزرنے کی ہمت نہیں کر پائی اور پھر رشتہ تمہارے باوا کا ہے تو حمدان بھی کہاں مانے گا۔" اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اپنے لاٹ صاحب بیٹے کو تو رہنے دیجیے آپ

مجھے اپنا فیصلہ بتائے اگر آپ راضی ہوں تو پہلے میں ڈیڈی کی رائے لوں گی اور اس کے بعد حسنہ آپا - کو کیسے مناتی ہوں، یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔" عمیر ضرورت سے زیادہ پُراعتماد تھی۔

"اگر حسنہ کو راضی کرسکتی ہو تو کرلو بیٹا! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" اماں نے بالآخر گرین سگنل دے دیا۔

"تھینک یو اماں! تھینک یو سوچ۔" وہ خوشی کے مارے ان سے لپٹ گئی تھی۔

☆☆☆

ڈیڈی کے سامنے یہ پروپوزل رکھا تو وہ بھی جی بھر کر حیران ہوئے تھے لیکن یہ بڑی خوش گوار سی حیرت تھی وہ تو زبیدہ عرف زوبی سے دھوکہ کھانے کے بعد اتنے دل برداشتہ ہوگئے تھے کہ دوبارہ شادی کا خیال ہی ذہن سے نکال دیا تھا لیکن تنہائی کا عفریت انہیں پہلے سے بڑھ کر خوف زدہ کررہا تھا انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ باقی ماندہ زندگی کس کے سہارے جئیں گے دوبارہ کسی سے دھوکہ کھانے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اب ان کی بیٹی نے انہیں کیسا مژدہ جاں فزا سنا دیا تھا کتنی بھلی عورت تھی اس کی نند، اداس آنکھوں اور صبیح چہرے والی وہ عورت جس کی اچھائیوں کی معترف ان کی اپنی بیٹی تھی۔

حسنہ آپا، حسنہ آپا کرتے اس کی زبان نہ تھکتی وہ برملا اقرار کرتی تھی حسنہ کی صورت میں اسے بڑی بہن مل گئی ہے عمیر کی مردم شناسی پر تو اب انہیں بھرپور یقین آچکا تھا۔ تھوڑا سا سوچ کر ہی انہوں نے بیٹی کے سامنے اس رشتے پر دلی آمادگی ظاہر کردی تھی۔

"لیکن ایک بات ذہن میں رکھیے گا ڈیڈی! آپ کبھی بھی حسنہ آپی اور اپنے رشتے کو میرے اور حمدان کے تعلقات کے تناظر میں نہیں برتیں گے۔" عمیر نے باپ کو باور کروانا ضروری سمجھا۔

"کیوں تمہارے اور حمدان کے تعلقات کو کیا ہوا۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے ناں تمہارے بیچ۔" وہ یکدم فکرمند ہوئے۔

"سب ٹھیک ہے ڈیڈی لیکن میاں بیوی کے رشتے میں اتار چڑھاؤ تو آتے ہیں نا۔ روٹھنا، منانا چھوٹی بڑی لڑائیاں یہ سب معمول کا حصہ ہوتی ہیں اگر آپ مجھے یقین دہانی کرواتے ہیں کہ حسنہ آپا کو صرف اپنی بیوی سمجھیں گے، کبھی بھی حمدان کی بہن یا میری نند سمجھ کر برتاؤ نہیں کریں گے تو میں حسنہ آپا کو منانے پر کرسکتی ہوں۔"

"نکاح کا مطلب ہے بیٹے! کہ آپ اللہ رسول کو گواہ بنا کر کسی کو اپنی زندگی کا حصہ بناتے ہیں۔ میں اگر نکاح کروں گا تو پوری نیک نیتی کے ساتھ اس رشتے کو نبھاؤں گا۔"

ڈیڈی سنجیدگی سے بولے تھے۔ عمیر نے محبت سے باپ کو دیکھا اور مسکرادی جو مرحلہ سب سے آسان لگتا تھا وہ ہی سب سے مشکل ثابت ہوا۔ نرم خو اور مہربان سی حسنہ آپا جو کسی معاملے میں عمیر کو ناں کرتی ہی نہ تھیں اب ان کی ناں ہاں میں نہ بدل رہی تھی۔ عمیر انہیں سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھی۔

"میں تمہیں کتنی بار کہوں چندا! کہ میں مرتضیٰ صاحب سے شادی نہیں کرسکتی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے اب اس معاملے پر ہمارے درمیان آئندہ بحث نہیں ہوگی۔" انہوں نے قطعی انداز میں عمیر کو باور کروانا چاہا۔

"ہمارے درمیان اس وقت تک بحث ہوتی رہے گی جب تک آپ کی ناں ہاں میں نہیں بدلے گی۔" عمیر نے بھی اٹل انداز اختیار کیا۔ حسنہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"عورت اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کو کبھی نہیں بھول سکتی جو ایک بار اس کے جسم و جاں کا مالک بن جاتا ہے وہ دوبارہ کسی اور کو جگہ دینا اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھیں۔

عمیر نے گہری سانس اندر کھینچی پھر محبت سے ان کے ہاتھ تھامے۔

"میں جانتی ہوں آپا! کہ آپ نے تو تیر

صاحب کو ٹوٹ کر چاہا تھا آپ ان کی بیوہ ہوئیں تو میں آپ کے جذبات اور آپ کی رائے کا احترام کرتی، اگرچہ ہمارے مذہب میں بیواؤں کی دوسری شادی پر بھی کوئی ممانعت نہیں لیکن آپ اس شخص کی وجہ سے اپنے اوپر، خوشیوں کا دروازہ بند کرے بیٹھی ہیں جو آپ کو اپنی زندگی سے کب کا نکال کر خود ایک ہنستی مسکراتی زندگی جی رہا ہے۔ مجھے آپ کی منطق بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ بس میں اپنے اندر دوبارہ کسی اور تجربے کی ہمت نہیں پاتی۔" حسنہ اس سے نگاہیں چرا کر بولی تھیں۔

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے ڈیڈی آپ کو بہت خوش رکھیں گے۔ آپ ان کے ساتھ ایک خوش گوار زندگی گزاریں گی۔" اس نے انہیں ایک بار پھر یقین دلانا چاہا تھا۔

"مرتضیٰ صاحب بہت اچھے ہیں میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں لیکن چندا......" وہ اس کی ضد سے عاجز آ کر اسے کچھ سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ عبیر نے ان کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

"آپ بھلے سے ان کی عزت نہ کریں بس ان سے شادی کر لیں۔ مجھے یقین ہے شادی کے بعد آپ ان سے محبت، عزت سب کرنے لگیں گی۔"

اس کی بات سن کر وہ پھیکا ہنس دی تھیں۔

اپنی کوئی دلیل کارگر نہ ہوتی دیکھ کر عبیر نے انہیں تصویر کا ایک اور رخ دکھانا چاہا۔

"اچھا ٹھیک ہے آپ میرے ڈیڈی یا کسی اور ایکس وائے زیڈ سے شادی نہیں کرتیں آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ آپ کے بھائی نے جلد یا بدیر فریحہ سے شادی کرنی ہی کرنی ہے۔ میرے منہ میں خاک لیکن حمدان صرف اماں کی زندگی تک مجبور ہے۔ اس گھر میں بالآخر فریحہ نے ہی آنا ہے پھر بتائیں یہاں آپ کی کیا حیثیت ہوگی، اس نے اپنے گھر میں آپ کو برداشت نہیں کیا تھا یہاں آپ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھے گی۔" وہ انہیں مستقبل کے حوالے سے ڈرانا چاہ رہی تھی۔

"کچھ عرصہ ہے کاشی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ وہ میرا سہارا بن جائے گا۔" ان کے پاس اس دلیل کا جواب بھی موجود تھا۔

"ہاں آپ کو الہام ہوا ہے ناں کہ کاشی کی بیوی بہت نیک فطرت ہوگی اور وہ مستقبل میں اپنی بیوی کے اشاروں پر نہیں ناچے گا۔" عبیر نے منہ بنایا تھا۔

"ٹھیک ہے حسنہ آپا! یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے ظاہر ہے زندگی آپ کی ہے تو فیصلے کا اختیار بھی آپ ہی کا ہے۔ قصور میرا ہے میں خود غرض ہوگئی تھی اپنے بھلے کے لیے۔ آپ کے ساتھ زبردستی کرنا چاہ رہی تھی۔"

اس نے گہری سانس کھینچ کر خود کلامی کی، حسنہ آپا نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"حمدان کی زندگی میں میرا کیا مقام ہے آپ بخوبی جانتی ہیں۔ اگر وہ فریحہ سے شادی رچا لیتا ہے تو میرا مستقبل کیا ہوگا آپ کو تو کاشی کا سہارا ہے۔ مجھے تو وہ بھی نہیں۔ ظاہر ہے مجھے اپنے گھر لوٹ کر جانا ہوگا۔ میں چاہ رہی تھی کہ ڈیڈی کی آپ سے شادی ہو جائے تو گھر واپسی کی صورت میں مجھے سنبھالنے، سمیٹنے کے لیے ایک مہربان وجود تو ہوگا۔ ڈیڈی اپنی مرضی اور پسند سے کسی اور سے بیاہ رچا بیٹھے تو اللہ جانے مجھے ایک زوبی آنٹی بھگتنی نہ پڑ جائے پھر میری حالت تو وہ ہی ہوگی دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

وہ افسردگی اور آزردگی سے کہتی ان کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔

"عبیر! چندا رکو تو سہی۔" حسنہ بے چین ہو کر اس کے پیچھے لپکی تھیں۔

دو دن تک عبیر نے ان سے بات نہ کی۔ رونی شکل بنائے گھر میں گھومتی رہی تھی۔ تیسرے دن شام کو حسنہ آپا کی ناں ہاں میں بدل گئی تھی۔

کتنی احمق تھی میں جو دلیل سب سے پہلے دینی چاہیے تھی وہ سب سے آخر میں دی۔ اپنی چالاکی پر دل ہی دل میں پھولے نہ سماتے ہوئے وہ حسنہ آپا

سے لپٹ گئی تھی۔

☆☆☆

حمدان نے اس رشتے میں اپنی ٹانگ اڑانے کی اپنی سی کی کوشش ضرور کی تھی۔

"یہ رشتہ آپ سراسر اپنی ذمہ داری پر طے کر رہی ہیں اماں! حسنہ آپا کو پہلے ایک بار طلاق ہو چکی۔ اگر جبیر کے ڈیڈی نے میری بہن کو بنیاد بنا کر میری زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی تو میں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کروں گا۔ حسنہ آپا کی شادی شدہ زندگی متاثر ہونے کی صورت میں آپ مجھے الزام نہ دیجیے گا۔"

اس نے انہیں باور کروا دیا تھا۔ کمرے کے باہر ٹہلتی جبیر سے مزید ضبط نہ ہو سکا وہ دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔

"آپ کے منہ میں خاک، اپنی بہن کی زندگی کے حوالے سے کیسی بدفالیں منہ سے نکال رہے ہیں۔ ان شاء اللہ حسنہ آپی کی شادی کامیاب ہوگی میں پہلے ہی ڈیڈی سے اس بارے میں یقین دہانی کرا چکی ہوں۔ ڈیڈی کہتے ہیں کہ وہ اللہ رسول کو گواہ بنا کر نکاح کریں گے تو پوری نیک نیتی سے اس رشتے کو نبھائیں گے بھی۔" جبیر نے تو ڈیڈی کی بات ہی دہرائی تھی حمدان جانے کیوں تلملا سا گیا۔

"ٹھیک ہے اماں! اگر آپ کی بہو اور ان کے والد کی گارنٹی ہے اور آپ کو اس گارنٹی پر بھروسا ہے تو جوڑ لیجیے یہ رشتہ۔ میں کون ہوتا ہوں روکنے والا۔" وہ لاتعلقی کا اظہار کرتا چلتا بنا۔ بیٹے کی اس بے گانگی پر اماں کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"آپ ٹینشن مت لیں اماں! بس حسنہ آپا کی خوشی بھری زندگی کی دعا کریں۔" اس نے اماں کو اپنے سے لپٹا لیا۔

اماں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کی بیٹی کی زندگی کی خوشیوں کی تگ و دو کرتی، اس لڑکی کے اپنے دامن میں کتنی خوشیاں تھیں وہ سوچتیں تو ان کا دل چھلنی چھلنی ہو جاتا۔

"اللہ تمہارا دامن بھی خوشیوں سے بھر دے میرے بچے!" انہوں نے بندلبوں مگر صدق دل سے اسے دعا دی تھی۔

☆☆☆

شادی بہت سادگی سے ہو رہی تھی۔ ڈیڈی کے دو قریبی دوست اور ان کی فیملیز باراتی بن کر آئے تھے۔ پھر بھی اس محدود پیمانے پر ہونے والی تقریب کے انتظامات میں جبیر نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

وہ آج ڈیڈی کی بیٹی نہیں بلکہ حسنہ کی بھاوج بن کر معزز مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ اپنی تیاری پر بھی اس نے خاص توجہ دی تھی۔ آسمانی رنگ کے اسٹائلش سے سوٹ میں، سلیقے سے کیے گئے میک اپ میں وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ اماں نے بطور خاص اس کی نظر اتاری تھی۔

"شاید تم دنیا کی پہلی بیٹی ہو جو باپ کی بارات پر اتنا چہک رہی ہو۔" حمدان اس کے قریب سے گزرا تو طنز کیے بنا نہ رہ پایا۔

"اور آپ دنیا کے پہلے بھائی ہیں جو بہن کی شادی کا فریضہ اتنے بیزار انداز میں بھگتا رہے ہیں۔" او وادھار کیوں رکھتی فوراً چہک کر بولی تھی۔

"اور پلیز یہ جو چہرے پر بارہ بجائے ہوئے ہیں ناں تو اپنے چہرے کے زاویے درست کر لیجیے۔ میرے ڈیڈی بے چارے تو سیدھے ہیں انہیں میری جھوٹی مسکراہٹ سچی لگتی ہے اور مرد اتنے باریک بین کب ہوتے ہیں لیکن آج مہمانوں میں جو دو آنٹیاں ہیں۔ وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہیں۔ دنیا دکھاوے کو سہی نبھا لیجیے گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گزارش کا انداز اپنانا پڑا تھا۔

"حمدان اس وقت تو کچھ نہ بولا لیکن غنیمت رہا کہ ثمینہ آنٹی اور نزہت آنٹی کے سامنے وہ مسکراتا چہرہ لیے پھرتا رہا۔ ایک دو بار جبیر کو بلا ضرورت مخاطب بھی کیا اور پھر جب ثمینہ آنٹی کی بیٹی امامہ جو پرجوش انداز میں اس انوکھی تقریب کی دھڑا دھڑ تصویریں کھینچ رہی تھی اپنا موبائل لیے جبیر اور حمدان کی طرف آئی تو

عمیر نے بے ساختہ نگاہ اٹھا کر حمران کو دیکھا۔
"افوہ عمیر آپی! اب ساتھ کھڑی ہو بھی جائیں۔ اتنا پیارا کپل ہے آپ دونوں کا اور ابھی تک آپ لوگوں نے ایک تصویر بھی نہیں بنوائی۔"
امامہ از خود اپنے آپ کو اس تقریب کا آفیشل فوٹوگرافر قرار دے چکی تھی۔ عمیر زبردستی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر حمران کے پہلو میں آن کھڑی ہوئی۔ حمران نے اس کے شانے کے گرد بازو پھیلا کر خوش گوار کپل ہونے کا تصدیق نامہ بھی فراہم کر دیا۔
امامہ نے کھٹا کھٹ کئی تصویریں اتاریں پھر انگوٹھے سے زبردست کا اشارہ کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔
"اب اتنی کرٹسی نبھانے کو بھی نہیں کہا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کا بازو ہٹاتی دبے دبے انداز میں غرائی تھی۔
حمران کے لبوں پر بڑی چڑا دینے والی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ عمیر تن فن کرتی آگے بڑھ گئی اس شخص کے منہ لگنا ہی فضول تھا۔ جانے اس کے چڑنے پر حمران کو اتنا لطف کیوں آیا۔ اس کے لب خوامخواہ مسکرا اٹھے تھے۔
حسنہ آپا ہلکے پھلکے میک اپ میں اپنے سوگوار حسن کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ رخصتی کے وقت عمیر ان سے ملی تو وہ ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ عمیر ان کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتی تھی لیکن اسے پورا یقین تھا کہ اس کے ڈیڈی خدشات سے دھڑکتے دل کو محبت سے دھڑکنا سکھا دیں گے۔ اماں اور کاشان کی آنکھوں کی نمی عمیر کے لیے خلاف توقع نہ تھی۔
حیرت کا جھٹکا تو اسے تب لگا جب رخصتی کے وقت حمران نے بھی بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر دوسری ہتھیلی سے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھی تھی۔ اس سے پہلی بار وہ پتھر دل شخص عمیر کو انسان لگا تھا۔

☆☆☆

صبح آفس کی چھٹی تھی۔ حمران خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا، جب عمیر نے اس کا لحاف اتار پھینکا ساتھ ہی کمرے کی لائٹ بھی آن کر دی۔
"کیا مسئلہ ہے؟" وہ اس جسارت پر خفا ہونے سے زیادہ حیران تھا۔
"مسئلہ کوئی نہیں ہے فوراً اٹھ جایئے ہمیں حسنہ آپا اور ڈیڈی کا ناشتا لے کر جانا ہے۔" وہ اتنے نارمل انداز میں مخاطب تھی جیسے دونوں میاں بیوی کے تعلقات حد درجہ خوش گوار ہوں۔
"کس خوشی میں بھئی؟" وہ ابرو اچکا کر پوچھ رہا تھا۔
"ان کی شادی کی خوشی میں اور ویسے بھی یہ رسم ہے۔" وہ مزاج کے خلاف بہت تحمل سے بات کر رہی تھی۔
"تمہارے گھر سے تو شادی کی پہلی صبح کوئی ناشتا نہیں آیا تھا۔" وہ کسی خرانٹ ساس کی طرح طعنہ مار رہا تھا۔
"میرے گھر میں صرف میرے ڈیڈی تھے مردوں کو ان رسموں رواجوں کا کیا پتہ، حسنہ آپا تو بھرے پرے گھر سے گئی ہیں۔ ہمیں ان کا ناشتا لے کر جانا ہے آپ فٹافٹ تیار ہو جائیں ہم ان کا ناشتا لے کر جائیں گے۔"
"کیا مصیبت ہے اچھی چھٹی والے دن بھی چین نہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ ہی گیا تھا اور جس وقت عمیر اس کے ساتھ ناشتا لے کر گھر پہنچی تو وہاں ٹیبل پر ناشتا پہلے ہی سجا ہوا تھا۔ آلو کے پراٹھے اور پودینے کی چٹنی۔ ڈیڈ بہت رغبت سے ناشتے میں مگن تھے۔ ساتھ ہی شرمائی لجائی سی حسنہ آپا بیٹھی تھیں۔
"او مائی گاڈ ڈیڈی! آپ نے پہلے دن ہی میری آپا کو کچن میں کھڑا کر دیا۔" عمیر چیخ ہی تو پڑی تھی۔ ڈیڈی بے چارے بوکھلا سے گئے۔
"ارے نہیں عمیر! یہ تو بہت منع کر رہے تھے۔ وہ تو میں نے خود اصرار کیا کہ ناشتا میں خود بناؤں گی۔" حسنہ آپا نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے ڈیڈی کی طرف سے صفائی پیش کی۔

Scanned with CamScanner

"اوہ تو گویا آپ پہلے دن سے ہی معدے کے راستے ڈیڈی کے دل تک رسائی پانا چاہ رہی تھیں۔" اس نے ان کے کان میں گھس کر سرگوشی کی۔ وہ شرما کر ہنس پڑی تھیں۔

محض چند گھنٹوں کی محبت بھری رفاقت نے ان کا اپنی ذات پر اعتماد بحال کر دیا تھا۔ وہ خوش بھی لگ رہی تھیں اور مطمئن بھی۔

عمیر نے اپنے ڈشنگ سے ڈیڈی پر مسکراتی نگاہ ڈالی۔ اسے یقین تھا کہ ڈیڈی کی ہمراہی میں حسنہ آپا کے لب مسکرانے لگیں گے۔ اللہ کا کرم تھا جس نے اس یقین کو سچا کر دیا۔ دونوں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر عمیر نے ان کی خوشیوں بھری زندگی کی دل سے دعا کی تھی۔

☆☆☆

حسنہ آپا کی شادی کیا ہوئی تھی اس گھر میں حمدان کے مشکل دن شروع ہو گئے تھے۔ اب گھر میں اس کی ناز برداریاں کرنے والا کوئی نہ تھا۔ صبح آفس جانے سے پہلے اسے اپنے کپڑے خود پریس کرنے پڑتے۔

عمیر کی یہ مہربانی ہی کم نہ تھی کہ وہ اس کے ناشتہ بنا دیتی وہ بھی شاید اس لیے کہ کاشان کے کالج جانے کا بھی یہی ٹائم ہوتا، وہ چہیتے دیور کو اس کا من پسند ناشتا کرواتی تو گزارے لائق ناشتا حمدان کے سامنے بھی رکھ دیتی۔

کاشان کے لیے تو بڑے اہتمام سے لنچ باکس بھی تیار کیا جاتا۔ وہ کالج کے بعد اکیڈمی جاتا تھا اس لیے عمیر کو اس کے کھانے کی فکر ہوتی تھی، وہ بار بار تاکید کرتی کہ وہ وقت نکال کر لنچ ضرور کرے۔

کچن کے ایک کونے میں پڑا حمدان کا لنچ باکس اپنی ناقدری پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا۔ بازاری کھانا کھانے سے حمدان کا معدہ بہت جلدی اپ سیٹ ہو جاتا تھا۔ حسنہ آپا شادی سے پہلے بن کہے اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ وہ آفس جاتا تو اس کے من پسند کھانے سے بھرا لنچ باکس اس کے ساتھ ہوتا۔ اب ایسی کوئی سہولت دستیاب نہ تھی۔ خود سے کہہ کر کام کروانا اس کی انا کو گوارا نہ تھا لیکن اب صبح کا وقت بہت افراتفری لیے ہوتا۔

زندگی میں پہلی بار وہ کپڑے استری کرنا سیکھ رہا تھا۔ بنیان موزے، جرابیں جو پہلے ادھر ادھر اتار پھینکنے کے باوجود دھلے دھلائی قرینے، سلیقے سے اپنی مقررہ جگہ پر ملتے تھے اب ڈھونڈنے کے بعد اسی جگہ سے برآمد ہوتے جہاں گزشتہ رات اتار پھینکے تھے۔

سب سے بڑا مسئلہ رات کے کھانے کا ہوتا تو وہ معمول کے مطابق فریحہ کے گھر کی یاترا کرنے کے بعد، رات گئے گھر لوٹتا تھا اب گھر میں اس کے انتظار میں جاگ کر گرم کھانا دینے والا کوئی نہ تھا۔

اماں تو کوئی برسوں پہلے گھر داری سے ہاتھ کھینچ چکی تھیں، یہ حسنہ آپا تھیں جو بھائی کے مزاج اور عادتوں سے بخوبی واقف تھیں۔

ٹھنڈی روٹی حمدان کے حلق سے نہ اترتی تھی حسنہ آپا اس کے گھر آنے کے بعد اس کے لیے گرم گرم پھلکے اتارتی تھیں، اب گھر واپسی پر ہاٹ پاٹ میں مڑی تڑی دو روٹیاں پڑی ملتیں۔ سالن خود فریج سے نکال کر گرم کرنا پڑتا لیکن آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ شدید بھوک کے عالم میں اس نے ہاٹ پاٹ کھولا تو خالی ہاٹ پاٹ منہ چڑا رہا تھا۔

دوپہر کو مسلسل آفس کینٹین میں لنچ کرنے کی وجہ سے معدہ ڈسٹرب تھا اسی لیے آج اس نے دوپہر کا کھانا گول کر دیا تھا۔ فریحہ اور رخسانہ چچی کے ہاتھ کا کھانا اسے ویسے ہی نہ بھاتا تھا اور وہ دونوں ماں بیٹی اکثر رات کو بازاری کھانا کھاتے تھے، عموماً آڈر بھی حمدان ہی کرتا تھا لیکن خود ان کا ساتھ دینے کے بجائے گھر آ کر کھانا کھانے کو ترجیح دیتا۔ اسے کیا خبر تھی کہ آج گھر میں بھی کھانے کو کچھ نہ ملے گا۔

بیڈ روم میں آیا تو معمول کے مطابق عمیر

گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی وہ سحر خیز تھی۔ حمدان جانتا تھا کہ وہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ بستر نہیں سنبھالتی ہے۔ سارا دن گھر کے کاموں میں معروف رہنے کے بعد تھک ہار کر سونا یقیناً اس کا حق تھا اور حمدان کو کم از کم اس بات پر کبھی غصہ نہ آیا لیکن آج معاملہ دوسرا تھا۔ حمدان کو اس کی لاپرواہی پر خوب تاؤ چڑھ رہا تھا۔ اس نے بھی عمیر کے انداز میں ہی اسے جگایا۔ لحاف اتار کھینچا اور لائٹ آن کر دی۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے شدید نیند کے عالم میں مندی مندی آنکھیں کھول کر استفسار کیا۔

"کھانا دو مجھے بھوک لگی ہے۔" وہ بگڑ کر بولا۔

"رکھی ہوگی ہاٹ پاٹ میں روٹی کھالیں۔" وہ دوبارہ لحاف منہ تک تان لینا چاہتی تھی۔ حمدان نے اس ارادے کو ناکام بناتے ہوئے پھر سے لحاف کھینچا۔

"ہاٹ پاٹ میں روٹی ہوتی تو میں مادام کو کیوں زحمت دیتا۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے جلدی کھانا دو۔"

آڈر دینے کے سے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ عمیر کو بادل نخواستہ اٹھنا پڑا تھا۔ پتا نہیں آج اندازے کی غلطی ہوگئی یا بھنڈی گوشت سے روٹی خوب کھائی گئی۔ سالن کاشان کا فیورٹ تھا اور آج بنا بھی خوب مزے کا تھا۔ وہی سب سے آخر میں دسترخوان سے اٹھا تھا اور عمیر نے ہاٹ پاٹ کھول کر روٹی چیک کرنے کی زحمت نہ کی جس کا خمیازہ اس وقت بھگتنا پڑ رہا ہے۔

چہرے کے بگڑے زاویوں کے ساتھ اس نے چولہا جلا کر توا رکھا پھر فریج میں سے آٹا اور سالن نکالا تھا۔ حمدان بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اوون میں سالن گرم کرنے رکھ کر وہ روٹی بیلنے لگی۔ حمدان اس کی نیند سے گلابی آنکھیں دیکھ کر جی ہی جی میں کچھ شرمندگی محسوس بھی کر رہا تھا۔

"آج گوشت بنایا تھا؟" کھانا سامنے رکھا گیا تو وہ شرمندگی کا احساس مٹانے کو خوامخواہ پوچھ بیٹھا۔

"بنایا تو بھنڈی گوشت تھا لیکن بنا تھا آپ کے حلق سے بھنڈی تو آسانی سے اترے گی نہیں اس لیے گوشت بھوننے کے مرحلے پر علیحدہ کر لیا تھا۔" عمیر نے اس انداز میں بتایا تھا جیسے ایسا کر کے وہ حمدان کی سات پشتوں پر احسان کر بیٹھی ہو۔

گھر میں کاشان، اماں اور وہ خود سبزی کے شوقین تھے۔ فقط یہ لاٹ صاحب تھے جو گنی چنی سبزیوں کے علاوہ کوئی سبزی نہ کھاتے تھے۔ حسنہ آپا تو اس کے لیے علیحدہ ہانڈی بھی بنا لیا کرتی تھیں۔ عمیر اتنا تردد کرنے کی روادار نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ ہی کرتی تھی جو آج کیا تھا۔ سبزی ڈالنے کے مرحلے سے پہلے گوشت بھون کر ایک پلیٹ سالن علیحدہ کر لیتی۔

حمدان بہت رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ عمیر نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر رکھی تو ساتھ تازہ پانی کا جگ بھی رکھ دیا۔ وہ ٹھنڈا یخ پانی نہ پیتا تھا۔

حمدان نے ایک نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا مگر کچھ بولنے سے پرہیز کیا۔ عمیر کا اگلا احسان اس کے لیے چائے چڑھانے کا تھا۔ قہوہ بن گیا تو اس نے دودھ شامل کر کے آنچ ہلکی کر دی۔

"میں خود چولہا بند کر کے چائے لے لوں گا۔ تم سو جاؤ جا کر۔" حمدان نے اسے مخاطب کیا۔

"بہت مہربانی ہوگی اگر اپنے لیے کپ میں چائے خود چھان لیں گے۔"

عمیر نے یقیناً طنز کیا تھا پھر باورچی خانے سے باہر نکلتے نکلتے واپس پلٹی۔

"اس گھر میں ڈنر ٹائمنگ آٹھ سے ساڑھے آٹھ کے درمیان ہے۔ آئندہ گرم روٹی کھانے کا موڈ ہو تو وقت سے تشریف لایئے گا ورنہ بہتر تو یہ

ہے کہ جہاں روز مہمان بن کر جاتے ہیں ان لوگوں کو ہی میزبانی کا شرف بخش دیا کریں۔ تاکہ لیٹ گھر آنے کے بعد اگر سالن یا روٹی میں سے کوئی چیز کم پڑ گئی تو مجھے جگانے کی زحمت مت کیجیے گا۔ انسان کو تھوڑے بہت ہاتھ خود بھی ہلانے آنے چاہئیں۔"

ٹھنڈے ٹھار لہجے میں اسے مشورے سے نواز کر وہ کچن سے نکل گئی۔

"ذرا سا کھانا دینے کا کیا کہہ دیا۔ محترمہ کے تیور تو دیکھو۔" حمدان نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر اس پر خفا ہونے کی کوشش کی لیکن دل اور دماغ دونوں نے ہی زبان کا ساتھ نہ دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ آج کل دل و دماغ کی عجب کشمکش میں مبتلا تھا۔

فریحہ اس کی اولین محبت سہی لیکن وہ اس محبت کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے میں کامیاب نہ ہو پایا تھا تو اس سب میں عبیر کا کم از کم کوئی دوش نہ تھا۔ وہ لڑکی یقیناً ایسی زندگی کی مستحق نہ تھی۔

وہ اس گھر میں حمدان کی ذات کے حوالے سے آئی تھی۔ حمدان نے تو اسے نہ اپنایا لیکن وہ حمدان سے جڑے ہر رشتے کو جس مثالی انداز میں نبھا رہی تھی یہ بات حمدان کے ضمیر کی خلش میں بڑھا رہی تھی۔ وہ بظاہر عبیر سے جتنے مرضی بگڑے تیوروں سے بات کرتا، دل ہی دل میں وہ اس کی اچھائیوں کا معترف تھا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ دل اس کی طرف مائل ہوا جا رہا تھا، وہ تجزیہ کرنے سے قاصر تھا کہ اس کی وجہ ان کے بیچ جڑا بندھن ہے یا یہ لڑکی خود اپنے اندر اتنی کشش رکھتی ہے۔

جب عبیر اس کے سامنے ہوتی تو فریحہ کا خیال پس پشت چلا جاتا اور یہ بات اسے مزید جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتی۔ فریحہ کو آس اور امید کا دامن تھما کر وہ کسی اور میں دلچسپی کیوں کر لینے لگا تھا۔ دل کے اس ہرجائی پن پر وہ خود کو ڈپٹتا۔

اپنی نگاہوں میں خود کو سرخرو رکھنے کی خاطر پہلے سے زیادہ وقت طاہرہ چچی کے گھر گزارتا۔ وہاں طاہرہ چچی اس کی اور فریحہ کی شادی میں مزید تاخیر کرنے کی روادار نہ تھیں۔ آج بھی انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"فریحہ سے رشتہ جوڑنا ہے تو اس لڑکی سے پیچھا چھڑاؤ حمدان! پہلے تو ہم نے تمہارا عذر مان لیا بھابھی بیگم کی طبیعت خرابی کو جواز بنا کر تم نے بیاہ رچا لیا لیکن اب تو بھابھی بیگم بھی اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہو چکی ہیں کہ تم ان کی منتخب کردہ لڑکی کو نگاہ اٹھا کر دیکھنے کے روادار تک نہیں تو یہ زبردستی کا بندھن کب تک چلے گا۔ اسے طلاق کا پروانہ تھماؤ اور میری بیٹی کو رخصت کروا کر لے جاؤ بھلے سے بھابھی بیگم مانتی ہیں یا نہیں۔ فیصلہ تمہیں کرنا ہے اور اگر تم نے جلد کوئی فیصلہ نہ کیا تو میں اپنے فیصلے میں آزاد ہوں گی۔"

آج کتنے دوٹوک اور اٹل انداز میں طاہرہ چچی اس سے مخاطب ہوئی تھیں قریب بیٹھی فریحہ بہت آس اور امید سے اسے تک رہی تھی۔

حمدان خود جانتا تھا کہ صورت حال لمبے عرصے کے لیے جوں کی توں والی پوزیشن پر نہیں رہ سکتی۔ اسے جلد ہی کسی فیصلے پر پہنچنا تھا۔ چچی جان کب تک فریحہ کو اس کے نام پر بٹھا سکتی تھیں کاش وہ عبیر سے شادی سے پہلے اماں کو فریحہ کے لیے منا سکتا۔ کسی بے قصور لڑکی کی بربادی کا قصوروار تو نہ بنتا اور اگر جب اتنی ہمت نہ کر پایا تھا تو کاش فریحہ سے اپنی راہیں تب جدا کر لیتا۔ جب راہیں جدا کرنے کا مضبوط جواز تھا۔

برسوں پہلے جب توقیر بھائی نے حسنہ آپا کو طلاق دی تھی۔

حمدان بے بسی سے سوچ رہا تھا لیکن یہ الجھن کسی طور پر سلجھنے والی نہ تھی۔ تھک ہار کر نیند کی وادی میں ہی پناہ لینی پڑی۔

☆☆☆

"پھر تم نے بھابھی بیگم کو بتا دیا کہ تم عنقریب

فریحہ سے شادی کر رہے ہو۔" آفس سے واپسی پر وہ حسب معمول محبوب کے در پر حاضر ہوا تھا لیکن اب محبوبہ کی ماں پہلے کی طرح واری صدقے نہ جاتی تھی، وہ اس سے دوٹوک جواب سننے کی منتظر تھیں۔

"یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ اماں کبھی راضی نہ ہوں گی۔" اس نے تھکے ہارے انداز میں آگاہ کیا۔

"تو حمدان میاں! آپ نے میری بچی کی زندگی کو کھیل تماشا سمجھ لیا ہے، برسوں سے وہ آپ کے نام کی انگوٹھی پہنے بیٹھی ہے، کیا وہ اسی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائے گی۔" طاہرہ چچی تیز ہوئیں۔

"میں فریحہ سے نکاح کر لیتا ہوں۔ اماں کی رضامندی اور موجودگی دونوں ہی ناممکن ہیں میں فریحہ کو الگ گھر میں رکھوں گا وقت کے ساتھ اماں کا دل......"

"بہت خوب الگ گھر، الگ گھر لینے کی گنجائش ہے آپ کی۔" طاہرہ چچی نے اس کی بات کاٹی۔

"قریب کے کسی علاقے میں کرائے کا گھر افورڈ کر سکتا ہوں چچی!" وہ رسان بھرے لہجے میں بولا۔

"میری فریحہ کرائے گھر میں رہے اور وہ تمہاری نام نہاد بیوی تمہارے گھر میں عیش کرے۔"

وہ اس تجویز پر برہم ہوئی تھیں طاہرہ چچی کا یہ روپ کم از کم حمدان کے لیے نیا تھا۔ حمدان سے بات کرتے وقت تو ان کی زبان سے ہمیشہ شیر ٹپکتا تھا لیکن شاید اب وہ بھی مجبور تھیں کہ معاملہ ان کی بچی کی زندگی اور مستقبل کا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں فریحہ کی تمہارے ساتھ شادی کروا دیتی ہوں بھلے سے بھابھی بیگم راضی ہو یا ناراض، بس میری ایک ہی شرط ہے تم اپنا مکان میری فریحہ کے نام کر دو۔" وہ رسانیت سے بولیں۔ اس مطالبے پر حمدان نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

"میں مکان فریحہ کے نام کیسے کر سکتا ہوں جب کہ وہ مکان خود میرے نام بھی نہیں آپ کو پتا ہے بابا نے وہ مکان اماں کے نام سے خریدا تھا۔"

حمدان نے تحمل بھرے انداز میں انہیں سمجھانا چاہا۔

"پھر مجھے بتاؤ بچے! میں کیا کروں۔" ماں تمہاری راضی نہیں۔ پلے تمہارے کچھ نہیں۔ شادی تم پہلے رچا بیٹھے ہو میں جانتے بوجھتے تو اپنی بچی کو اندھے کنوئیں میں دھکا نہیں دے سکتی۔" وہ بگڑے تیوروں سے بولیں۔

"پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟" ان کے انداز پر اسے بھی غصہ آ گیا تھا۔ غصہ ضبط کرتے ہوئے اس نے بہت تحمل سے دریافت کیا۔

"امی! آپ بھی حد کرتی ہیں حمدان تھکا ہارا آیا ہے آپ نے آتے کے ساتھ ہی عدالت سجا لی۔"

حمدان کے تیور دیکھ کر فریحہ نے بروقت مداخلت کی۔ چچی خفگی سے بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔ "تم پانی پیو حمدان!" فریحہ نے ٹھنڈے ٹھار پانی کا گلاس اسے تھمایا۔ حمدان نے ایک گھونٹ پانی بھر کر گلاس سائیڈ پر رکھ دیا فریحہ کو آج تک یہ پتا نہ چل سکا تھا کہ وہ سخت سے سخت گرمی میں بھی اتنا ٹھنڈا پانی نہیں پیتا ہے۔ اسے بے ساختہ گزشتہ شب ٹھنڈے پانی کی بوتل کے ساتھ رکھا تازہ پانی کا جگ یاد آیا تھا۔

"بھوک لگی ہے فریحہ! کچھ کھانے کو ہو تو لے آؤ۔" حمدان نے گفتگو کا موضوع بھی بدلنا چاہا تھا اور حقیقت میں بھی اسے بھوک لگ رہی تھی کل کی طرح آج بھی اس نے لنچ بریک میں کچھ نہ کھایا تھا۔

"ساتھ والے گڈو سے کہہ کر میں روٹی

منگواتی ہوں۔ تم ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔" فریحہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"میرے لیے دو روٹی تم خود ہی ڈال دو۔ بازار کی پکی پکی روٹی میرے حلق سے نہیں اترتی۔" اس نے عادت کے برخلاف فرمائش کی۔

"ارے نہیں قریب ہی نیا تندور کھلا ہے۔ اچھی روٹی ہوتی ہے اس کی، ہم تو روز روٹی وہاں سے ہی منگواتے ہیں۔ بس تم جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ میں دستر خوان لگاتی ہوں۔ گڈو تو یوں جائے گا یوں آئے گا۔"

فریحہ نے کی اس کی فرمائش درخور اعتنا نہ جانی تھی۔ حمدان بھی ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

"پھر تم نے کیا سوچا حمدان؟" سوال وہ ہی تھا لیکن کرنے والی شخصیت مختلف، حمدان ایک ہی دن میں دو پیشیاں بھگتانے کے موڈ میں ہرگز نہ تھا۔

"کیا مطلب اماں؟" نہایت بے زاری سے ماں سے پوچھا، وہ تو رات کو ان کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر رسمی انداز میں خیریت پوچھنے چلا آیا تھا لیکن اماں شاید آج اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

"ایسا کب تک چلے گا بیٹے! اگر تم نے فریحہ سے ہی تعلق نبھانا تھا تو شادی پر ہامی ہی کیوں بھری، عمیر کو کس بات کی سزا دے رہے ہو۔" وہ بہت آرزدگی بھرے لہجے میں بیٹے سے مخاطب تھیں۔

"فریحہ اتنے برسوں سے میرے نام پر بیٹھی ہے اماں! میں اسے چھوڑ دوں تو کیسے چھوڑ دوں۔" وہ بے بس ہو کر بولا۔

"اللہ اس کا نصیب کھولے گا۔" اماں نرمی سے بولیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ وہ لڑکی ان کی بیٹی کا گھر اجاڑنے سمیت ان کے بیٹے کا گھر نہ بسانے کی سب سے بڑی وجہ تھی پھر بھی اپنی ازلی اچھائی کی وجہ سے انہوں نے اسے بددعا کے بجائے دعا سے ہی نوازا تھا۔

"وہ میرے بغیر مر جائے گی۔" حمدان اس کی شدت پسندی سے خائف تھا اس لڑکی شادی والی رات بھی وہ نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کر چکی تھی۔ طاہرہ چچی نے بروقت پہنچ کر اس کوشش کو ناکام بنایا تھا۔

حمدان نے بہت مشکل سے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ رشتہ محض کاغذی رشتہ ہے اور وہ جلد اس رشتے سے جان چھڑا لے گا۔ سہاگ رات اپنی دولہن سے مستقبل کے وعدے وعید کے بجائے وہ اپنی منگیتر کو اپنی وفاؤں کا یقین دلانے میں مصروف رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے فریحہ نے پوزیشن بھی تھی تو طاہرہ چچی کے تیور بگڑنے لگے تھے اور یہاں اماں کو عمیر کا غم ستا رہا تھا۔ کوئی اس کی مجبوری تو سمجھنے کو تیار ہی نہ تھا۔

"میں فریحہ کو منانے کی کوشش کروں گا کہ وہ عمیر کو قبول کرے۔ آپ عمیر سے اس کا فیصلہ پوچھ لیجیے اگر وہ ایک بٹے ہوئے شخص کو قبول کر سکتی ہے تو ٹھیک ورنہ وہ اپنی زندگی کے متعلق جو بہتر سمجھے وہ فیصلہ کر سکتی ہے۔" وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ اماں اسے دکھ کے عالم میں دیکھتی رہ گئیں۔

"اور ہاں اماں! یہ مکان....."

"یہ مکان میں عمیر کے نام کر رہی ہوں۔" اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بنا وہ کمال اطمینان سے بولی تھیں۔ حمدان نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"وہ پرائی لڑکی آپ کو اتنی عزیز ہو گئی ہے کہ آپ اسے اپنی سگی اولاد پر فوقیت دیں گی۔"

"وہ مجھے اپنے کوکھ سے جنے بچوں سے زیادہ نہیں تو کم عزیز بھی نہیں اور فریحہ سے شادی کی صورت میں فریحہ تمہاری من چاہی بیوی ہو گی۔ عمیر کے مستقبل کا تحفظ بھی تو کرنا ہے مجھے۔" وہ دوٹوک

ہمراز تھیں بولی تھیں۔

"آپ کو سب کا خیال ہے اماں اسوائے میرے۔ میری زندگی، میری آرزوئیں، میری خواہش، آپ نے کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے کبھی بھی میرے متعلق نہیں سوچا۔ ماؤں کی تو بیٹوں میں جان ہوتی ہے۔ آپ پتا نہیں کیسی ماں ہیں۔" اس نے ساری جھنجلاہٹ اور خفگی ماں پر اتاری تھی۔

انہیں اس کی بات سن کر شدید دکھ اور تکلیف پہنچی تھی لیکن وہ مزید ایک لفظ نہ بولیں یا شاید دکھ کی شدت نے انہیں بولنے کی ہمت ہی نہ بخشی۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے حمدان کو احساس ہو گیا کہ وہ کچھ زیادہ بول گیا ہے لیکن اس وقت وہ خود جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ معافی کے دو لفظ نہ بول سکا بس جھنجلاتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

حسنہ آپی اور ڈیڈی عمرے پر جا رہے تھے عمیر نے اس خوشی میں شاندار دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دو دن خود باپ کے گھر گزار کر آئی تھی اور ان دنوں میں گھر اتنا سونا اور ویران لگا تھا کہ حمدان بھی جی ہی جی میں اعتراف کیے بنا نہ رہ سکا کہ اس گھر کی ساری رونق اس لڑکی کے دم سے ہی ہے۔

اس وقت بھی وہ کچن میں مصروف تھی لیکن گھر میں اس کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت اچھا پکاتی تھی لیکن روایتی پکوان پکانے کے لیے اسے اماں کی مدد اور رہنمائی درکار ہوتی تھی۔ وہ کام کے دوران آوازیں لگا لگا کر اماں سے پوچھتی بھی جا رہی تھی۔

"عمیر آپی! فٹافٹ آجائیں میں مزے دار گول گپے لایا ہوں۔" اتنے میں کاشان باہر سے گھر آیا تو اسے زور زور سے پکارنے لگا۔

"کھٹا پانی بھی لائے ہو کاشی؟" اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں ہانک لگا کر پوچھا۔

"بالکل لایا ہوں بس آجائیں آپ۔"

کھانے پینے کے معاملے میں دیور بھابھی کی پسند ناپسند بالکل ایک جیسی تھی۔

حمدان کو یہ الا بلا کھانے میں کوئی دلچسپی تھی نہ ہی کوئی اسے پوچھنے کا روادار تھا۔ بہت مزے لے کر اس نے گول گپوں سے انصاف کیا تھا ساتھ سوں سوں بھی کیے جا رہی تھی لیکن جب اس نے گول گپوں کے ساتھ آیا کھٹا پانی الگ سے بھی پینا چاہا تو حمدان اسے ٹوکے بنا نہ رہ پایا۔

"موسم بدل رہا ہے گلا خراب ہو جائے گا تمہارا۔ گول گپے کھا لیے یہ کافی نہیں ہے کیا۔" عمیر نے اس دخل در معقولات پر اسے ایک تیکھی نگاہ سے نوازا مگر باز آنے کے بجائے شغل جاری رکھا۔

"میری بلا سے، جائے بھاڑ میں۔" حمدان منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ آج اس کے آفس کا آف تھا لیکن حسنہ آپا اور سسر محترم کی ضیافت کی وجہ سے اس کی گھر میں موجودگی ضروری تھی، حالانکہ گھر میں سے کسی نے بھی اسے رکنے کا نہ کہا تھا لیکن وہ ان نزاکتوں کا خود ہی خیال رکھتا تھا۔

تھوڑی دیر میں حسنہ اور مرتضیٰ آگئے تھے۔ حسنہ آپا آتے ہی اس کی مدد کے خیال سے کچن میں چلی آئی تھیں۔

"سب کچھ بالکل تیار ہے حسنہ آپا! بس یہ شامی کباب تلنے باقی ہیں آپ اماں کے پاس جا کر بیٹھیں۔" اس نے انہیں مخاطب کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے ناں تم کچن سمیٹو، میں کباب تلتی ہوں۔" حسنہ فارغ بیٹھنے والوں میں سے نہ تھیں۔

"بالکل نہیں، اتنا پیارا تیار ہو کر آپ چولہے کے سامنے کھڑی ہوں گی اور ویسے بھی یہ آپ کا میکہ ہے۔ شادی شدہ بیٹیاں میکے میں آکر صرف آرام کرتی ہیں۔ ابھی میں دو دن آپ کے پاس رہ کر آئی ہوں ناں، پلنگ سے پاؤں نیچے نہیں اتارا میں نے آپ سے اپنے سارے لاڈ اٹھوائے تھے اب اپنی تھوڑی سی خدمت کا موقع اپنی بھابھی کو بھی

دیجیے۔"

وہ مسکرا کر ان سے مخاطب تھی کچن کے باہر گزرتے حمدان کو یہ مسکراتا لہجہ بہت بھلا لگا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اس لڑکی کے خلوص اور اچھائیوں کا معترف ہوتا جا رہا تھا لیکن دل میں کیے گئے اس اعتراف کے سوا وہ اس کے لیے کچھ اور نہ کر سکتا تھا۔

اگر حسنہ آپا ماضی میں اپنے سسرال والوں کے ساتھ اس طرح بنا کر رکھتیں جیسے عبیر رکھتی ہے تو آج زندگی کتنی مختلف اور آسان ہوتی۔ حمدان کو آج بھی سارا قصور بہن کا ہی نظر آیا تھا۔

فریحہ اکلوتی اور لاڈلی تھی، حسنہ آپا نے شوہر پر صرف اپنا تسلط جمانا چاہا وہ محبت میں شراکت داری گوارا نہ کر پائیں۔ ساس نندوں کو ہر ممکن زچ کیا اگر گھریلو حالات سے تنگ آ کر توقیر بھائی دبئی نہ جاتے تو دوسری شادی کا سبب ہی نہ بنتا اور نہ ہی حسنہ آپا کو طلاق کے کاغذات بھجواتے۔

خیر اب بھی حسنہ آپا کا تو کیا بگڑا تھا۔ عبیر کے ڈیڈی کی شکل میں انہیں تو ہر لحاظ سے آئیڈیل لائف پارٹنر مل گیا تھا زندگی تو حمدان کی متاثر ہو رہی تھی ناں۔ وہ تو تلخی پن کا شکار ہوا آج کل تو طبیعت کے یہ دورے پڑتے رہتے تھے۔

اماں کی ناراضی الگ کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ انہوں نے آج کل اس سے بات چیت کرنا چھوڑ رکھی تھی۔ وہ جتنا مرضی ناخلف بیٹا سہی لیکن ماں سے بدتمیزی کرنے پر ضمیر چین نہ لینے دیتا۔ ضمیر کی آواز نظر انداز کرتا تو دل و دماغ پر دھرا بوجھ مزید بڑھ جاتا۔

اس کشمکش بھری زندگی میں جانے کب ٹھہراؤ آنا تھا یہ اللہ ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

حسنہ آپا عمرے کے لیے روانہ ہو گئی تھیں ان ہی دنوں کاشان بھی اپنے کالج ٹرپ کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کو چلا گیا۔ اماں کی چہیتی بہو کی بھی آج کل طبیعت ناساز تھی۔ وہ چھینکتی، کھانستی رہتی جب طبیعت زیادہ نڈھال ہوتی تو اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی۔

اماں پر تو اس نے پورا پورا قبضہ جما لیا تھا گھٹنوں اور جوڑوں کی شدید تکلیف میں مبتلا اماں جو بیٹے کے لیے تو ایک چائے کا کپ بنانے بھی کچن میں کھڑی نہ ہو پاتی تھیں۔ اب بہو کو جوشاندے بنا بنا کر پلا رہی تھیں۔ بہو ایسی فرماں بردار کڑوے کسیلے جوشاندے منہ بنائے بغیر پی جاتی۔

"صرف نزلہ زکام نہیں ہے اماں گلے کا انفیکشن بھی ہے۔ جوشاندوں سے بات نہیں بنے گی اس سے کہیں تیار ہو جائے میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں کہیں طبیعت مزید بگڑے" حمدان نے انسانیت کے ناتے پیشکش کی۔

"میں دوا بھی لے رہی ہوں ساتھ، آپ کی پیشکش کا شکریہ۔" اماں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ پیچھے سے آ کر بولی۔

"پتا بھی ہے، سیلف میڈیکیشن کتنی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس چلو، جو دوا لکھے وہ ہی لینا۔" حمدان صحت کے معاملے میں خود بھی وہمی تھا اس لیے نصیحت کیے بنا نہ رہ پایا۔

"معلوم ہے مجھے، ڈاکٹرز بھی ہمیشہ یہ ہی میڈیسن دیتے ہیں۔" وہ رسانیت سے بولی۔

"پہلے الٹی سیدھی چیزیں کھا کر طبیعت خراب کرو۔ پھر اپنی سمجھ کے مطابق دوائیاں پھانکو، طبیعت مزید بگڑے تو مجھے الزام نہ دینا۔" وہ چڑ کر بولا۔

"آپ کو پہلے بھی الزام دیا ہے میں نے۔" وہ اپنی گلابی ہوتی آنکھیں اس پر گاڑ کر بڑے کٹیلے لہجے میں بولی تھی۔

"میری بلا سے جو مرضی کرو۔" وہ اس سے نگاہیں چراتا بظاہر بے زار کن لہجے میں جواب دے کر گھر سے نکل گیا۔

آج آفس سے اس لیے جلدی اٹھ کر آیا تھا کہ عمیر کو ڈاکٹر کے کلینک لے جائے گا لیکن محترمہ کے تو مزاج ہی نہ ملتے تھے۔ سراسر اماں کی شہ تھی حمدان سے انہوں نے بولنا ترک کر رکھا تھا لیکن اگر وہ عمیر کے بھلے کے لیے اسے ڈاکٹر کے لے جانا چاہ رہا تھا تو اماں کم از کم اس کی اس بات کی تائید کر دیتیں۔ ماں کی مسلسل خاموشی اس کے اعصاب پر بہت بھاری پڑ رہی تھی۔

طاہرہ چچی کے گھر پہنچنے تک وہ سوچ سوچ کر جلتا کڑھتا رہا۔

گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ فریحہ اور چچی اوپر کے زیادہ تر کام پڑوس کے بچوں کو پیسے دے کر کروائی تھیں۔ سودا سلف منگوانا ہو۔ تندور سے روٹی لگوانی ہو یا اس نوعیت کا کوئی بھی کام بچے پیسوں کے لالچ میں بھاگ بھاگ کر کام کرتے۔ اب بھی کوئی بچہ ہی دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔

"حالات آج کل کیسے ہیں فریحہ اور چچی کو کچھ تو احتیاط کرنی چاہیے۔ ایسی بھی کیا لاپروائی۔" حمدان ان کی لاپروائی پر کڑھتا۔ انہیں سمجھانے کی نیت کر کے اندر بڑھا تھا۔

اندر سے آنے والی آوازوں نے اس کے قدم جکڑ ڈالے اندر اسی کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔ کچھ سوچ کر حمدان اندر جانے کے بجائے خاموشی سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"میری مان لے فریحہ! نہ حمدان اس لڑکی کو چھوڑے گا نہ اس کی ماں حمدان کے نام گھر کرے گی۔ بڑی حرافہ ہے وہ عورت۔" طاہرہ چچی کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔

"مکان کی رٹ آپ نے لگائی ہے امی! مجھے مکان سے کوئی سروکار نہیں لیکن حمدان میرا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس کی ماں میں اتنا دم خم ہوتا تو اب تک چھین نہ چکی ہوتی لیکن وہ آج بھی میرا ہے۔" فریحہ کے لہجے میں زعم تھا۔

"اس کی ماں نے اس بار پکا انتظام کیا ہے۔ حسنہ کو اس لڑکی کے باپ سے بیاہا ہی اس لیے ہے کہ حمدان اس لڑکی کو چھوڑنے کا سوچ نہ سکے تو اپنی خیالی دنیا سے ہی باہر نہیں نکل رہی۔" طاہرہ چچی نے بیٹی کی عقل پر ماتم کیا۔

"یہ آپ کی خام خیالی ہے امی! کہ وہ حسنہ کی وجہ سے مجبور ہو جائے گا۔ اس نے حسنہ کی وجہ سے مجھے چھوڑنا ہوتا تو تب چھوڑتا جب چھوڑنے کا جواز تھا۔ دنیا کا کوئی غیرت مند بھائی اس لڑکی سے شادی پر راضی ہو سکتا ہے جو اس کی بہن کا گھر اجڑنے کا باعث بنے نہیں ناں لیکن حمدان کو تب حسنہ کے گھر اجڑنے سے کوئی فرق نہ پڑا تو اب کیوں پڑے گا۔ رہی اس کی نام نہاد بیوی تو اس کا پتہ صاف کرنا بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں بس ایک بار حمدان سے شادی ہو جائے اس لڑکی کو حمدان کی زندگی سے ایسے نکال پھینکوں گی جیسے توقیر بھائی کی زندگی سے حسنہ چڑیل کو پھینکا تھا۔

آفاق اور حسنہ کی ایک تصویر نے توقیر بھائی کے سر سے بیوی کی محبت کا بھوت اتار پھینکا تھا تو یہاں تو حمدان کو اس لڑکی سے محبت تک نہیں، کاشان کے ساتھ اس لڑکی کو پھنسانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ساتھ والوں کے گھر جو بتول کام کرتی ہے بتا رہی تھی دیور بھابھی کی بہت دوستی ہے اسی دوستی کو بنیاد بنا کر حمدان کے کان بھرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے اماں! بس تم آج کل حمدان کو پریشرائز مت کیا کرو، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ آخری فیصلے کے قریب ہے۔ بہت جلد مجھ سے نکاح کرلے گا تمہاری جلد بازی حمدان کو مجھ سے چھین نہ لے۔ تم جانتی ہو میں اس کے بغیر نہیں جی سکتی۔"

"تیری شدت پسندی ہی مجھے ڈراتی ہے فریحہ! کبھی میں سوچتی ہوں کیا تھا جو تو حسنہ کو بھائی کی بیوی کے روپ میں قبول کر لیتی، آج میرا توقیر میرے پاس ہوتا۔ تو نے توقیر کو صرف حسنہ سے نہیں مجھ سے بھی چھین لیا۔ بھلے سے وہ جتنے مرضی

پیسے بھجواتا ہے لیکن میں تو اس کی شکل تک دیکھنے کو ترس گئی ہوں نا۔" طاہرہ چچی کھلے ہارے لہجے میں بولیں۔

"حسنہ کو بھائی کی بیوی ہی بنا کر لائے تھے ہم یہ مت کہیں کہ میں نے اسے بھائی کی بیوی کے روپ میں قبول نہیں کیا تھا لیکن وہ بھائی کی بیوی سے زیادہ محبوبہ بن گئی تھی۔ مجھ سے بھائی کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت برداشت نہیں ہوتی تھی۔ آپ جانتی ہیں مجھے محبت میں شراکت گوارا نہیں۔ جو میرا ہے اسے صرف میرا بن کر رہنا ہوگا۔"

وہ بول رہی تھی حمدان اپنی جگہ سن کھڑا تھا۔ یہ فریحہ نہیں یہ تو کوئی نفسیاتی مریضہ تھی اس کا اس سے زیادہ کریہہ روپ دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔ ایک بار اس جی چاہا کہ وہ اندر جا کر اس کا چہرہ طمانچوں سے سرخ کر دے مگر پھر طیش پر عقل غالب آگئی وہ شاطر لڑکی صورت حال کو اپنی مرضی کا رنگ دے کر اسے رسوا کر سکتی تھی۔

وہ الٹے قدموں پلٹا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ مرد ہونے کے باوجود اس کا دل دھاڑیں مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ اتنے برسوں سے وہ کٹھ پتلی بنا ایک نفسیاتی مریضہ کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا، اگر آج گھر کا کھلا دروازہ اس کی عقل پر پڑا پردہ ہٹانے کا باعث نہ بنتا تو کیا کبھی وہ بظاہر اس معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کی حقیقت اس پر کھل سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حمدان کے لیے محبت کا ایسا جہاں آباد ہوتا جو حمدان کو جکڑ رکھ لیتا۔

وہ بارہا اپنے دل میں اعتراف کرتا کہ اسے فریحہ سے اس شدت کی محبت نہیں ہے جتنی شدت سے وہ اسے چاہتی ہے لیکن وہ اس کی چاہت پر ہمیشہ نازاں و مغرور رہا۔ اس چاہت کے احترام میں اس نے فریحہ سے راستے الگ کرنے کا خواب میں بھی نہ سوچا۔

اس محبت کا چہرہ اتنا بھیانک اور کریہہ ہوگا یہ حمدان کو پہلے پتا چل جاتا تو وہ کب کا اسے پر نفرین بھیج کر اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکا ہوتا۔ کس حقارت سے وہ ماں بیٹی اس کی ماں اور بہن کا ذکر کر رہی تھیں۔

حسنہ آپا کا خیال آتے ہی حمدان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کی فرشتہ صفت بہن کیسے حمدان کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن وہ ہمیشہ فریحہ کے کہے کو سچ سمجھتا رہا۔ گھر نہ بسانے کی ذمہ داری ہمیشہ حسنہ آپا کے سر پر ڈالی اور فریحہ کسی تصویر کی بات بھی کر رہی تھی۔

حمدان کو اچھی طرح یاد تھا کہ برسوں پہلے چچا کی دکان کا ایک ملازم آفاق، جو ان لوگوں کے گھر کے فرد کی سی حیثیت رکھتا تھا چچا کے انتقال کے بعد دکان بک گئی مگر آفاق کا گھر میں آنا جانا برقرار رہا تو کیا فریحہ نے اسی آفاق کے ساتھ آپا پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ وہ سوچتا جا رہا تھا اور دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے کو تھیں۔

گھر جانے کا حوصلہ تھا نہ ماں سے نگاہیں ملانے کی ہمت، کتنی دیر بے مقصد سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا پھر سیل فون بجا تھا۔ فریحہ کی کال تھی۔

ایک زہر خند مسکراہٹ حمدان کے لبوں پر پھیل گئی آج اس نے معمول کے مطابق اس کے در پر حاضری نہ دی تھی تو وہ بے چین ہو کر وجہ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ حمدان نے موبائل بجنے دیا۔

تھوڑی دیر بعد موبائل دوبارہ بج بج کر خاموش ہو گیا۔ جب تیسری بار گھنٹی بجی تو حمدان کی برداشت جواب دے گئی۔ موبائل آف کرنے کے ارادے سے اس نے جیب سے نکالا لیکن اس بار اسکرین پر اماں کالنگ جگمگا رہا تھا۔ حمدان نے مرے مرے انداز میں فون کان سے لگایا۔

"جی اماں! بس میں آ رہا ہوں گھر۔"

"یہ میں ہوں، اماں بے ہوش ہو گئی ہیں پلیز

آپ جلدی پہنچیں۔ ساتھ والے صدیقی صاحب
اوران کے بیٹے اماں کو ہاسپٹل لے جارہے ہیں۔
میں بھی ساتھ ہوں۔" بے تحاشا روتے ہوئے
اطلاع دینے والی یہ جمیر تھی۔ اس نے اطلاع دیتے
ہی کال منقطع کردی تھی۔ حمدان کو زور کا چکر آیا۔
کس مشکل سے خود کو سنبھالتا وہ اسپتال پہنچا تھا یہ وہ
خود ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

اماں آئی سی یو میں تھیں۔ ڈاکٹرز کے مطابق
یہ انجائنا کا شدید اٹیک تھا اگر ہمسائے بروقت
اسپتال نہ پہنچاتے تو صورت حال مزید گمبھیر ہوسکتی
تھی۔ حمدان ماؤف دماغ کے ساتھ ڈاکٹر کی بات
سن رہا تھا۔ صدیقی صاحب کی فیملی نے بہت ساتھ
دیا وہ تہہ دل سے ان کا ممنون تھا۔

رات گئے اماں کو وارڈ میں شفٹ کردیا گیا۔
اب حالت خطرے سے باہر تھی لیکن اماں کی بہو کی
حالت اب بھی دگرگوں تھی رو رو کر اس کے پپوٹے
سوج چکے تھے۔ جس گھڑی اماں بے ہوش ہوئی
تھیں اسے لگا وہ ہمیشہ کے لیے انہیں کھو بیٹھی ہے۔
اتنا وقت گزرنے کے باوجود اس لمحے کی دہشت اور
خوف سے باہر نہ نکل پائی تھی۔ ایک بار پھر ماں کو
کھونے کا تصور ہی اتنا وحشت ناک تھا کہ اس کی
انزائٹی کنٹرول نہ ہورہی تھی۔

"اب اماں ٹھیک ہیں جمیرا پلیز حوصلہ کرو۔"
حمدان نے اسے نرمی سے پکارا۔ جمیر نے خالی خالی
نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اماں کی طبیعت یک دم گھبرانے لگی تھی۔
انہوں نے مجھ سے کہا۔ میرا دل گھبرا رہا ہے میں ان
کے لیے پانی لینے گئی اتنی دیر میں وہ......"

"ہاں اتنی دیر میں وہ بے ہوش ہوگئی تھیں لیکن تم
نے اس وقت ہمت اور حوصلے سے کام لیا ساتھ
والوں کو فوراً بلالائیں۔ بروقت اسپتال پہنچنے کی وجہ
سے اماں کی جان بچ گئی۔ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں
صرف دوائیوں کے زیر اثر غنودگی میں ہیں تم پلیز
حوصلہ کرو۔"

حمدان نے اس کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ اپنے
ہاتھ میں لے کر پھر تسلی دی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس وقت
خود اس کے لیے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ
لڑکی جس کا اس کی ماں سے کوئی خونی رشتہ بھی نہ تھا
انہیں کھونے کے خوف سے کیسی ادھ موئی ہوئے
جارہی تھی۔ ایک وہ بدنصیب تھا جو ماں کی ساری
پریشانیوں کا سب سے بڑا سبب تھا اگر ماں اسے
معاف کیے بغیر اس دنیا سے چلی جاتی تو وہ خود جیتے
جی مر جاتا۔ کتنا ناخلف اور بدتمیز بیٹا تھا وہ۔ اپنی ماں کو
کس ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا اب اس کی کوئی بھی
معافی ماضی کی نالائقیوں کا مداوا نہ کرسکتی تھی۔

پچھتاوؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس نے
حمدان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا لیکن وہ مرد تھا
باوجود خواہش کے دھاڑیں مار کر رونے پر قادر نہ تھا۔

جمیر کے فون پر حسنہ آپا کی کال آئی تو جمیر نے
فون حمدان کی جانب بڑھا دیا۔

"میری آواز سن کر آپا پریشان ہوں گی۔ آپ
بات کرلیجیے لیکن انہیں کچھ بتایئے گا مت وہ اتنی دور
سے فوری طور پر نہیں آسکتیں۔ انہیں پریشان کرنے کا
فائدہ۔"

رندھی ہوئی آواز میں اس نے حمدان کو مخاطب
کیا۔ حمدان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فون
ریسیو کیا تھا۔ وہ حیران تھیں کہ جمیر کا فون حمدان نے
کیسے اٹھالیا۔

"وہ کچن میں ہے آپا! آپ سنائیں، سب
خیریت ہے نا۔"

اس نے بہن کو مخاطب کیا۔ جی ہی جی میں یہ
سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ جب بہن وطن لوٹے گی
تو وہ اس سے نگاہیں کیسے ملا پائے گا۔

حسنہ ماں سے بھی بات کرنے کی خواہاں تھیں
حمدان نے بہت مشکل سے انہیں ٹالا تھا۔

☆☆☆

اماں دوائیوں کے اثر سے باہر آئیں تو بیٹا بہو

ان کی پائینتی سنبھالے بیٹھے تھے۔ عمیر ان کے سینے سے چمٹی تو حمدان نے ماں کے پاؤں پر لب رکھ دیے اس کے آنسو ان کے پیر بھگونے لگے۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔ مانی! بے وقوفی کی حرکتیں مت کرو۔" کتنے عرصے بعد انہوں نے اسے اس کے پیار کے نام سے پکارا تھا۔

"آپ دنیا کی سب سے اچھی ماں اور میں دنیا کا سب سے برا بیٹا ہوں۔ مجھے معاف کردیں اماں۔" وہ باقاعدہ رونے لگا تھا۔ عمیر نے حیرت سے اسے دیکھا اپنی زندگی میں وہ پہلی بار کوئی روتا ہوا مرد دیکھ رہی تھی۔

"کہہ تو رہی ہوں۔ میں ٹھیک ہوں اب۔ یہاں آکر بیٹھو میرے پاس۔"

اماں اس کے رونے کو اپنی طبیعت خرابی پر محمول کر رہی تھیں انہیں کیا علم تھا وہ کس کس گناہ کی معافی مانگنا چاہ رہا ہے۔

"بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو کر گھر واپس چلیں۔ میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گا۔"

وہ اب ان کے ہاتھ تھام کر یقین دہانی کروا رہا تھا۔ اماں تھکے تھکے انداز میں مسکرا دیں۔

حمدان جانتا تھا وہ اس یقین دہانی کو ماضی کے تناظر میں دیکھ رہی ہیں پہلے بھی ان کی طبیعت خرابی کی وجہ سے اس نے فرماں برداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے شادی پر ہامی بھر لی تھی لیکن بعد میں کیسا طرز عمل اپنایا تھا۔

ماں کی بے اعتباری پر وہ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا لیکن سچ یہی تھا کہ اس نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے ہی اپنا اعتبار کھویا تھا۔ اب پچھتانا بے سود تھا۔

☆☆☆

فریحہ کے فون پر فون آ رہے تھے۔ وہ اب اس کی آواز سننے کا بھی روادار نہ تھا لیکن اس مصیبت سے پیچھا چھڑانے کا کوئی طریقہ بھی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اگر اس سے صاف صاف کہہ دیتا کہ وہ اس کی حقیقت جان چکا ہے تب بھی وہ جنونی اور شدت پسند لڑکی جنون میں آکر کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتی تھی۔

حمدان کو اسبطین کے کسی نقصان کی کوئی پروا نہ تھی لیکن وہ اپنی ذات سے وابستہ کوئی تماشا نہ چاہتا تھا اماں کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ فریحہ کا کوئی نیا تماشا یا جگ ہنسائی برداشت کر پاتیں، ایسی صورت حال میں حمدان کو کوئی صحیح مشورہ دینے والی ہستی بھی تو نہ تھی۔ اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر اسے تاؤ بھی چڑھ رہا تھا لیکن اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی سجھائی نہ دے رہا تھا۔

☆☆☆

جس شام اماں ڈسچارج ہو کر گھر آئیں اسی رات طاہرہ چچی کا اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ یہ موت اتنی انہونی اور اچانک تھی کہ سب ہکا بکا رہ گئے۔

"توقیر تو جانے کب پاکستان پہنچ پائے۔ تو جا حمدان وہاں گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اللہ نے اچانک ہی کیسی آزمائش ڈال دی اس گھرانے پر۔" اماں دیورانی کی موت پر آنسو بہا رہی تھیں۔

"طاہرہ چچی کے میکے والے چند گھنٹوں تک پہنچ ہی جائیں گے آپ مجھے وہاں جانے کا مت کہیں۔" حمدان نے صاف انکار کر دیا۔

"تو میری وجہ سے وہاں جانے سے انکاری ہے نا بیٹا۔! اب موقع ایسا ہے کہ میں نے اپنی ناراضی پس پشت ڈال دی ہے۔ ہم دونوں گھرانوں میں جتنے مرضی اختلاف ہوں لیکن وہ تیرے مرحوم چچا کی بیوی تھی اس مشکل اور کڑے وقت میں ناراضیاں نہیں نبھائی جاتیں۔"

اماں اب بھی یہ سمجھ رہی تھیں کہ حمدان ان کو دیے قول کی وجہ سے وہاں جانے سے انکاری ہے۔

"ان لوگوں کی حقیقت مجھ پر کھل چکی ہے اماں! میرا ظرف آپ جتنا بلند نہیں کہ میں سب کچھ بھلا کر وہاں چلا جاؤں اور اگر اعلا ظرفی کا ثبوت دے بھی دوں تو اللہ جانے میت کے گھر میں فریحہ کیا تماشا لگائے۔ میں اتنے دنوں سے اس کی کال بھی نہیں اٹھا رہا

ہوں۔ وہ ہسٹیریک ہو رہی ہوگی۔"

حمدان کو صورت حال کا ادراک تھا۔ اماں نے رات جیسے تیسے کر کے گزار لی لیکن اگلے دن جنازہ اٹھنے سے پہلے وہ حمدان کو ساتھ لے کر زبردستی وہاں چلی گئیں۔

ان کی طبیعت خرابی کے پیش نظر غیر نے بھی انہیں...... روکا لیکن وہ مرنے والی کی خطائیں معاف کر کے اپنے دل سے ساری کدورتیں مٹائے، مرحومہ کی اگلی منزل کی آسانی کی دعاؤں کے ساتھ وہاں پہنچی تھیں۔

حمدان کا خدشہ درست نکلا۔ جب وہ ماں کو سہارا دیتے اندر داخل ہوا تو میت کے پاس بیٹھی فریحہ اماں کو دیکھ کر بپھر گئی۔

"تم اس عورت کو یہاں کیوں لے آئے حمدان! یہ میری ماں کی قاتل ہے۔"

وہ چلائی تھی۔ اس نے فریحہ کی بات پر بہت مشکل سے اپنا اشتعال کنٹرول کیا۔ فریحہ کی نگاہ میں اماں ہی تھیں جو حمدان کے ساتھ اس کی شادی میں رکاوٹ ڈال رہی تھیں۔ شاید وہ طاہرہ چچی کی موت کو اس وجہ سے ہونے والے ذہنی دباؤ کا نتیجہ سمجھ کر چیخ چلا رہی تھیں حمدان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ لفظ قاتل علامتی طور پر استعمال نہیں کر رہی بلکہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔

"کل دوپہر کو تمہاری ماں نے تمہارے باپ کی برسی کا کھانا بھجوایا تھا۔ وہ کھا کر امی کی حالت بگڑ گئی۔ یہ میری ماں کی قاتل ہے۔"

وہ اماں کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے چلائی تھی۔ اس الزام پر اماں لڑکھڑا کر گرنے کو ہوئیں۔ حمدان نے انہیں مضبوطی سے تھاما۔

"اگر تم اپنی ماں کی موت پر بھی تماشا لگانا چاہتی ہو تو شوق سے لگاؤ۔ اماں کل گھر پر ہوتیں تو ابا کی برسی کا اہتمام ہوتا۔ کل شام کو میں اور میری بیوی اماں کو ڈسچارج کروا کر اسپتال سے گھر لائے ہیں۔ ابھی بھی میری ماں دل کی تکلیف سے مکمل صحت یاب نہیں ہوئی تف ہے تم پر فریحہ! تمہارے شاطر دماغ نے تو اپنی ماں کی موت کو بھی کیش کروانا چاہا۔"

حمدان نے ملامت بھرے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"اس عورت نے آخر تم کو بھی مجھ سے چھین لیا حمدان۔!" وہ حمدان پر نگاہیں گاڑ کر جیسے بڑبڑائی پھر غش کھا گئی تھی۔ رش میں سے جگہ بناتا تو قیر بہن کے پاس پہنچا۔ وہ اس کے گال تھپک کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"حمدان پلیز۔ تم تائی جان کو بٹھاؤ۔" اس نے بہت معذرت خواہانہ انداز میں حمدان کو مخاطب کیا صاف ظاہر تھا کہ فریحہ کے لگائے الزام پر اسے رتی برابر بھی یقین نہ تھا۔

"چلتے ہیں تو قیر بھائی! غم کی اس گھڑی میں آپ لوگوں کو پرسہ دینے آئے تھے اللہ آپ کو صبر دے۔ اب ہمارا یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں بچا۔"

وہ سنجیدگی سے کہتا ماں کو سہارا دیے واپسی کے لیے مڑ گیا تھا۔ اس گھر کی دہلیز پر شاید ہی اس نے کبھی دوبارہ قدم رکھنا تھا۔

☆☆☆

سوئم کے بعد تو قیر بہن کے رویے کی معذرت کرنے آیا تھا۔

اماں دوا کھا کر سو رہی تھیں۔ حمدان نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ساتھ ہی عبیر کو چائے بنانے کو کہا۔ گھر آئے مہمان کا لحاظ کرنا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ اب اس گھرانے کے کسی فرد سے بات تک کرنے کا روادار نہ تھا۔

"فریحہ نے اس دن بہت نامناسب بات کی۔ غم کی شدت سے وہ حواس کھو بیٹھی تھی۔ میں تم سے اور تائی جان سے معافی مانگنے آیا ہوں۔"

"فریحہ کے کسی عمل کے لیے آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں تو قیر بھائی لیکن آپ کی غلط فہمی دور کر دوں، وہ اس وقت اپنے مکمل ہوش و حواس میں تھی۔ بہرحال میں یہ نہیں جانتا کہ اماں پر الزام لگا کر

وہ میرے دل میں میری ماں کے خلاف شک پیدا کرنا چاہتی تھی یا دنیا والوں کے سامنے صرف اماں کو ذلیل کرنا مقصد تھا۔ آپ کی بہن بہت شاطر ہے، اس کی چالیں سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔"

وہ تلخی سے بولا تھا۔ توقیر نے بہن کی صفائی پیش کرنے کے بجائے چپ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

"برسوں پہلے میری بہن آپ کی مرحومہ ماں اور بہن کی سازش کا شکار ہوئی۔ میں ایسا عقل کا اندھا کہ فقط یہ سمجھتا رہا کہ یہ روایتی گھریلو چپقلش تھی اور اس کے لیے بھی میں اپنی بہن کو ہی مورد الزام ٹھہراتا رہا حالانکہ حسنہ آپا کے مزاج اور عادتوں کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ محبت اور خلوص کے اس پیکر کو میں نے ہمیشہ فریحہ کے بیان کی روشنی میں جانچا پرکھا۔ اس تواتر سے جھوٹ سنا کہ وہ مجھے سچ لگنے لگا لیکن میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس گھر میں میری بہن کے کردار پر کیچڑ تک اچھالا گیا۔

آپا نے مجھ سے اس بات کا تذکرہ تک نہ کیا شاید انہیں ڈر ہوگا کہ ان کا عقل کا اندھا بھائی اس الزام کو بھی تسلیم کرلے گا اگر میں اس دن آپ کی والدہ اور بہن کی گفتگو چھپ کر نہ سنتا تو جانے میں کب تک فریحہ کے بچھائے جال میں پھنسا رہتا۔

اتنے برسوں میں نے اپنے گھر والوں کو جو ذہنی اذیت دی ہے سوچنے لگوں تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ توقیر بھائی!"

حمدان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ بنا کسی لگی لپٹی کے اس نے توقیر کو سب کچھ بتا ڈالا۔

"خسارہ صرف تمہارا مقدر نہیں بنا ہے حمدان! میں بھی بالکل تہی دست ہوں۔"

توقیر کے لہجے میں برسوں کی تھکن تھی۔ وہ جب پاکستان سے گیا تھا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی وہ جان گیا تھا کہ اس گھر میں رہتے ہوئے اماں اور فریحہ کبھی بھی اسے حسنہ کو اس کا جائز مقام نہ دینے دیں گے۔

وہ حسنہ کو بے تحاشا چاہتا تھا دبئی جا کر سیٹل ہونے کا مقصد یہ ہی تھا کہ وہ کچھ عرصے میں بیوی کو بھی پاس بلوا لے گا۔ ماں اور بہن سے اس بات کا تذکرہ نہ کرنے کے باوجود جانے کیسے انہیں اس کے ارادوں کی بھنک پڑ گئی۔ موبائل پر کھینچی آفاق اور حسنہ کی ایک تصویر کے ساتھ انہوں نے دبئی بیٹھے توقیر کو حسنہ کی نئی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔

تصویر میں آفاق حسنہ کو والہانہ نگاہوں سے تکتے ہوئے کوئی گفٹ پیک پیش کررہا تھا جبکہ حسنہ کے لبوں پر بھی بہت شرمیلی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تصویر میں نظر آتی حقیقت کو جھٹلانے کے لیے اپنے دل میں کوئی جواز گھڑ بھی لیتا اگر اماں اس کی آفاق سے بات نہ کروا دیتیں۔ سرِعام پر رنگے ہاتھوں پکڑا آفاق ٹیلی فون پر گھگھیا گھگھیا کر توقیر سے معافی مانگتا رہا۔ ایسی غلطی دوبارہ نہ کرنے کی یقین دہانی بھی کرواتا رہا۔

"مجھے معاف کردیں توقیر بھائی! میں تو حسنہ باجی کو بہن ہی سمجھتا تھا اگر ان کی طرف سے ترغیب نہ ملتی تو میری کبھی ایسا ویسا سوچنے کی بھی ہمت نہ پڑتی۔ میری توبہ۔ جو میں آئندہ ان کے قریب گیا۔ وہ بلائیں گی جب بھی نہیں جاؤں گا۔ آپ بس مجھے معاف کردیں۔ میں نے برسوں آپ لوگوں کا نمک کھایا ہے جانے کیسے یہ نمک حرامی کر بیٹھا۔ مجھے معاف کردیں توقیر بھائی۔"

آفاق گڑگڑا رہا تھا۔ توقیر ساکت تھا اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا پھر آفاق سے فون اماں نے لے لیا تھا۔

"تم واپس آجاؤ بیٹا! یا پھر اپنی بیوی کو اپنے پاس بلوا لو۔ تمہاری شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ تو بیاہتا بیوی کو اکیلا چھوڑ کر پردیس چلے آئے۔ عورت کے بھی کچھ فطری جذبات اور تقاضے ہوتے ہیں شوہر پاس نہ ہو تو کچھ بدبخت عورتیں چور راستے ڈھونڈ لیتی ہیں غلطی ہماری بھی ہے آفاق جوان ہے کم بخت پلا کا خوب صورت ہے ذرا سا اشارہ ملنے پر اس ذلیل شخص نے بدنیت ہونے میں دیر نہ لگائی۔ جس تھالی میں کھایا

ہی ملیا میٹ کر دیا۔ آئندہ کے لیے اس گھر کے دروازے آفاق کے لیے تو کھلیں گے لیکن میں، تمہاری بیوی کی مزید چوکیداری نہیں کر سکتی۔ یا تو خود آجاؤ ورنہ اسے وہاں بلوا لو۔"

طاہرہ بیگم نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ توقیر خود تو نہ گیا البتہ فوری طور پر طلاق کا پروانہ وہاں بھجوا دیا تھا۔ اس نے حسنہ سے وضاحت مانگنے کی کوشش ہی نہ کی۔ حسنہ نے بھی طلاق ملنے کے بعد اس سے رابطہ کر کے کوئی صفائی پیش کی نہ واویلا مچایا بس اس کی طرف سے موبائل پر چند سطری پیغام موصول ہوا تھا۔

"دنیا میں اگر کوئی شخص پورے وثوق سے ایک عورت کے کردار کی گواہی دے سکتا ہے تو وہ اس کا شوہر ہوتا ہے۔ شوہر سے زیادہ بیوی کو کوئی جانچ پرکھ نہیں سکتا۔ اگر آپ کے دل نے میری بدکرداری کی گواہی دے دی تو پھر ہمارے ساتھ رہنے کا کوئی جواز ویسے بھی نہ بچا تھا۔ طلاق نہ بھی دیتے تو میں بدکرداری کا الزام لگنے کے بعد اپنی راہیں خود ہی جدا کر لیتی۔"

حسنہ کے پیغام نے دل و دماغ میں تلاطم برپا کر دیا دل اب چیخ چیخ کر اس کے کردار کی گواہی دینے لگا تھا۔ دماغ ماں کی سنائی داستان کے جھول پکڑنے لگا تھا۔ اس نے ماں کو فون کر کے سختی سے کہہ دیا کہ وہ حسنہ پر لگائے الزام کی ہرگز تشہیر نہ کریں۔ یہاں سب کو کہہ دیں کہ توقیر دبئی میں شادی رچا بیٹھا ہے اس لیے بیوی کو طلاق دے دی۔

حسان اور فریحہ کے رشتے کو برقرار رکھنے کی خاطر طاہرہ بیگم نے پہلے ہی طلاق کا سارا الزام توقیر کے سر پر تھوپ رکھا تھا اب بیٹے کے کہنے پر طلاق کا جواز دوسری شادی کو ہی بنا ڈالا۔

دو برس بعد توقیر نے اپنے دوست کی بیوہ بہن سے عقد ثانی کر بھی لیا۔ گھر تو بس گیا لیکن دل کی بستی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اجڑ گئی تھی پھر ایک دن آفاق کا فون آ گیا۔ اس بار بھی وہ رو رو کر معافیاں مانگ رہا تھا۔ حسنہ کے کردار کی گواہی دینے کے ساتھ اس بات کا اقرار کر رہا تھا کہ پیسوں کے لالچ میں وہ طاہرہ بیگم کے تیار کیے ہوئے ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔ بہن کی شادی کے لیے اسے فوری پیسوں کی ضرورت تھی لیکن جس بہن کی شادی کی خاطر اس نے ایسا گھناؤنا جھوٹ بولا تھا وہ بھی شادی کے کچھ ماہ بعد طلاق کا کاغذ لے کر واپس گھر کی دہلیز پر آن بیٹھی۔

"میرا ضمیر مجھے چین نہیں لینے دیتا توقیر بھائی!! آپ کی ماں کے کہنے پر میں نے حسنہ باجی پر تہمت تو لگا دی لیکن اس کے بعد میں ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں سو پایا۔ مجھے ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ ایک دوست مجھے دین کی راہوں پر چلانے کے لیے اپنے ساتھ درس کی مجالس میں لے کر جانے لگا لیکن میرا گناہ اتنا بڑا ہے کہ میں سوچنے لگوں تو اپنے انجام سے کانپ اٹھتا ہوں۔ حسنہ باجی سے معافی مانگنے کی تو سکت نہیں لیکن اگر آپ معاف کر دیں گے تو دل کے بوجھ میں تھوڑی سی تو کمی ہو جائے گی۔"

وہ رو رہا تھا۔

"تم ایک بار پہلے بھی مجھ سے رو، رو کر معافی مانگ چکے ہو آفاق! میں تمہاری کس معافی کو قابل اعتبار جانوں؟"

توقیر نے بے بسی سے پوچھا اس وقت اس کا دل خود دھاڑیں مار کر رونے کو کر رہا تھا۔ آفاق پھر سے حسنہ کے کردار کی گواہی دینے کے ساتھ معافی کی تکرار کرتا رہا۔ وہ گفٹ پیک اس نے یہ کہہ کر حسنہ کو دیا تھا کہ یہ توقیر نے اس کے لیے دبئی سے بھجوایا ہے۔ توقیر کے سامنے حقیقت مکمل کر سامنے آ گئی۔

"میری معافی تمہارے ضمیر کے بوجھ کو کیوں کم کرے گی آفاق! میں تو خود ایک مجرم اور گناہ گار ہوں پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

توقیر نے اس سے جان چھڑوانے کی خاطر معافی کا عندیہ دے ڈالا۔ دل کی عدالت میں حسنہ پہلے ہی بری الذمہ تھی آفاق کی وضاحت نے رہا سہا

شک بھی ختم کر دیا۔

حسنہ کا سب سے بڑا مجرم تو وہ خود تھا لیکن اس کی مجرم اس کی اپنی ماں اور بہن تھیں۔ اس نے ماں کے بار بار کے اصرار کے باوجود دوبارہ پاکستان کی سرزمین پر قدم نہ رکھا۔ موت کی دھمکی دیتے دیتے آخر ماں حقیقت میں ہی مر گئی۔

وہ انہیں دفنانے وطن لوٹا تو بہن نے جنازہ اٹھنے سے بھی پہلے ایک اور ڈرامہ تیار کر لیا تھا۔

توقیر کی مجبوری تھی کہ وہ بہن کو تنہا نہ چھوڑ سکتا تھا وہ اب اسے اپنے ساتھ دبئی لے کر جا رہا تھا لیکن جانے سے پہلے وہ یہاں معافی مانگنے چلا آیا۔ یہاں اس کی معافی کا کوئی طلب گار نہ تھا۔ حمدان کی نگاہوں کے سامنے سے ویسے بھی سارے پردے ہٹ چکے تھے۔

توقیر کو احساس تھا کہ وہ مروت اور لحاظ میں اس کی موجودگی برداشت کر رہا ہے ورنہ اسے کب کا جانے کا کہہ دیتا۔

"میں فریحہ کو اپنے ساتھ دبئی لے کر جا رہا ہوں۔ کوشش کروں گا وہیں اس کی شادی کر دوں لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ تمہاری زندگی پر فریحہ کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دوں گا۔ تم نے ایک عرصہ یہ عذاب بھگت لیا ہے۔"

"میں نے جو عذاب بھگتا اس کے لیے میں کسی کو قصوروار ٹھہرا ہی نہیں سکتا توقیر بھائی! مجھے اللہ نے اتنی عقل اور شعور تو بخشا تھا کہ میں صحیح غلط میں تمیز کر سکتا میں نے اپنی عقل کو خود زنگ لگائے رکھا تو قصوروار بھی میں خود ہی ہوا نا۔ آپ کی بہن کو یا کسی اور کو کیا الزام دوں۔" حمدان تلخی سے بولا تھا۔

"آپ اپنی بہن کو ساتھ لے جا رہے ہیں یہ اچھا فیصلہ ہے ظاہر ہے آپ کو یہ ہی کرنا چاہیے تھا لیکن ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ پہلے آپ اس کا نفسیاتی علاج کروائیں۔ فریحہ ایک نفسیاتی مریضہ ہے اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو ملنے والی محبت اور اہمیت میں شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔ میں آج بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس نے مجھ سے بے تحاشا محبت کی لیکن اس محبت کو اس نے اپنے منفی جذبات سے اس قدر زہریلا بنا دیا کہ اس محبت سے تعفن اٹھنے لگا۔

فریحہ جیسے نفسیاتی مریض اپنی زندگیوں میں تو خود زہر گھولتے ہی ہیں اپنے اردگرد بسنے والوں کو بھی نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں۔ آپ کی مرحومہ والدہ اللہ ان کی مغفرت کرے وہ بھی محض اپنی بیٹی کی محبت میں اس کا ساتھ دیتی چلی گئیں۔"

حمدان بول رہا تھا اور اس کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ اس نے۔ توقیر کو اس کے ایک ایک لفظ سے اتفاق تھا۔

"چلتا ہوں۔ تائی جان اٹھیں تو انہیں میرا اسلام کہنا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حمدان نے اسے رسمی طور پر بھی روکنے کی کوشش نہ کی۔

توقیر نے جاتے سے بہت متلاشی اور پیاسی نگاہوں سے گردوپیش کو دیکھا ایک آس تھی کہ ہو سکتا ہے حسنہ کی جھلک دیکھنے کو مل جائے۔

"حسنہ؟" واپسی کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے دھیرے سے کچھ پوچھنا چاہا۔

"آپا اپنے گھر میں بہت خوش ہیں۔ اللہ نے انہیں بہت اچھے جیون ساتھی سے نوازا ہے۔ آج کل عمرے کی سعادت حاصل کر رہی ہیں پھر ہو سکتا ہے مزید سیر و سیاحت کے لیے نکل جائیں۔ اللہ نے ان کے صبر کا بہت خوب اجر دیا ہے الحمدللہ!" حمدان نہ چاہتے ہوئے بہت کچھ جتا گیا۔

"حسنہ سے کہنا اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دے۔" توقیر دھیرے سے بولا تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں توقیر بھائی! میں حسنہ آپا سے ماضی سے جڑی کوئی بھی بات کر کے ان کے زخم پھر سے ہرے نہیں کرنا چاہتا۔" حمدان نے انہیں آس دلانا مناسب نہ جانا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا پھر حمدان کا کندھا تھپتھپا کر گھر سے باہر نکل گیا

تھا۔اس معافی کا بوجھ جانے کب تک اس کے سینے پر دھرا رہتا تھا۔

☆☆☆

حسنہ وطن واپس لوٹیں تو ان کا صبح کا بھولا بھائی حقیقت میں شام کو گھر لوٹ آیا تھا لیکن اب اس بھولے کی بیوی اسے لفٹ کروانے پر تیار نظر نہ آتی تھی۔

"میں نے وہاں ہر گھڑی تم دونوں کے لیے دعائیں مانگی ہیں عمیر! یقین ہی نہیں آتا کہ اللہ نے اتنی جلد میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دیا۔ اب حمدان تمہارا ہے چندا! صرف اور صرف تمہارا۔ اپنا دل اور ظرف بڑا کر کے اسے معاف کیوں نہیں کر دیتیں۔" وہ عمیر کو پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

"کمال کرتی ہیں حسنہ آپا! آپ کے بھائی نے معافی کے دو بول تک بولنے کی زحمت نہیں کی میں خواہ مخواہ میں انہیں کیسے معاف کر دوں۔" وہ خفگی سے منہ پھلا کر بولی۔

"آپ سے بھی تو معافی مانگ لی ہے نا حمدان نے اور کیسے شرمندہ ہو کر بار بار معافی مانگ رہے تھے بس رو کر ہاتھ پاؤں جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔ آپ نے فراخدلی سے معاف بھی کر دیا۔ مجھ سے معافی مانگتے ہوئے ان کی اونچی ناک آڑے آتی ہے اور پھر یہ ہم عورتوں سے ہی کیوں توقع کی جاتی ہے کہ وہ مرد کی ہر خطا کو ہنسی خوشی معاف کر دیں۔ پروین شاکر مرحومہ کو ایسا ہرجائی اچھا لگتا ہوگا جو جہاں کہیں بھی جا کر لوٹ کر واپس آتا ہے مجھے ایسے بندوں پر سخت تاؤ چڑھتا ہے اب جب آپ کے بھائی پر اس کی محبوبہ کی حقیقت کھل گئی تو وہ اس پر لعنت بھیج کر اپنا گھر بسانے چلا آیا ذرا سوچیں فریحہ کا پول نہ کھلتا تو میری زندگی کس ڈھب پر گزرتی وہ تو ان محترمہ سے شادی کرنے چلے تھے۔ میرا دل اور ظرف ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا آپا! کہ میں اتنی جلدی سب کچھ بھلا کر آپ کے بھائی کے سنگ ہنسی خوشی نئی زندگی کی شروعات کر دوں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"تمہاری سب باتیں درست، سارے شکوے جائز لیکن میں پھر بھی یہ کہوں گی میرے بھائی کو ایک موقع اور دو۔" حسنہ کا بس نہ چل رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان پلک جھپکتے میں سب کچھ ٹھیک کر دیں۔

"بس حسنہ آپا! ثابت کر دیا نا آپ نے آج کہ آپ صرف میری نند ہیں۔ آج بھی آپ کو اپنے بھائی کا خیال ہے۔" اس نے مصنوعی خفگی سے منہ پھلایا۔

"وہ میرا بھائی بھی ہے اور داماد بھی۔ اچھی ساسیں داماد وں کا بھی خیال کرتی ہیں ناں چندا۔" انہوں نے مسکرا کر پینترا بدلا۔

عمیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ حسنہ نے اس مسکراہٹ کے قائم رہنے کی صدق دل سے دعا کی تھی۔

☆☆☆

عمیر جانتی تھی وہ جی جان سے شرمندہ ہے لیکن اس شرمندگی کا اظہار کرنے میں کیا امر مانع ہے یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اماں کی طبیعت کا خیال کر کے، ان کی خوشنودی کی خاطر ان کے سامنے اچھے میاں بیوی کا کردار دونوں ہی بخوبی نبھا رہے تھے لیکن حقیقت میں دونوں کے بیچ روز اول والی خلیج برقرار تھی۔

حسنہ آپا دو دن میکے گزار کر واپس گھر لوٹ گئی تھیں۔ مرتضیٰ انہیں لینے آئے تھے۔ ان دونوں کو اتنا خوش اور مطمئن دیکھ کر عمیر کا دل شانت ہو جاتا تھا۔ حسنہ آپا اور ڈیڈی کو رخصت کر کے وہ اماں کے بیڈ روم میں انہیں دوا دینے چلی گئی۔ کمرے میں آئی تو حمدان اپنے موبائل پر مصروف تھا ڈریسنگ ٹیبل پر دو مہکتے گجرے موجود تھے۔ اس "جذبہ خیرسگالی" پر عمیر کا خون کھول اٹھا۔

"معذرت کرنے کے لیے آپ کے پاس دو حرفی جملے نہیں یہ گجرے لا کر سمجھ رہے ہیں کہ میں اس عنایت پر آپ کے سارے قصور ہنسی خوشی معاف کر دوں گی۔" وہ تیکھے تیوروں سے حمدان سے مخاطب

ہوئی۔ حمدان نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

"ہم تسلی، سکون سے بات کر سکتے ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ جبیر کے چہرے کے زاویے ہنوز بگڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"اگر صرف معافی مانگنے سے میری ساری کوتاہیوں کی تلافی ہو سکتی تو میں تم سے کب کا معافی مانگ چکا ہوتا لیکن میں نے تمہارے ساتھ جو زیادتیاں کی ہیں، وہ میری معافی کے مقابلے میں بڑی ہیں سچ کہوں تو تم سے معافی مانگنے کا مجھ میں حوصلہ ہی نہیں۔"

وہ دھیرے سے بولا تھا۔ جبیر کے چہرے پر فقط "ہونہہ" والے تاثرات تھے منہ سے بہرحال کچھ نہ بولی۔

"اور جہاں تک ان گجروں کا تعلق ہے تو یہ میں نہیں لایا شاید حسنہ آپا کے ہوں۔ جب تم کچن میں تھیں تو حسنہ آپا واش روم میں وضو کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے اتار کر رکھے ہوں گے۔"

حمدان کی اگلی بات سے جبیر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خواہ مخواہ میں حمدان سے مخاطب ہوئی جب کہ وہ تو آج بھی پیش قدمی کا مرتکب نہ ہوا تھا۔

"صبح آفس کے لیے آپ کے کون سے کپڑے پریس کروں۔" اپنی خجالت دل میں چھپاتے اس نے سنجیدگی سے گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا۔

"اپنے کپڑے میں خود پریس کرلوں گا بلکہ.....

" حمدان نے بات ادھوری چھوڑی۔ جبیر نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "بلکہ تمہارے بھی کر دیا کروں گا تم ایک موقع تو دو میں بہت تابعدار اور فرماں بردار قسم کا شوہر ثابت ہوں گا۔ تابعداری کے سارے ریکارڈ توڑ دوں گا اماں اور آپا تو مجھے زن مرید ہونے کے طعنے بھی دیا کریں گی۔"

وہ اب بھی مکمل سنجیدہ تھا لیکن یقین دہانیوں کی نوعیت سن کر جبیر ہکا بکا رہ گئی تھی کم از کم اس شخص کے منہ سے وہ ایسی بات کی توقع ہی نہ کر سکتی تھی اس کی حیرت بھانپ کر حمدان ہنس پڑا۔

"بہت عرصہ ہو گیا تمہیں میرے گھر والوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے۔ اب میں کوشش کروں گا کہ اس گھر میں تمہیں سب سے زیادہ اپنا میں لگوں باقی سب سسرالی لگنے لگیں۔"

"خام خیالی ہے آپ کی یہ میرا گھر ہے اور سب گھر والے میرے اپنے۔" وہ تنک کر بولی تھی۔

"اور جو اصل میں گھر والا ہے اسے کب تک پرایا رکھو گی۔" حمدان نے مسکرا کر پوچھا۔

"جب تک میرے دل سے سارے ملال نہیں دھل جاتے۔" جبیر کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

حمدان نے گہری سانس اندر کھینچی وہ اس کانچ سی لڑکی کو اتنے دکھ دیے بیٹھا تھا کہ اب تلافی کرتا بھی تو کیسے۔

"معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتی اور شادی کے بعد کسی اور کی محبت کا دم بھرتی تو کیا آپ مجھے معاف کر دیتے؟"

جبیر نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔ حمدان اس کے اس قدر رنج ہونے پر اسے دکھ بھرے انداز میں دیکھ کر رہ گیا۔ سچ بھی یہی تھا کہ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"ہم عورتوں سے اس قدر اعلا ظرفی کی توقع کیوں کی جاتی ہے۔ وہ زہر خند مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولی۔

"عورتوں سے اس اعلا ظرفی کی توقع اس لیے کی جاتی ہے جبیرا کہ اللہ نے فطرتاً ہی انہیں بہت بڑے ظرف سے نوازا ہے۔ وہ اپنا گھر بسانے، خود سے وابستہ رشتے نبھانے کے لیے اپنی ذات کی نفی کرتی ہیں۔ اس عظمت کا لفظوں میں احاطہ ممکن ہی نہیں۔ میں دنیا کا خوش قسمت ترین مرد ہوں جس کو ماں، بہن اور بیوی کے روپ میں عورت کا عظیم اور مقدس ترین روپ ملا۔ میں تم جیسی اچھی بیوی ڈیزرو

Scanned with CamScanner

ماہنامہ کرن
نومبر 2022ء کے شمارے کی ایک جھلک
کرن
رائٹر "نادیہ اختر" سے شاہین رشید کی ملاقات
اداکار "شہزاد شیخ" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
اس ماہ "نوشی مغل" کے "مقابل ہے آئینہ"
"تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلے وار ناول
"دامن سحاب" مہوش افتخار کا سلسلے وار ناول
"دوریاں اور نزدیکیاں" آسیہ رئیس کا مکمل ناول
"نمکین پانیوں کا سفر" نیلم ملک کا مکمل ناول
"چنار کا آخری پتا" فلک سحر کا مکمل ناول
"لا" فشا محسن علی کا ناولٹ
"ایک چھوٹا سا لڑکا تھا میں جن دنوں" میمونہ صدف کا ناولٹ
سیماب عاصم، نظیر فاطمہ اور مریم شہزاد کے افسانے اور مستقل سلسلے
"کرن کتاب"
دلچسپ معلوماتی مضامین اور منے دلار ریسپیز کے ساتھ
نومبر 2022ء کا شمارہ شائع ہوگیا

ہی نہیں کرتا۔ میرے اور تمہارے رشتے کے بیچ یہ
شرمندگی دیوار بن کر کھڑی ہے۔ حسنہ آپا کہتی ہیں
معافی مانگنے سے فاصلے سمٹ جائیں گے لیکن سچ تو یہ
ہے کہ میں تم سے معافی تک مانگنے کا اہل ہی نہیں۔"
حمدان بھی جیسے خود سے جنگ کرتے کرتے تھک
گیا تھا سو اسے اپنی دلی کیفیت حرف با حرف سنا
ڈالی۔

"معافی مانگ کر تو دیکھتے ہوسکتا ہے حسنہ آپا کا
کہا سچ ہو جاتا۔ آخر اماں اور آپا سے بھی تو معافی
مانگی ہی ہے نا آپ نے مجھ سے معافی مانگنے کا مرحلہ
آیا تو تو ادھر، ادھر کی ڈھیروں باتیں کر ڈالیں بس
معافی ہی نہ مانگی گئی آپ سے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"اس ساری گفتگو کو تم معذرت کے کھاتے میں
نہیں ڈالتیں۔" حمدان حیران تھا۔

"بالکل نہیں۔" عبیر نے نفی میں گردن ہلائی۔

"آئی ایم سوری، ایکسٹریملی ویری سوری۔
آئندہ تمہیں بھی شکایت کا موقع نہ دوں گا
جان! پرامس، پکا پرامس۔" اس نے عبیر کے ہاتھ
تھام کر یقین دلایا۔

"مجبوری ہے میری چند لمحوں پہلے آپ نے
مجھے اعلا ظرف عورتوں کی کیٹگری میں شامل کر دیا
ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے آپ کو معاف کرنا
پڑے گا۔" عبیر نے جیسے اس کی سات پشتوں پر
احسان کیا۔ حمدان اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے
ہوئے مسکرایا تھا۔

"اب اجازت ہے تو یہ گجرے بھی پہنا دوں۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے یہ حسنہ آپا......!"
عبیر نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے خفگی سے دیکھا۔

"تمہارے تیور دیکھ کر ڈر گیا تھا، اسی لیے
جھوٹ بولنا پڑا۔" اس نے بڑی بے چارگی سی شکل بنا
کر آگاہ کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے گجرے تو پہنا دیں پھر لائٹ
جانے سے پہلے اپنے آفس کے کپڑے پریس کر لیجیے
اور ہاں الماری سے میرا پرپل والا سوٹ نکال کر وہ بھی
پریس کر دیجیے گا۔ کل ہم ڈیڈی کی طرف جائیں گے
۔ حسنہ آپا ڈنر پر انوائیٹ کر کے گئی ہیں۔"

عبیر نے مناسب جانا کہ لگے ہاتھوں اس کے
دعووں اور وعدوں کو بھی ساتھ ہی پرکھ لے جب ہی اپنا
سوٹ استری کرنے کو کہا۔

"یار! تم تو واقعی ایک منٹ میں بیوی بن
گئیں۔" حمدان کے چہرے پر زمانے بھر کی بے
چارگی پھیلی تھی۔

"ایک اعلا ظرف بیوی شوہر کی اتنی سی
تابعداری تو ڈیزرو کرتی ہے نا حمدان!" عبیر
آنکھوں میں چمک لیے اسے ستانا چاہ رہی تھی۔ اس
کے منہ سے پہلی بار اپنا نام سن کر حمدان کا من خوشی سی
جھوم اٹھا تھا۔

"ایک اعلا ظرف بیوی سب سے پہلے شوہر کا
اظہار محبت ڈیزرو کرتی ہے میری جان!"
حمدان نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی
کی۔ عبیر کے چہرے پر حیا آلود مسکراہٹ پھیل گئی۔
شوہر کی محبت کی حکایت تو اس نے سن ہی لی تھی لیکن
وہ ابھی حمدان کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس رشتے کو
نبھانے کے لیے وسعت قلبی اور اعلا ظرفی کے علاوہ
وہ محبت بھی تھی جو نکاح کے دو بولوں کے ساتھ اس
کے دل میں جڑ پکڑ چکی تھی۔

حمدان کے لیے فی الحال اتنی سزا کافی تھی کہ یہ
اقرار محبت سننے کے لیے اسے ابھی مزید انتظار کرنا
تھا۔ کم از کم اتنا انتظار تو ضرور جتنا عبیر نے اس کا
اظہار سننے کے لیے کیا تھا۔ ابھی تو پورے حق سے اس
نے وہ محبت اور چاہت وصول کرنی تھی جو رب نے
اس کے مقدر میں لکھ رکھی تھی اور جو بلآخر اس کو مل کر
رہی۔

صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ ہی آیا تھا اور عبیر
جانتی تھی کہ یہ اس کا آخری پڑاؤ ہے۔ مدھم مسکان
لبوں پر سجا کر اس نے گجرے پہننے کے لیے ہاتھ آگے
بڑھا دیے۔

☆☆

Scanned with CamScanner

کبھی کبھی وہ خود بھی حیران ہو جاتی تھی

"ہائیں میری دوستی اس چھچھوری سے ہے۔ جس کا نام فرینہ تھا۔" عالیہ اسے فری کہتی تھی۔ ہر دوسرے دن وہ ملنے بھی آ جاتی۔

"کلو گوشت پکایا ہے میں نے ابھی ابھی گوبھی ڈال کے" وہ کہتی اور عالیہ سوچتی رہ جاتی۔

"خوش نصیب ہے۔ روز کلو گوشت پکاتی ہے، وہ بھی گوبھی ڈال کے اور میں ہفتے میں دو یا تین بار وہ بھی صرف آدھا کلو۔" بس یہی رشک ہوتا۔ اتنا سا اور حسد میں بدلنے سے پہلے ہی وہ نیا شوشہ چھوڑ دیتی۔

"کل دس ہزار والے دو سوٹ خریدے ہیں میں نے۔" اس کی اس خوش خبری کے بعد عالیہ کا دل چاہتا کہ اپنا سولہ سو والا لان کا سوٹ چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ کمال ہے دس ہزار والا سوٹ وہ بھی ایک شادی کی تقریب کے لیے، بھلا دیکھوں تو ہیں کیسے۔

سوٹ ملاحظہ کرنے کے بعد دل مکدر سا ہو گیا تھا اتنے گندے رنگ کہ بس خیر پسند اپنی اپنی نصیب اپنا اپنا بلکہ وہ نصیبوں والی اور ہم ٹھہرے کم نصیب۔ دوست ان پڑھ تھی وہ بھی جٹی، سرائیکی بولتی تھی اور سرائیکی کا ستیاناس کر دیتی۔ بے چاری سرائیکی کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ "میکوں چھوڑ دے" (مجھے چھوڑ دو)

اس کے سامنے شیخی مارنے کی عالیہ نے کبھی ہمت نہیں کی، بھلا سورج کو کون چراغ دکھا سکتا ہے۔ عالیہ نے اپنے چراغ کا مذاق بنوانا تھا کیا مگر اندر ہی اندر اپنے شوہر پر غصہ بہت آ رہا تھا۔

"ہمیں ٹرخا رکھا ہے کہ مہنگائی بہت ہے، بس ہمارے یہاں ہی آئی ہے سب سے زیادہ مہنگائی اور دنیا کو دیکھو رج رج گوشت کھا رہی ہے اور ہر شے بوریوں کے حساب سے۔" ایک دن فری سے عالیہ نے بھی تھک کر کہہ دیا تھا۔ کوئی نہ کوئی بات تو کرنی تھی سو یہ ہی کر لی۔

"آج میں نے بھی دو کلو مالٹے خریدے بڑے والے، مہنگے تھے تو وہی لیے تھے چھوٹے مالٹے تو کھٹے ہوتے ہیں، وہ میں نہیں کھاتی۔" مگر اس کے جواب نے دل کھٹا کر دیا تھا۔ بلکہ اس کے سر پر بم پھوڑ دیا تھا۔ "کل پورے دو ٹوکرے منڈی سے آئے تھے ایک آدھ مالٹا ہم نہیں کھاتے۔"

بڑے دو ٹوکروں میں شاید تیس تیس کلو یا پھر بیس بیس کلو مالٹے تو بھر ہی جاتے ہوں گے۔ چھوٹے بھی اور بڑے بھی عالیہ کی نظروں میں مالٹوں کا پہاڑ آ گیا تھا کہاں دو کلو مالٹے اور کہاں وہ مالٹوں کا پہاڑ، سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا حساب کتاب جان لیوا تھا۔

اس عورت سے تو بندہ بات بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی ایسے بھگایا جا سکتا ہے۔ فری نے ایک دن بھنڈی کا سالن بھیجا تھا اس میں ڈھیر ساری ہری مرچیں، بڑے بڑے ٹماٹر کے ٹکڑے آلو پیاز مونگ کی دال وغیرہ وغیرہ سب کچھ ہی تھا اور کچھ بھاگ نکلا تھا تو وہ ذائقہ ہی تھا۔

"یہ بے روح سالن ہے۔" اس نے اپنے چراغ سے کہا تھا۔

"یہ کیا پکا ہوا ہے اللہ معاف کرے خیر رزق ہے۔"

دو دن بعد وہ پھر آ گئی تھی جھٹ پٹ عبایا اتارا اور چارپائی پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"وہ تم نے پاپڑ کھلائے تھے ناں اس دن بڑے اچھے تھے وہ کھلاؤ۔"

عالیہ نے پاپڑ تلنا شروع کر دیے تھے جنہیں وہ جھٹ پٹ کھائے جا رہی تھی اور کچھ برقعے میں موجود شاپر میں بھی ڈال لیے تھے۔

"بڑے مزے دار ہیں بچوں کو بھی دوں گی۔" اسے حیرانی ہوئی تھی۔

"مجھے تو اتنے خاص نہیں لگے تھے ذائقہ بس عام سا ہی تھا ایسا جیسا سارے پاپڑوں کا ہوا

کرتا ہے۔"
"کوئی اچھی چیز پکاؤ تو مجھے بھی دینا۔
تمہارے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ مجھے بھی سکھاؤ
کسی دن۔"
اس کا جہازی سائز برقع پڑا ہوا تھا یہ باتیں
عام سی تھیں اس نے فری کا برقع اٹھالیا تھا۔
"پہن کر دیکھو بڑا مہنگا ہے۔" عالیہ نے
مہنگا ہونے کے احساس کے ساتھ اسے خود سے
لگا کر دیکھا تھا۔
ہائے یہ تو مجھ پر جچ گیا ہے یہی لے سکتی ہے
اتنا مہنگا برقع میں کہاں لے سکتی ہوں۔
اس نے خود پر ترس سا کھایا تھا پھر اسے
دروازے تک چھوڑنے گئی تھی۔ وہ اللہ جانے کون
کون سی باتیں کرتی رہی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
کوٹھی میں پالک، چاول، دال پھر اکثر ہی
اس کے گھر سے عجیب عجیب سا کچھ پکا ہوا آنے لگا
پتا نہیں چلتا تھا کہ کیا پکا ہے۔
"میرا سسر مجھ سے بڑا پیار کرتا ہے میرے
بغیر روٹی نہیں کھاتا ہر جگہ میری تعریف کرتا ہے۔"
وہ اس کے سسر کی چارپائی کے پاس سے
گزری تھی، ایک بڑی بڑی مونچھوں والا غصیلی
آنکھوں والا بابا تھا جو چارپائی کا بڑا سخت امتحان
لے رہا تھا۔
"دیکھا دیکھا" ہاں دیکھ لیا دیکھ لیا۔" اس
کے پاس سے گزرتے وہ خود ہی بول پڑی تھی۔
"سب بڑا پیار کرتے ہیں مجھ سے۔" وہ
عالیہ کے آگے آگے چل رہی تھی اور بولے جارہی
تھی، ایک بڑا سا کمرا تھا جس میں ایک طرف کھانا
پانی، دوسری طرف سونے کا انتظام تھا۔
"میرا گھر بن رہا ہے۔ تم دیکھو گی تو حیران رہ
جاؤ گی۔"
"میں صرف حیران نہیں ہوں پریشان بھی
ہوں کہ تم سے بے چارے سسرال والے محبت
کر کیسے لیتے ہوں گے۔ سسرالی پیار حاصل کرنا
زندہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے جیسا ہے۔"
"اری یہ پاکستان ہے، یہ ہمارا اپنا بنایا ہوا
معاشرہ ہے جس میں محبت اگر کوئی بیوی سے کرلے
تو زن مرید کہلاتا ہے اگر داماد بیٹی سے کرے تو
آنکھ کا تارا بنتا ہے اگر بیٹا بہو سے کرے تو پھٹکارا
جاتا ہے۔" یہ کہاں کی باتیں کررہی ہے اپنے
رانجھے اپنی ہیریں کام میں آگئیں سب تدبیریں۔

☆☆☆

ایک دن عالیہ نے اسے حلوہ بھیجا تھا۔ سادہ
سا حلوہ تھا ویسے ہی جیسے ہر کوئی پکالیتا ہے کشمش،
ناریل، تھوڑی سی سوجی تھی گرما گرم پائی مگر داد ایسی
ملی تھی کہ جیسے قلعہ فتح کرلیا ہو۔" واہ بہت خوب
وغیرہ وغیرہ۔ اس سے دوستی بھی عدنان کے توسط
سے ہوئی تھی۔ سردار بھائی، عدنان کے دوست تھے
ایک دن چائے پلائی تھی جو اس کے دل کو بھا گئی
تھی۔
"چائے پلاؤ، وہی والی جو تم لوگ پیتے ہو۔"
عالیہ چائے بناتی تھی بالکل ویسی ہی جیسی وہ
روز پیتے تھے، جانے کون سا کسی انوکھے طریقے
سے بنتی ہے پتی چینی ڈالو اور دودھ ڈال دو تو بن
جاتی ہے۔
رات جب دونوں مل بیٹھے تب عدنان نے
کہا تھا" سردار بھائی کے اکاؤنٹ میں بہت پیسہ
ہے۔ کم سے کم دو ڈھائی لاکھ تم بچت ہی نہیں کرتیں
فضول خرچ ہو پیسے درختوں پر نہیں اگتے خزاں
میں جس طرح درخت اپنے زرد پتے جھاڑ دیتا ہے
ایسے ہی تم بھی جھاڑ لیتی ہو۔" میرے پاس بچتا ہی
کیا ہے۔"
"سردار بھائی کی بیگم کو دیکھو ایسے ہوتی ہے
بچت، اس عورت نے گھر کو گھر بنایا ہے۔"
"اور میں نے کیا جہنم بنا رکھا ہے کیا واقعی میں
ایسی ہوں۔" عالیہ نے سوچا اور پھر جا کر بچوں کے
کمرے میں سوگئی عدنان ناراض جو تھے۔
تیسرے دن کی شام ان کی صلح ہوگئی تھی

عدنان نے معذرت تو نہیں کی البتہ اتنا ضرور کہا کہ اسے اپنے معاملات پر نظرثانی ضرور کرنی چاہیے۔

"میں کیا سونے کا نوالہ کھاتی ہوں میرے شکوے شکایت سے پہلے عمل شروع ہو جاتے ہیں اگلے کی باری نہیں آنے دیتی بھی، مطلب کہ سوئی وہیں کی وہیں اٹکی ہوئی ہے۔"

وہ چاپ چاپ ہتھیار ڈال کر بچوں کو پڑھانے لگی تھی، وقت برباد کرنے کا فائدہ جب حاصل ہی کچھ نہ ہو۔

جب وہ ایسے خاموش ہو جایا کرتی تھی تب عدنان ہی اسے منا لیتے، کچھ بھی تھا وہ عالیہ سے بہت پیار کرتے تھے یہ حقیقت ہے اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ عالیہ مان گئی تھی کوئی بحث مباحثہ نہیں کیا تھا نہ ان کے موقف کو غلط کہا نہ خود کوئی دلیل دینے کی کوشش کی۔

عدنان عالیہ کو بازار لے گئے، ہفتے کی سبزی گوشت کی خریداری کے بعد کپڑا بازار جا پہنچے اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔

"یہاں سے عبایا لوگی کہ کہیں اور چلیں اور سنو وہ سردار بھائی کی بیگم جیسا ہی لینا۔ تمہیں پسند جو بہت ہے۔ بہت تعریف کی تھی ناں تم نے۔"

وہ دل سے خوش ہوگئی تھی ویسے بھی شوہر کے لیے دل میں زہر عورت کو اندر سے ختم کر دیتا ہے۔ وہ شکوے شکایت نہیں پالتی تھی۔ عبایا کا ڈھیر سامنے کھڑا کیا۔ دکان دار نے بلیک، براؤن نیلے وغیرہ وغیرہ اس ڈھیر میں سے ایک ایک کو چھو کر دیکھا تھا عالیہ نے۔

"یہ وہ والا کپڑا نہیں ہے۔" وہ مایوس ہو کر بولی تھی۔

"آپ بتاؤ آپ کو کیسا عبایا چاہیے۔" دکان دار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا پوری دکان الٹی ہوئی تھی۔

"وہ بڑا سا گھیر والا جو کھنچ جاتا ہے۔"

"سمجھ گیا باجی! وہ ستارہ کشی کپڑا ہوتا ہے۔ جو کھنچ جاتا ہے۔ یہ تو پیور ریشمی کپڑا ہے خاص ترکش اسٹائل کا۔ صرف پانچ ہزار کا ہے۔"

"مگر مجھے وہی چاہیے۔" عالیہ کی خواہش کے سامنے عدنان بھی چپ تھے۔

"چلو جیسے تمہارا دل چاہے اب تمہیں ناراض تو نہیں کر سکتے اٹھو اور کہیں دیکھ لیتے ہیں۔" وہ معذرت کرتے ہوئے اٹھ گئے تھے ایک جگہ بالکل ویسا ہی سیاہ عبایا لٹکا ہوا تھا دوکان کے باہر۔

اس نے کھینچ کر دیکھا تو وہ کھنچ گیا، ڈرتے ڈرتے قیمت پوچھی تو دوکان دار نے پان تھوک کر کہا۔ "ہزار روپے سے ایک روپیہ کم نہیں ہوگا۔" یہ ہو بہو وہی کپڑا تھا۔

"یہ سات سو روپے میں چپ چاپ مان جائے گا کہو تو بات کروں۔" عدنان نے کپڑا دیکھ کہا تھا۔

"نہیں نہیں واپس اسی کے پاس چلتے ہیں۔" پانچ ہزار والا عبایا اپنے شایان شان لگا تھا۔ وہ دل سے اتر گئی تھی اتنی باتیں اس سستے سے عبایا کے لیے کہ سات سو کی چیز سات اا کھ کی بنادی۔

"اب میرا عبایا دیکھنا تم۔" اس نے ڈرتے ڈرتے عبایا اسے دکھایا تھا۔ لگتا کہ اس دفعہ وہ بھی امپریس ہو جائے گی مگر وہ ناک سکوڑ کر دیکھتی رہی پھر منہ بنا کر بولی۔ "یہ تو تم نے مہنگا لے لیا ہے بھلا پینتالیس سو اور وہ بھی اس کے۔"

عالیہ کا دل بجھ کر رہ گیا تھا مطلب یہ اس کے معیار کا نہیں تھا۔ وہ تو بھلا ہو دکیہ چچی کی بہو کا گلی میں ملی اور راستہ روک کر کہنے لگی۔

"عبایا تو خوب خریدا ہے رنگ بھی قیمت بتا رہا ہے کتنے کا ہے۔"

عالیہ کا دل سرشار ہو گیا تھا۔ ہو گئی قیمت وصول اب ایسی بھی بات نہیں ہے اچھا ہی ہے تب ہی تو یہ بھی کہنے کو رکی ہے۔ دل کے سارے بجھے روشن چراغ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ فری باجی کا نیا گھر بن گیا تھا وہ بے حد خوش تھیں اور ساتھ ساتھ انہیں ناخوش کرنا نہیں بھولیں۔

"تم بھی لینٹر ڈلوا کر دو کمرے اوپر بنوالو پتا نہیں کیسے رہتی ہو۔"

عالیہ کو بے اختیار یاد آیا تھا کہ دو سال پہلے عدنان لینٹر ڈلوا کر بھول گئے تھے نہ اوپر کمرا بنا نہ وہ ان خوابوں کو تعبیر دے سکی جو اس نے کتنی ہی بار سجائے تھے، قناعت کا سبق تھا جو عدنان نے خود بھی رٹ رکھا تھا اور اسے بھی رٹوا دیا تھا۔

"تم بھائی کو کہہ کر باقی کا کام بھی جلدی سے ختم کروالو مجھے دیکھو میں نے ایک مرتبہ کہا کام ہوا ہے۔"

اب سب کی قسمت آپ جیسی تھوڑی ہوتی ہے۔

فری باجی! اتنے مہنگے کپڑے، مزے دار کھانا اور منوں کے حساب سے فروٹ اپنا میاں ہر کسی کو نہیں ملتا۔"

اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ اب وہ عدنان سے ذرا سختی سے کہہ کر دیکھے گی تب ہی وہ گھر کا باقی کام جلد مکمل کرائیں گے۔ بھاڑ میں گئی ایسی محبت میں احمقوں کی طرح بیٹھی رہوں اور دنیا کہاں سے کہاں نکل جائے۔ گھر اچھا ہو تو ہر شے اچھی لگتی ہے پتا لگنا چاہیے کہ ان پر اللہ کا کرم ہے۔ دو بھی کمرے بنوا سکتے ہیں اوپر کی سیڑھیاں چڑھوں گی اور ہاں سردی کی دھوپ میں مالٹے کھاؤں گی بس اب اس خواب کو تعبیر مل ہی جانی چاہیے۔

اور پھر فری سارے گھر میں گھوم گھوم کر غلطیاں نکال نکال کر سامنے رکھ رہی تھی یہ یوں ہوتا وہ ایسا ہونا چاہیے تھا ظاہر ہے کہ اس نے اتنا بڑا گھر کھلا پیسہ لگا کر بنایا ہے تو میرے گھر کی کمیوں کا اسے پتا نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا۔

اس کا گھر دیکھ کر عالیہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی اتنے سارے کمرے خوش باش موٹے تازے بھاگتے دوڑتے بچے اور خود فری باجی کا خوب صورت صحت مند وجود، ہاں بھئی بندہ خوش ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے! فری نے کل کا بچا سالن لیا اور عالیہ کی تعریف (اس کے پکائے کھانے کی) کی میرے ہاتھ کے کھانے کی تو ہر کوئی تعریف کرتا ہے شاید اس لیے وہ بھی کہہ رہی ہے۔

شام کو جب عدنان واپس آئے تب ان کا موڈ بھی بہت عجیب سا ہو رہا تھا سردار بھائی کے ساتھ سارا دن گزارا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا گھر بار اور ان کا بینک بیلنس وغیرہ وغیرہ کے قصے سن کر آئے ہوں گے۔ اسی لیے انہیں بھی عالیہ میں بہت ساری خامیاں دکھائی دینے لگیں لگنے لگا تھا کہ عالیہ نہ سگھڑ ہے نہ ہی عالیہ کو کوئی تمیز ہے بلکہ اسے صرف باتیں بنانا ہی آتا ہے یا پھر باتیں سنانا اور کچھ نہیں آتا۔

عدنان کے شکووں کا گراف بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا بجائے اس کے کہ اس دن عالیہ ان سے جھگڑتی، وہ الٹا بھرے بیٹھے تھے، اس لیے اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی پھر جب انہوں نے خود عالیہ کو بلا کر اسے ایک ایک بات بتائی تب عالیہ پریشان ہو گئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی ہی ایک جیسے تھے ادھر فری باجی قصے سنا رہی تھیں تو ادھر سردار بھائی کا بھی یہی کام تھا۔

"ٹھیک ہے کہ وہ ہم سے زیادہ خوش حال ہیں اچھا پہن اوڑھ رہے ہیں مگر انہیں کسی دوسرے کے گھر کو یوں بے آرام بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ ان سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی مگر کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا، ایک بے سکونی تھی۔ بڑھتی ہی جا رہی تھی وہ دونوں حرص میں مبتلا نہیں تھے آ گیا تو کھایا بھی تھا اور گھر پر لگایا بھی تھا مگر پیسے کے پیچھے کبھی دوڑ نہ لگائی تھی۔ اب عجیب حالات ہو رہے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے ایک دوسرے کی غلطیاں منہ پر مار رہے تھے مگر عالیہ رک کر سوچا ضرور کرتی۔ ایسا نہیں ہونا

جانیے۔ ہر گھر کا اپنا ایک نظام ہے۔
سلطانہ باجی (ہمسائی) آئی ہوئی تھیں۔ اس نے ڈبے میں چاول ڈالے اور فری کے بیٹے کو دے دیے تھے نت نئی فرمائشیں بھی آنے لگی تھیں۔
"حلوہ تمہارے گھر اچھا بنتا ہے۔"
"قورمہ عالیہ اچھا پکاتی ہے۔"
اور وہ جو بچ جاتا دے دیتی اور پھر بخوشی قبول کرکے کبھی بڑی بڑی ہنڈیاں آجاتیں تو کبھی پیار سے کریلے تحفتاً مل جاتے اور اس کو بھی بہت ہائی لائٹ کیا کرتی فری، ایسا لگنے لگتا تھا کہ اگر وہ کریلے عالیہ کو نہ دیتی تو وہ چار روز بعد دئیے چلے جاتے۔ سونے کے کریلے، چاندی کی ہنڈی اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگتا تھا۔
سلطانہ باجی سے برسوں کا تعلق تھا جب اس نے چاولوں سے ڈبا بھرا تب وہ ہنس کر کہنے لگیں۔
"اے عالیہ بھابھی! یہ تو فری کا بیٹا ہے ناں۔ تم نے اس ندیدی قوم کو کیوں منہ لگالیا۔ یہ تو کسی کو اپنا بخار بھی نہ دیں، ان کی کنجوسی تو پورے علاقے میں مشہور ہے کوئی تعلق نہیں رکھتا ان سے نرے کھاؤ یارا (کھانے والے دوست) ہیں یہ لوگ۔" سلطانہ باجی کی بات سن کر وہ ہنس پڑی تھی۔ یہی خیال اس کا بھی تھا۔

☆☆☆

عدنان، سردار بھائی کے ساتھ باہر گئے ہوئے تھے۔
اللہ جانے وہ کیا کیا سکھا رہے ہوں گے۔ اس نے سوچا تھا اور جاتے جاتے عدنان نے کہا تھا "سنو شام کو میں اور سردار بھائی گھر ہی کھانا کھائیں گے پکا کر رکھ لینا۔
سردار بھائی اکثر ہی ایسا کرتے تھے اور کم وبیش سات آٹھ روٹیاں ایک وقت میں آرام سے کھالیتے تھے اور اس پر بھی عدنان سے ہنس کر کہتے تھے کہ سالن تھوڑا ملتا ہے تمہارے گھر ذرا زیادہ پکایا کرو حالانکہ کالونی کے دوسرے سرے پر ان کا اپنا گھر تھا۔ پانچ منٹ کے فاصلے پر، اس پر عدنان مسکرا دیتے اور کہتے اور سالن لیں سردار بھائی۔
عدنان نے ہی بتایا کہ تھا "جب میں ان کے گھر جاتا ہوں تب ان کی کٹوریاں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں جتنی طوطوں کو پانی دانہ دینے والی کٹوری، وہی لبالب بھر کر دیتے ہیں ایسا کرو کہ تم بھی کسی روز بازار جا کر ایسی ہی اسٹیل کی ننھی سی کٹوریاں خرید لاؤ تاکہ ہم بھی انہیں لبالب بھر کر دیا کریں تاکہ وہ کم ہونے کا شکوہ ہی نہ کر سکیں۔"
عدنان نے تنخواہ سے کچھ کٹوتیاں، بچتیں کر کرا کر عالیہ کی فرمائش پوری کرنے کا سوچا تھا۔ اسے عالیہ کا خیال تھا سردار بھائی کو ساتھ لے کر بازار پہنچے ایک دروازہ اور کھڑکی خریدی اور پھر سردار بھائی کے ساتھ کھانا کھانے کا سوچا تھا مگر سردار بھائی خود ہی بول پڑے تھے۔
"تم مجھے ایک چکن پیس خرید کر دے دو میں نے تمہارے لیے اتنا بھاؤ تاؤ کیا تھا دوکان دار کے ساتھ۔" اس پر عدنان ہکا بکا رہ گئے تھے۔ اتنی چھوٹی سوچ میں تو کھانا کھلانے لے جانے والا تھا مگر یہ تو۔

☆☆☆

عالیہ بازار گئی ہوئی تھی بچوں کے لیے سردیوں کے کپڑے لینے تھے واپسی پر اس نے کھجوروں کی دکان سے اپنی پسند کی کالی کھجوریں آدھا کلو پیک کروالی تھیں ان کھجوروں کا نام تو عالیہ کو پتا نہیں تھا مگر وہ گول کھجوریں علاقے کی سب سے مہنگی کھجوریں تھیں۔ دو سو روپے پاؤ۔
جیسے ہی عالیہ نے گیٹ کھولا سامنے ہی فری چلی آرہی تھی۔
"یہ کیا لیا ہے۔"
"کھجوریں لی ہیں مجھے پسند ہیں یہ والی" اس نے جلدی سے دو کھجوریں اٹھا کر منہ میں ڈال لی تھیں۔

"صرف آدھا کلو، میں نے کل بیس کلو کھجی لی ہے۔"

"کھجی"(کچی کھجور) بیس کلو کھجی۔

یا اللہ یہ کیا کہہ رہی ہے اس دفعہ خود ترسی کے بجائے اسے غصہ آیا تھا۔

"بیس کلو کھجور کا کرے گی کیا یہ عورت۔"

اس کے گھر میں گھستے ہی سامنے ہی واقعی کھجوروں کے تھال بھرے نظر آئے تھے۔

"آؤ کھجی کھاؤ۔"

اس نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور واپس کھینچ لیا تھا وہ گھن گئی، بے کار کھجوریں تھیں جو اندر سے گلی ہوئی تھیں ایک دفعہ اس نے مالٹے پیش کیے تھے جو ایک بڑے ڈھیر کی صورت پڑے تھے مگر اندر سے ختم ہو چکے تھے پھانک نہیں تھی ایسے خراب مالٹے جو دو کا ندار ایک طرف کر لیتے ہیں اور پھر پھینک دیتے یا پھر چپ چپا کر کسی کے شاپر میں ڈال دیتے ہیں۔ چھ سو روپے میں سارے کا سارا مل جاتا ہے۔

"کھاؤ رج کے کھاؤ ایک آدھ کھجی ہم نہیں کھاتے۔"

مگر ان میں سے ایک بھی کھجور عالیہ کے حلق سے نہیں اتری۔ کھجور کے نام پر مذاق مگر اس نے ایسا نہیں کہا۔

"ہم اس طرح کا فروٹ نہیں کھاتے۔"

بلکہ خاموشی اختیار کر لی تھی۔

"کل تم نے اپنے کمبل نکال رکھے تھے کیوں۔"

"سردیاں آنے والی ہیں سوچا ایک بار پھر دھو کر فریش کر لوں۔"

"تم مجھے بھجوا دو میں دھودوں گی بڑا اب ہے میرا۔ تمہیں بخار ہو جاتا ہے ناں اتنی سردی میں تو۔"

"اچھا میں کل بھیج دوں گی۔"

اب اتنی بھی بری نہیں کچھ اچھائیاں کچھ برائیاں۔

"ہاں ہاں بھیج دینا۔ ساتھ دو کلو جھینگا والا سرف وہ اشتہار والا اور پانچ سو روپے میں لوں گی۔"

"کیا؟ عالیہ کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا یہ دوستی ہے۔

☆☆☆

سلطانہ باجی نے آکر بتایا تھا کہ فری ہمسایوں اور اردگرد کے لوگوں سے کہتی پھر رہی ہے کہ عالیہ اور عدنان تو بچت کرتے ہی نہیں ہیں۔ کھاپی جاتے ہیں بندے کو اچھے برے وقت کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے مگر انہیں تو عقل ہی نہیں۔ عالیہ نے سر پکڑ لیا تھا۔

"یہ بڑے بدفطرت لوگ ہیں عالیہ امی نے تو پہلے ہی کہا تھا ان کی لگائی بجھائی کی وجہ سے ہی کوئی ان سے بات نہیں کرتا، کھا بھی گئے اور ڈیل بھی کر رہے ہیں سردار بھائی اور فری کی چغلیاں تو پورے علاقے میں مشہور ہیں۔"

شکر ہے کہ میں نے اسے گھر کی کوئی بات نہیں بتائی ورنہ وہ عورت نجانے کیسے کیسے بدنام کرتی مجھے اس کے کھٹارویے نے بچا لیا تھا اسے اس بچے ہوئے سالن اور چاول کے بدلے بھی کچھ ہاتھ آیا تھا اور ہاں بے سکونی بھی۔ وہ واقعی اعتبار کے قابل نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ عالیہ اور عدنان کی سمجھ میں بھی آرہا تھا۔

سردار بھائی نے موبائل شاپ سے پندرہ سو والا موبائل لیا اور عدنان سے کہنے لگے کہ "تم ادائیگی کر دو میں بعد واپس کر دوں گا۔"

عدنان نے پیسے دے دیے تھے جب واپس مانگے تب وہ کہنے لگے۔

"وہ تو تمہاری طرف سے تحفہ ہے میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔" عالیہ نے بڑی مشکل سے انہیں بددعا کو دعا کا رنگ دینے سے روک لیا تھا۔

چار مرلے کا تنگ سا گھر تھا چیتائی مٹی کی تھی)۔

یہ بات اسے عدنان نے بتائی تھی۔ محلے والے کہتے تھے ان کی دوستی سے کسی کو کچھ نہیں ملتا اور یہ سچ تھا

اور پھر اس نے سالن دینا بند کیا اور پھر فری کسی بات پر شوہر سے ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی۔

سردار بھائی کی روٹیاں پکا پکا کر عالیہ تھک چکی تھی۔ سردار بھائی کے کہنے پر عالیہ اور عدنان فری کو منانے گئے تھے۔ فری کی امی آگے سے پھٹ پڑی تھیں۔ نجانے کب کا غبار تھا فری باجی کا چہرہ آنسوؤں کی رگڑ سے لال ہو گیا۔ "چھ چھ مہینے گھر میں گوشت نہیں پکتا۔ قسم اٹھا کر کہہ دے جو کبھی پاؤ گوشت بھی لایا ہو۔

بچوں کو خرچا نہیں دیا ہے، کبھی ایک روپیہ میری بیٹی کے ہاتھ پر نہیں رکھا یہ بے چاری چھپ چھپ کر چھوٹی موٹی مزدوریاں کرتی ہے کسی کی ہنڈی چمن لی، کسی کا کپڑا گھر لا کر دھو دیا۔ کون سا سکھ دیا ہے اس نے، فری کے منہ پر تھپڑ اس نے مارے ہیں یہ تو ہمارا حوصلہ ہے جو اسے چار مرلے کے خالی پلاٹ پر مکان کھڑا کر دیا، ساری زندگی نہ اسے باپ نے جائیداد سے حصہ دیا نہ گھر میں گھسنے دیا۔ یہ میری بیٹی کا منہ ہے جو آج دو کمروں کے مکان میں بیٹھا ہے، آگے سے فرمائشیں کرتا ہے کہ لینٹر ڈال کر دو، سردار تیری قبر پر لینٹر ڈالوں گی میں۔"

فری کی امی فری سے کہیں صاف بولتی تھیں۔

"تم اور تمہاری دوستی چار دن کی ہے تم نے اسے دیکھا ہی کیا ہے۔ بچے اس کے چٹنی سے روٹی کھاتے ہیں وہ بھی سوکھی روٹیاں ایک کلو مہینے کا گھی لے کر دیتا ہے اسے۔"

عالیہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

"اس جیسا ذلیل شخص ہم نے نہیں دیکھا بھی کھانا پکا، نہ دانے، آٹا میں کہاں تک دوں کہاں تک اسے بھائی دیں گے، سارا خرچا بیٹا ہمارے سر پر ہے کبھی تمہارے گھر سے بچا ہوا سالن لے جاتی ہے بس وہی ملتا ہے میری بیٹی کو۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے بوڑھے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

☆☆☆

ادھر سردار بھائی کی بھی بری حالت تھی۔ ان کے چھوٹے بھائیوں نے کسی چغلی کی وجہ سے مار مار کر انہیں ادھ موا کر ڈالا تھا۔ انہیں موبائل میں باتیں ریکارڈ کرنے کا بھی مرض تھا۔

"سگے بھائی کی شادی تھی اس کے کپڑے ہم نے سیل سے دلوائے۔ بچوں کو کپڑے ہم لے کر دیں اور یہ پیسے صرف اپنے اکاؤنٹ میں رکھ رہا ہے۔"

پچیس ہزار تنخواہ ہے پچیس سو میں خاندان پال رہا ہے اللہ کرے یہ مر جائے تاکہ ہم بھی سکون میں آ جائیں۔ کیا کرے گا اس ایک لاکھ بیس ہزار کا اس مردود کو تو موت بھی نہیں آتی۔"

سردار بھائی کی امی کے آنسو بھی فری کی امی جیسے ہی تھے۔

"بس بیٹا یہ ہمارا اور کیا کہہ سکتے ہیں سالوں گزر گئے نہ بہو نے سسر سے بات کی نہ سسر نے بہو سے بات کی ہے، یہ سردار جہنمی اپنے باپ پر بھی شک کرتا ہے۔"

سیاہ عبایا کا کونا تھام کر بیٹھی عالیہ کو چکر آ گیا تھا۔ لوگ کیسے کیسے نقاب اوڑھ کر پھرتے ہیں ان کا فیصلہ جو بھی ہو ایک فیصلہ تو عالیہ نے بھی بیٹھے بیٹھے کر لیا تھا۔ اپنی اچھی خاصی خوش حال زندگی کو یوں کسی "کمی" کے کہنے میں آ کر میں کیوں برباد کروں۔

"عدنان! آپ پریشان مت ہوں۔ جیسے پہلے ہم گھر کا کام کروا رہے ہیں آہستہ آہستہ کرواتے رہیں گے جب ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو کوئی دوسرا کیوں باتیں کرتا پھرے۔"

"اچھا سنو عالیہ! "کمی" کھاؤ گی۔"

"نہ رہنے دیں اب کمی کو پہلے ہی اچھا سبق دیا ہے اس نے ہمیں۔"

اب کے عدنان کا قہقہہ بالکل اصلی تھا ویسا ہی جیسے "کمی" کی آمد سے پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔

☆☆

مکمل ناول

نمرہ احمد

نمل

بارھویں قسط

"سر آپ مجھے دو منٹ دیں گے؟ میں آپ کی کافی دوبارہ بھجواتی ہوں۔" رسما مسکرا کے انہیں کہا۔ ساتھ ہی آنکھوں سے لالک کو اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے وہ کپ اٹھالیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔

"ایویں نخرے کر رہا ہے۔ یہ باہر سے آئے

لوگ یہاں آکے زیادہ نخرے شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے اوٹ ملک سے ہی کافی بنائی تھی۔" کچن میں آکے لالک خفگی سے شروع ہو گیا۔ اس آدمی کے انگریزی لب و لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ برطانیہ سے آیا ہے یا کافی عرصہ وہاں رہا ہے۔

مالا نے ایک نظر چھت کو دیکھا۔ پھر فریج کے دروازے کو۔ یہاں کیمرہ نہیں لگا تھا۔ یہ سی سی ٹی وی کا بلائنڈ سپاٹ تھا۔ کچھ دن پہلے فریج یہاں موو کیا گیا تھا۔ کسی نہ کسی وجہ سے کیمرہ لگنا رہ جاتا تھا۔

"تم نے اوٹ ملک ڈالا تھا؟" اس کی آنکھوں میں دیکھ کے سختی سے پوچھا۔

"قسم لے لیں میں نے ڈالا تھا۔"

"اس کا خالی ڈبا کہاں ہے؟"

"ڈبا؟" وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"اس دن میری سالگرہ پہ سب پیزا کھا رہے تھے سوائے تمہارے۔ تم نے کہا تمہیں پیزا پسند نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے لالک تم خود لیکٹوز انٹولرنٹ ہو۔ اور تم کسٹمرز کی کافی میں عام دودھ ڈالتے ہو اور اوٹ ملک اور کوکونٹ ملک کے کارٹن چھپا کے گھر لے جاتے ہو یا اپنی کافی میں استعمال کرتے ہو۔"

"نن نہیں میم....."

"ظہیر یہ دودھ بہت مہنگے امپورٹ کرواتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو ان کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ تمہارے پاس امانت ہوتے ہیں۔ اور تم نے مجھے ایک کسٹمر کے سامنے شرمندہ کروایا ہے۔ فی الحال میں اس معاملے کو فکس کر رہی ہوں۔ اس کے بعد تم میرے آفس میں آؤ گے۔ اور ہم اس بارے میں بات کریں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئی تو اس کے ساتھ لالک سر جھکائے کافی کا تازہ کپ پکڑے ہوئے تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے آئے۔ اس نے کپ میز پہ رکھا تو مالا نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

سفید بالوں والے آدمی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جیسے برف ہو۔

"میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ میرے باریسٹا کی غلطی تھی۔ اب آپ کو شکایت نہیں ہوگی سر۔"

"آپ نے اپنے باریسٹا کو برطرف نہیں کیا؟" انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔" مالا کا لہجہ مطمئن تھا۔

عبدالمالک فرید نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"اس نے میرا بہت قیمتی وقت برباد کیا ہے۔ آپ کو اسے برطرف کر دینا چاہیے تھا۔"

"نہیں سر۔ ذرا سا لیکٹوز آپ کا کچھ خاص نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن اس کی برطرفی اس کی زندگی خراب کر سکتی ہے۔ نوکری کا چلے جانا کسی کی بھی زندگی خراب کر سکتا ہے۔ میں آپ کی شیلوا لیکو کی وجہ سے ایک غریب کو برطرف نہیں کر سکتی۔"

"شیلوا لیکو" وہ مسکرائے۔ جیسے اس کی بات دلچسپ لگی ہو۔

"جی۔ لیکن غلطی ہماری ہے اور میں اس غلطی کا مداوا کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" وہ مسکرا رہے تھے البتہ آنکھیں برف تھیں۔

کشمالہ مبین نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔

"کوئی دوسرا کسٹمر ہوتا تو میں اس کو ڈسکاؤنٹ واؤچر دے دیتی اور کافی کا بل نہ لیتی۔ لیکن آپ کو اس سب کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے شکایت ذرا سے پیسے بچانے کے لیے نہیں کی۔ نہ آپ کو لیکٹوز سے اتنا فرق پڑتا ہوگا کیونکہ پاکستان میں بہت کم جگہوں پہ اوٹ ملک دستیاب ہوتا ہے۔ آپ کو اکثر جگہوں پہ ڈیری والی

کافی چینی پڑتی ہوگی۔" وہ مسکرائی۔ وہ اسی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"پھر میں نے شکایت کیوں کی؟"

"کیونکہ آپ کی بات نہ مان کے آپ کی توہین کی گئی تھی۔ میں اس توہین کا مداوا کرنے کے لیے آپ کی کافی خود بنا کے لائی ہوں۔ اور میں کسی کے لیے کافی نہیں بنایا کرتی۔ ایک دفعہ پھر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔" بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔

ان کے بر فیلے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اور پھر معدوم ہوگئی۔ وہ اپنی میز کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ ایک اچھی مینیجر ہیں۔ لیکن...." انہوں نے دو انگلیوں سے کپ کو ہینڈل سے اٹھایا۔ پھر ایک گھونٹ بھرا۔

"لیکن؟" وہ برآمدے کے اسٹیپ پہ تھی۔ پلٹ کے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"لیکن آپ کو اپنے سانس پہ کنٹرول نہیں ہے۔"

"سوری سر؟" وہ بوگن ویلیا کے درخت کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے سر کے اوپر گلابی ٹہنیاں لٹک رہی تھیں۔

"جانتی ہیں خوشی یا خوف میں سب سے پہلے کیا خراب ہوتا ہے؟" ان کی نگاہیں اپنے کپ پہ ٹکی تھیں۔

"کیا؟"

"سانس۔"

اسی پل سورج کے سامنے سے بادل ہٹے۔ دھوپ نے بوگن ویلیا کی ٹہنیوں کے درمیان سے راستہ بنایا اور برآمدے کے فرش پہ اپنی چند شعاعیں پھینکیں۔

"اگر انسان اپنے سانس کو قابو کرنا سیکھ لے تو وہ اپنا ذہن قابو کر سکتا ہے۔ ذہن قابو کر لے تو وہ ہر قسم کے حالات کو قابو کر سکتا ہے۔ سب کچھ سانس سے شروع اور سانس پہ ختم ہوتا ہے۔" وہ اب سامنے دیکھتے ہوئے کافی کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ جیسے خود سے بات کر رہے ہوں۔

مالا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور پلٹ کے نیچے اتر گئی۔ اب اس کا وجود دھوپ میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندر ہال میں عباس کے ساتھ کھڑی تھی۔ شیشے کی دیوار کے پار برآمدہ دکھائی دے رہا تھا جہاں سفید بالوں والا شخص بیٹھا کافی پیتے ہوئے موبائل دیکھ رہا تھا۔

"یہ آدمی کون ہے؟" اس کی مشکوک نظریں ان پہ جمی تھیں۔

"بس اتنا معلوم ہے کہ لندن سے آیا ہے۔ الو یسٹنٹ مینیجر ہیں۔ مختلف ریستورانوں کا دورہ کر رہا ہے۔ اسے غالباً اپنے لیے ایک ریستوران خریدنا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ اگر اسے ریستوران خریدنا ہے تو یہ یاوشن میں کیا کر رہا ہے؟"

پہلو میں گری اس کی مٹھی بھنچ گئی۔ نظریں اٹھا کے سیڑھیوں کی طرف دیکھا جہاں اوپر کہیں کشمیر کا آفس تھا۔ سانس پھر سے چڑھنے لگا تھا۔

اسی پل فون بجنے لگا۔ غیر شناسا نمبر۔ بالآخر۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

"جی جی..... میں کشمالہ ہوں۔ آپ نے کال ہی نہیں کی۔" چھوٹتے ہی بے چینی سے پوچھا۔ "آپ کے شوہر کی طبیعت کیسی ہے؟"

"طبیعت؟" وہ عورت روتے ہوئے چلائی۔ "وہ مر گیا ہے۔ تم نے میرا بندہ مار دیا ہے۔"

لمحے بھر کے لیے ساری دنیا تھم گئی۔ اس کو لگا اس کا سانس جیسے بند ہو گیا ہے۔

☆☆☆

قاسم فرید کے آفس میں اس وقت تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ ایک سرد سا تناؤ جو وہاں بیٹھے دونوں

فریقین کے درمیان حائل تھا۔ جو نظر نہیں آتا تھا
لیکن گھٹن پیدا کر رہا تھا۔
کمرے میں رکھے اس کے باپ کے پودے
عدم توجہی کے باعث سوکھ چکے تھے۔ کمرے میں
عود کی خوشبو پھیلی تھی جس میں سگار کی مہک بھی
شامل تھی۔
"مجھے بلانے کے لیے شکریہ ماہر۔"
کوٹ ٹائی میں ملبوس شمس اس وقت ماہر کے
سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ
تھی۔ وہ البتہ نہیں مسکرا رہا تھا۔ بس پتلیاں
سکوڑے اس کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کو اندر تک
پڑھ رہا ہو۔
"ماں نے بتایا کہ تم ہلال اور ماں کے ساتھ
پاکستان شفٹ ہونا چاہتے ہو۔"
شمس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
"تم جانتے ہو میری جاب چلی گئی ہے۔
پاکستان میں میرے کزن نے ایک جاب آفر کی
ہے۔ وہاں میری فیملی ہے۔ ان کے پاس چلا
جاؤں گا۔ ہلال اور رابیل بھی وہیں رہیں گی جہاں
میں رہوں گا۔" اس کی چھوٹی چھوٹی چمک دار
آنکھیں ماہر پہ جمی تھیں۔
اس نے بہت کچھ حلق سے نیچے اتارا۔ اسے
ضبط کرنا تھا۔ ہلال کے لیے۔ ماں کے لیے۔
"ہاں اگر مجھے یہاں کوئی اچھی جاب مل
جاتی تو شاید میں نہ جاتا۔" اس نے شیو
کھجائی۔ ماہر نے ایک نظر دیوار گیر بک شیلف کو
دیکھا جہاں بہت سی کتابیں، فریم اور شیلڈز رکھی
تھیں۔ ان میں ایک تصویر اس کے باپ کی بھی
تھی۔ وہ ان کے پیچھے کھڑا ان کے کندھے پہ
ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ وہ دونوں کیمرے میں دیکھ
کے مسکرا رہے تھے۔ اس نے واپس شمس کو
دیکھا۔ اس کے باپ کے باڈی گارڈ کی نوکری
سے شروع ہونے والا شمس الدین آج انہی کے
آفس میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"اگر تمہیں یہیں کہیں جاب مل جائے تو
نہیں جاؤ گے؟" اس نے دراز کھولا اور ایک باکس
نکالا۔
"ہاں۔ اگر تمہارے آس پاس کوئی جاب ہو
تو میں یہیں رہ جاؤں گا۔"
"جاب بنائی جا سکتی ہے۔" ماہر نے باکس
سے ایک سگار نکالا۔ پھر میز پہ رکھا چاقو اٹھایا۔
"تمہارا شکریہ۔ میرے لیے اتنا سوچنے
کا۔"
"سوال یہ ہے کہ..." وہ چاقو سے سگار
کاٹنے لگا۔ "کیا تم میری بنائی گئی جاب قبول
کر لو گے؟" شمس کی نظریں اس کے ہاتھوں پہ جمی
تھیں جو مہارت سے سگار کو چھیل رہے تھے۔
"شیور۔ کس قسم کی جاب ہے؟"
"فنانس ڈیپارٹمنٹ میں۔ ایک بہت اچھی
سیلری اور انشورنسز کے ساتھ۔" اس نے سگار
انگلیوں میں دبایا اور لائٹر اٹھایا۔
"بہترین۔" شمس کی مسکراہٹ گہری
ہوئی۔ آنکھیں چمکیں۔ بالآخر وہ قاسم فرید کی کمپنی
میں داخل ہونے جا رہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ کل صبح اس آدمی سے مل لو۔ یہ
تمہیں ہائر کر لے گا۔"
اس نے ایک کارڈ شمس کی طرف
بڑھایا۔ شمس نے مسکرا کے کارڈ اٹھایا۔ اگلے ہی
لمحے اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چونک کے
ماہر کو دیکھا۔ وہ ٹیک لگائے بیٹھا سگار سلگا رہا تھا۔
"لیکن ماہر... یہ تمہاری کمپنی تو نہیں
ہے۔"
"میری کمپنی درمیان میں کہاں سے آ گئی؟
تمہیں سے نیگر میں جاب چاہیے تھی نا۔ میرے
آس پاس۔" اس کی آنکھوں میں دیکھ کے وہ پہلی
دفعہ مسکرایا۔ "ان کا آفس ہمارے قریب ہی
ہے۔ پانچ منٹ کی واک پہ۔"
شمس کی مسکراہٹ اب غائب ہو چکی

تھی۔ چند لمحے کے لیے اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا
کرے۔
"مجھے لگا...."
"تمہیں لگا کہ میں تمہیں اس کمپنی میں کام
کرنے دوں گا جہاں ایک زمانے میں تم میرے
باپ کی کار کا دروازہ کھولتے تھے۔ چچ چچ۔ تم مجھے
ٹھیک سے سمجھ نہیں ہو شمس۔" افسوس سے سر
دائیں بائیں ہلایا۔ پھر سگار کا کش بھرا۔ بہت سا
دھواں لبوں سے نکلا۔ اس نے سگار جھٹکا اور آگے
کو جھک کے شمس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی
رنگت پھیکی پڑ چکی تھی۔
"ماہر فرید کو کوئی ایموشنلی بلیک میل نہیں
کر سکتا۔ میں نے ہلال سے وعدہ کیا تھا تمہیں
اپنے قریب جاب دلوانے کا۔ اپنا وعدہ پورا کر رہا
ہوں۔ چاہو تو میری آفر قبول کرو۔ چاہو تو ماں اور
ہلال کو لے کر پاکستان شفٹ ہو جاؤ۔ تمہاری
مرضی۔" اس نے واپس ٹیک لگالی۔
شمس پھیکا سا مسکرایا۔
"مجھے منظور ہے۔ کم از کم میں تمہارے
قریب رہوں گا۔" پھر کرسی پہ رکھا ایک باکس اٹھایا
جو وہ ساتھ لایا تھا۔
"تم مجھے پسند نہیں کرتے لیکن بہرحال میں
تمہارے آفس کے لیے ایک تحفہ لایا تھا۔ اس کو
اپنے آفس میں جگہ دو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔"
اس نے باکس کا ڈھکن اٹھایا تو ماہر نے عدم
دلچسپی سے دیکھا۔ وہ ایک شطرنج کے گھوڑے کی
شکل کا بک ہولڈر تھا۔
"ہوں۔ شکریہ۔" بے دلی سے کہا اور سگار
ہونٹوں سے لگایا۔
"ہلال نے اسے پسند کیا ہے۔ اس کا کہنا
ہے کہ یہ تمہارے بک شیلف میں اچھا رہے گا۔ کیا
میں اسے یہاں رکھ دوں۔"
اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔ ماہر نے کچھ
کہنے کے لیے لب کھولے پھر اثبات میں سر
ہلا دیا۔
"شیور۔" وہ ہلال کی پسند تھا۔ اور اگر نہ
ہوتا.... تب بھی ایک گھوڑا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟

☆☆☆

وہ اپنے آفس میں کھڑی تھی۔ میز۔ اپنے
سامنے اس نے چند چیزیں اکٹھی کر رکھی تھیں۔
فائلز۔ ڈاکومنٹس۔ ایک پودا۔ چند فریمز۔
"مجھے ایک ایسا باکس لا کر دو جس میں یہ
سب پورا آجائے۔" حیران سی کھڑی اپنی
اسسٹنٹ صاعقہ کو حکم دیا۔ وہ سر ہلا کے باکس
ڈھونڈنے چلی گئی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مالا
میڈم صبح ہی صبح اپنا سامان کیوں اکٹھا کرنے لگ
گئی ہیں۔
موبائل بجنے لگا تو مالا نے گہری سانس لینی
چاہی لیکن تنفس پھر سے بے ترتیب ہونے لگا۔ وہ
عورت باہر آچکی تھی۔ اسے ایک مشکل ملاقات
کرنی تھی۔ اس نے دیوار پہ لگے آئینے میں ایک
دفعہ خود کو دیکھا۔ ماتھے پہ کٹے بال۔ اونچی کس کے
بنائی پونی۔ کان، گردن اور ہاتھ کسی قسم کے زیور
سے بے نیاز تھے۔ چہرے کی سرخ گلابی اسکنی
چمک رہی تھی۔ پیروں میں ہائی ہیلز تھیں۔
وہ باہر آئی تو مین ہال میں بجتا میوزک ایک
دم بدلا۔ ہپی برتھ ڈے ٹو یو کی دھن سنائی دینے
لگی۔ وہ چونکی۔ کونے میں کمپیوٹر پہ بیٹھا آپریٹر کی
بورڈ پہ جھکا تھا۔ مالا کے ماتھے پہ بل پڑے۔ تیزی
سے اس کی طرف لپکی۔
"مجھے یہ میوزک اب نہ سنائی دے۔" اس
کے سر پہ پہنچ کے وہ ایک دم غرائی۔ وہ گڑبڑا گیا۔
"سوری میم۔ میں پلے لسٹ چیک کر رہا
تھا۔ اس دن آپ کی سالگرہ پہ یہ لگایا تھا تو خود ہی
پلے ہو گیا۔"
"کہا نا۔ یہ میوزک مجھے اس ریسٹوران میں
نہ سنائی دے۔ کچھ اور لگالو۔" بے اختیار اپنے
ہاتھ دیکھے۔ آج وہ سرخ نہیں تھے۔ اس نے گہری

Scanned with CamScanner

سانس خارج کی۔
آج بھی برآمدے کے کونے والی میز پہ وہی صاحب بیٹھے تھے۔ لیپ ٹاپ سامنے رکھے وہ اس پہ کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سے نگاہ ملائے بغیر آگے آئی۔ برآمدے کے اسٹیپ اتر کے نیچے آئی تو دیکھا۔ اس کی میز پہ سیاہ چادر میں وہی عورت بیٹھی تھی۔ مالا کو دیکھ کے وہ کھڑی نہیں ہوئی۔ بس اسے گھورے گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
"عاصمہ بی۔ ہم اندر میرے آفس میں چل کے بات کرتے ہیں۔" وہ نرمی سے کہتی اس کے قریب آئی۔
"مجھے اندر نہیں جانا۔ یہیں سب کے سامنے بات کرنی ہے۔" وہ ایک دم پھنکاری۔
مالا نے گردن موڑ کے دیکھا۔ سوائے سفید بالوں والے آدمی کے قریب میں کوئی نہ تھا۔ اس نے کرسی کھینچی۔
"ٹھیک ہے لیکن آرام سے بات کریں۔" نرمی سے تنبیہہ کر کے وہ ان کے سامنے بیٹھی اور ٹانگ پہ ٹانگ جما لی۔
"میں اس واقعے کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔"
عورت نے اس کی معذرت کو نظرانداز کر کے نگاہیں گھما کے اطراف میں دیکھا۔
"تم تو کہہ رہی تھی تمہارے آفس میں آگ لگ گئی تھی۔ کدھر ہے آگ؟"
کشمالہ نے ناک کے ذریعے سانس اندر کھینچی۔ پھر دھیرے سے خارج کی۔ تنفس قدرے بہتر ہوا۔
"میں بہت شرمندہ ہوں۔ آئی ایم سو سوری۔ میں ہر قسم کا مداوا کرنے پہ تیار ہوں۔"
"اب کیسا مداوا بی بی؟ تم نے میرا بندہ مار دیا ہے۔" وہ روتے ہوئے غصے سے بولی۔
بوگن ویلیا کے پھولوں میں ہوا سے سرسراہٹ ہوئی۔ پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ عبدالمالک فرید نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں اٹھا کے اس طرف دیکھا جہاں درخت کی چھاؤں میں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ پھر انہوں نے واپس نگاہیں جھکا دیں۔
"عاصمہ بی..."
"اس کا خون بہت بہہ گیا تھا۔ کوئی اسے ہسپتال لے جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ہم ہسپتال پہنچے۔ وہاں جاتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ تم بڑے لوگ گاڑی چلاتے دائیں بائیں کیوں نہیں دیکھتے؟" اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور آواز کپکپا رہی تھی۔
کشمالہ مبین نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ پھر اسے دھیرے سے خارج کیا۔ اب اس کا سانس نہیں چڑھ رہا تھا۔
"وہ کراسنگ نہیں تھی۔ وہ اچانک سے میرے سامنے آیا تھا۔ غالباً وہ خودکشی کرنے جا رہا تھا کیونکہ آپ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے روک رہی تھیں۔ ٹیکنیکلی یہ میری غلطی نہیں تھی۔"
"یہ بات پولیس کے سامنے کہنا یا عدالت میں۔" وہ دبا دبا سا غرائی۔
"اگر آپ نے پولیس کے پاس جانا ہوتا تو آپ وہاں جاتیں۔ یہاں نہ آتیں۔ چاہیں تو مجھے لے جائیں پولیس کے سامنے۔ میں ڈرتی نہیں ہوں۔" وہ ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے پرسکون سی بیٹھی تھی۔ "لیکن میں پھر بھی آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے اس کو خود ہسپتال لے جانا چاہیے تھا۔ انسانی جان ہر قسم کے کام سے اوپر ہوتی ہے۔" چہرہ اٹھا کے ریستوران کی عمارت کو ایک نظر دیکھا۔
"اب میں کیا کروں گی۔ وہ میرے بچوں کا واحد سہارا تھا۔ اس کی تنخواہ کے بغیر ہمارا گزارا کیسے ہوگا؟"
"میں کہہ رہی ہوں نا میں آپ لوگوں کا

خیال رکھوں گی۔ یہ کچھ رقم ہے۔" اس نے پرس سے ایک چیک نکالا اور ان کے سامنے رکھا۔

"یہ رکھ لیں۔ دوبارہ بھی چاہیے ہوں تو میرا پتا آپ کو معلوم ہے۔ میں آپ کو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤں گی۔" وہ اسی نرمی سے کہہ رہی تھی۔ دھوپ سے اس کی آنکھیں سنہری لگ رہی تھیں۔

وہ عورت چیک چادر میں دبائے وہاں سے اٹھ کے چلی گئی۔ تو اس نے آنکھیں بند کیں۔ سانس ناک سے کھینچی۔ اندر تک اس کو روک دیا۔ پھر ایک دو تین چار پانچ گنا۔ پھر اس کو لبوں سے خارج کر دیا۔ بہت سا بوجھ سینے سے ہٹ گیا۔

"وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کا شوہر نہیں مرا۔"

وہ لیپ ٹاپ پہ نظریں جمائے بولے تو مالا نے چونک کے انہیں دیکھا۔ پھر اداسی سے مسکرائی اور اٹھ کے برآمدے تک آئی۔

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"اس کی آواز' آنکھیں' سب بتا رہی تھیں کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اداکاری کر رہی ہے۔"

انہوں نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ان کا چہرہ آج بھی برف جیسا تھا۔

"جانتی ہوں۔" اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ "جب اس نے مجھے کال کی تو میں نے اس کے نمبر سے اس کے گھر کا ایڈریس نکلوالیا۔ میری اسسٹنٹ اس کے محلے میں جا کے چیک بھی کر آئی تھی۔ اس کے شوہر کا زخم گہرا نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا ہوتا تو وہ مجھے اپنے گھر بلاتی۔ یہاں نہ آتی۔"

"پھر آپ نے اسے پیسے کیوں دیے؟"

"کیونکہ غلطی میری ہی تھی اور میں اپنی غلطیوں کی ذمہ داری لیا کرتی ہوں۔" اس کا انداز سادہ تھا۔ "مجھے اس کو خود ہسپتال لے جانا چاہیے تھا لیکن میں نہیں لے کر گئی۔ مجھے یہ ریسٹوران زیادہ عزیز تھا۔ اور سنا ہے آپ اس کو خریدنے کی بات کر رہے ہیں۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"کیا اس ریسٹوران کو بک نہیں جانا چاہیے؟ یہاں رش نہیں ہوتا۔"

"پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"کیونکہ یہاں رش نہیں ہوتا۔" انہوں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں میں سکون سے اپنا کام کر سکتا ہوں۔"

"یہ ریسٹوران فار سیل نہیں ہے۔ آپ کہیں اور جا کے ونڈو شاپنگ کریں سر۔" مسکرا کے سرد لہجے میں کہا اور واپس اپنی میز کی طرف چلی گئی۔ اپنا لیپ ٹاپ کھولا تو دھوپ سے چمکتی اسکرین میں اپنا چہرہ دکھائی دیا جس پہ زمانے بھر کی خفگی تھی۔ اور اضطراب بھی۔

(اگر اس آدمی نے اوشن خرید لیا تو؟) وہ عدم توجہی سے کام کر رہی تھی۔ ذہن بہت سے مسئلوں میں الجھا تھا جب سلور بالوں والے آدمی کی میز سے آتی آوازوں نے اسے چونکایا۔

"اس ریسٹوران میں کیا برائی ہے؟" وہ اسی سپاٹ انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ان کی میز پہ کوئی اور بھی آ کے بیٹھ چکا تھا۔

"مجھے یہاں کام نہیں کرنا۔" جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اور مجھے تم لوگوں کے مشورے بھی نہیں چاہئیں۔ مجھے معلوم ہے مجھے کیا کرنا ہے۔ اور کہاں کرنا ہے۔" کہاں پہ زور دے کر بولا۔

"اس ریسٹوران میں کیا برائی ہے؟" انہوں نے تحمل سے سوال دہرایا۔ کشمالہ بیگم کے ماتھے پہ بل پڑے۔ کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے ریسٹوران میں کیا برائی تھی؟ ذرا وہ بھی تو سنے۔

"تم دونوں روبوٹس جان بوجھ کے میرے ساتھ یہ کر رہے ہو۔ تم لوگ میرے اوپر بھروسا ہی نہیں کرتے۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں پیسے ڈبو دوں گا۔"

"مجھے لگتا نہیں ہے۔ یقین ہے۔"

مالا نے گردن ترچھی کر کے دیکھا۔

اس کے سامنے ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کے گھنگھریالے بال پونی میں بندھے تھے۔ کان میں بالی۔ کلائیوں میں بہت سے بینڈز، انگلیوں میں سلور انگوٹھیاں۔ گھٹنوں سے پھٹی جینز اور اوپر جیکٹ۔ یہاں سے اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔

(ہوں۔ درست لگتا ہے۔) اس نے گردن واپس موڑی اور لیپ ٹاپ پہ جھکی۔

"یار پلیز میری بات سمجھو۔ مجھے تمہارے ساتھ ہر روز ایک نئے ریستوران کا دورہ نہیں کرنا۔ مجھے کچھ اور بنانا ہے۔"

"کیا؟"

"بیکری۔ ایک بوتیک بیکری۔"

"بیکری کا کیا فائدہ؟" انہوں نے ناک سے مکھی اڑائی۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی ان کی گفتگو سنتے ہوئے ٹائپ کر رہی تھی۔

"کیونکہ بیکری میں کیکس بنتے ہیں اور کیک کے گرد ساری دنیا گھومتی ہے۔ کیکس خاندان کو جوڑتے ہیں۔ یہ اپنے آگے پیچھے ہر ایک کو اکٹھا کر لیتے ہیں۔ یہ ہر تہوار، ہر موقعے کی ضرورت ہیں۔ مجھے کیکس بنانے ہیں یار۔ مجھے کیکس بنانے دو۔"

"بیکری۔" اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ ایک خیال ذہن کے پردے پہ لہرایا۔ پھر اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور پچھلی گلی کی طرف بڑھ گئی جہاں سے ایک بیرونی زینہ اوپر آفس تک جاتا تھا۔

آفس ٹیبل پہ ایک سرمئی رنگ کا باکس رکھا تھا جس میں اس کی تمام چیزیں پوری آچکی تھیں۔ ننھا سا پودا سب سے اوپر رکھا تھا۔

اس نے ایک لفافے میں بند استعفیٰ پودے کے ساتھ رکھا اور مسکرا کے گہرا سانس لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

شمس ایئر فونز کانوں میں لگائے سڑک کنارے چلتا جا رہا تھا۔ چہرے پہ جھنجھلاہٹ تھی اور سردی سے ناک سرخ پڑ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں کے اندر تھے۔

"ایک سال سے انتظار کر رہا ہوں سرکار۔ اور کتنا انتظار کروں؟"

دوسری طرف ثمینہ بیگم کی ہنسی گونجی۔

"تمہارا لالچ اور بے صبری۔ چچ۔"

"اس نے مجھے کمپنی میں گھسنے تک نہیں دیا۔ اس کی آفر نہ مانتا تو بیوی کے سامنے برا بنتا۔" وہ بری طرح سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"تم اس کمپنی میں ضرور گھسو گے اور ایک دن اس کے مالک بنو گے۔ طاقت ور عمل شروع ہونے میں وقت لیتا ہے۔"

"ایک سال سے آپ وقت ہی لے رہی ہیں۔ عمل کب شروع ہوگا؟"

"عمل تو شروع ہو چکا۔ کیا تم نے وہ پتھر کا گھوڑا اس کے آفس میں رکھ دیا تھا۔"

"جی۔ ایسی جگہ پہ رکھا ہے کہ دن میں کئی دفعہ اس کی نگاہ پڑے۔" وہ قدرے ٹھنڈا ہوا۔ "لیکن اس سے کیا ہوگا؟ میری بھیجی گئی کھانے کی چیزیں وہ بھی نہیں کھاتا کہ میں نے زہر نہ ملا دیا ہو۔"

"سارے جادو کھانے کی چیزوں میں نہیں ہوتے۔ اصل جادو آنکھ سے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔"

وہ کہہ رہی تھیں اور وہ شمس بڑی عقیدت سے سن رہا تھا۔

☆☆☆

(اصل جادو آنکھ سے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔)

کانفرنس روم کی دیوار پہ لگی بڑی اسکرین اس وقت روشن تھی۔ اس پہ کچھ امیج ابھر رہے تھے۔ طویل

میز کے گرد قطاروں میں لگی کرسیوں پہ بیٹھے افراد انہماک سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ نوٹس لے رہے تھے۔ کچھ محض سر ہلاتے ہوئے ماہر کو سن رہے تھے۔

وہ سربراہی کرسی پہ بیٹھا جھک کے ایک پین سے اسکرین پہ لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اس کی اسکرین کا عکس دیوار پہ لگی ایل ای ڈی میں بڑا ہو کے دکھائی دے رہا تھا۔

اور یہ اسی وقت تھا جب اس کو اپنی گردن پہ کسی شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔

جیسے کچھ رینگ رہا ہو۔

(نظر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ آنکھ روح کا دروازہ ہوتی ہے۔ یہ جو دیکھتی ہے اس کو روح میں اتار لیتی ہے۔)

ماہر کا ہاتھ تیزی سے گردن کے پیچھے گیا۔ کوئی کیڑا تھا شاید۔ وہ بات روک کے ایک دم اسے جھاڑنے لگا۔ وہ ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے گردن دائیں جانب موڑی۔ ایک بچھو سفید شرٹ کے کالر پہ چلتا ہوا کندھے تک رینگ رہا تھا۔ وہ تیزی سے کھڑا ہوا اور زور سے کندھا جھاڑنے لگا۔ وہ اتر کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ دفعتاً وہ کہنی تک گیا اور پھر غائب ہو گیا۔

"سر آپ ٹھیک ہیں؟" آواز پہ وہ چونکا۔ کانفرنس روم میں بیٹھے افراد تحیر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دم سنبھلا۔

"کوئی چیز چبھ رہی تھی۔ اینی ویز۔۔۔۔" اس نے سلسلہ وہیں سے جوڑتے ہوئے گرافک ٹیبلیٹ پہ نظریں جھکائیں۔

شاید اس کا وہم تھا۔

(وہ ہر روز دن میں کئی دفعہ اس سحر زدہ مجسمے پہ نظر ڈالے گا۔ ہر نظر جادو کو اس کے جسم میں اتارتی جائے گی۔)

وہ کافی شاپ کی قطار میں کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں رول ہوا اخبار تھامے کوٹ میں ملبوس آفس کے لیے تیار۔ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ وہ ذہن میں وہ ان تمام پوائنٹس کو دہرا رہا تھا جو ابھی آفس پہنچتے ہی اس نے پہلی میٹنگ میں اپنی ٹیم کے سامنے رکھنے تھے۔

دفعتاً کسی نے اسے پکارا۔

"ماہر۔۔۔۔"

وہ چونک کے مڑا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔

آواز پھر سے سنائی دی۔

"ماہر۔۔۔۔"

(جادو اس کے جسم میں اس حد تک داخل ہو جائے گا کہ اسے وہ نظر آنے لگے گا جو موجود نہ ہو۔ وہ سنائی دے گا جو کسی نے کہا نہ ہو۔)

"ماہر۔۔۔۔" یہ ایک بھاری مردانہ آواز تھی۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ حیران نگاہیں اطراف میں دوڑائیں۔

کافی شاپ میں لوگ آ جا رہے تھے۔ گلاس ڈور کے باہر اسٹریٹ دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں کوئی کھڑا دروازے سے چہرہ نکالے اندر جھانک رہا تھا۔ ایک چھوٹے قد کا بچہ جس کا سر گنجا اور چہرہ سیاہ تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"آپ کی باری آگئی ہے۔" کسی نے اس کے کندھے پہ دستک دی تو وہ چونکا۔ اس سے اگلا کسٹمر اپنی کافی لے جا چکا تھا اور باریستا ختری اس کو دیکھ رہی تھی۔ ماہر نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا۔

گلاس ڈور کے پار اب کوئی نہیں تھا۔

("اور اس سب سے کیا ہو گا؟")

"اس کو بہت ناز ہے نا کہ سب اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ اب حالات بدل جائیں گے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس کا خود اپنے اوپر سے اعتبار ختم ہو گا۔)

وہ اپنے بیڈ روم میں سنگھار میز کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔ دفعتاً تھوڑی اونچی کر کے دیکھا۔ شیو کے دوران گردن پہ کٹ لگ گیا تھا۔ ننھا سا کٹ۔ اس نے اس پہ انگلی رکھی۔ خون کا ایک قطرہ انگلی کے پورے کو چھو گیا۔ ماہر نے افسوس سے سر جھٹکا۔ اور سیدھا باتھ روم تک آیا۔ سنک کے نیچے

۔ ہاتھ کیے۔ پانی کی دھار انگلی پہ پڑی اور ایک دم وہ دھار شفاف پانی کی بجائے خون میں بدلتی گئی۔ سارا سنک سرخ خون سے بھر گیا۔

(پہلے وہ اس سب کو نظر انداز کرے گا۔ لیکن اس کے بعد وہ خوف میں مبتلا ہونے لگے گا۔ اور خوف ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔)

وہ جھٹکے سے پیچھے ہوا۔ خوف سے سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔ اس کی گردن اور کالر پہ بے تحاشا خون لگا تھا۔ ساتھ ہی گردن میں زور کی تکلیف اٹھی۔ جیسے کوئی گہرا گھاؤ ہو۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور نل کھول کے جلدی جلدی پانی چہرے پہ ڈالنے لگا۔ پھر نگاہ اٹھائی۔

آئینے میں اس کا عکس صاف تھا۔ کوئی خون، کوئی نشان نہ تھا۔ بس پانی سے اس کا چہرہ اور گریبان بھیگا ہوا تھا۔

اس کی رنگت سفید پڑنے لگی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گردن کا درد اب ختم ہو چکا تھا۔

(خوف سحر کو پختہ کرتا ہے۔ جو جتنا ڈرتا ہے اس پہ اتنی جلدی جادو اثر کرتا ہے۔)

یہ چھٹی کے دن کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ وہ کلب کے لاؤنج میں صوفوں پہ بیٹھا تھا۔ گھٹنے پہ ایک کتاب رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگار دبا تھا۔ وہ اسموکنگ زون تھا اور آس پاس بہت سے لوگ اسموکنگ کر رہے تھے۔ وہ انہماک سے مطالعے میں مصروف تھا جب ورق کے کونے پہ ننھی سی سیاہ ٹانگیں دکھائی دیں۔ پھر ایک بچھو رینگتا ہوا اوپر آیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ کتاب جھاڑی۔ اپنے کپڑے جھاڑے۔

اب بچھو کہیں نہیں تھا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ انگلیاں کپکپانے لگیں۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس نے کتاب رکھ دی۔ کسی سے نگاہ ملائے بغیر وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

(تم اس کمپنی میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے، شمس، جب تک وہ اس کا مالک ہے۔ ہمیں اسے وہاں سے نکالنا ہو گا۔)

عمارت کا اکثر حصہ تاریکی میں ڈوبا تھا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ ورک ٹیبل پہ اپنے سامنے ایک ماڈل سجائے وہ بہت دھیان سے اس کے ٹکڑے جوڑ رہا تھا جب دروازے کے چرچرانے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کے رخ موڑا۔

آفس کا دروازہ دھیرے سے کھلا تھا اور کھلتا چلا گیا۔

"کون ہے؟" اس نے پکارا۔ آواز میں چوکنا پن بھی تھا اور خوف بھی۔

دروازہ دھیرے سے واپس بند ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور جا کے دروازہ کھولا۔ انگلیوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

باہر مین ہال میں اکا دکا بتیاں جل رہی تھیں۔ سب جا چکے تھے۔

وہ واپس اپنی میز تک آیا اور اسکرین روشن کی۔ پھر سی سی ٹی وی کیمروں کی ونڈو کھولی۔ وہاں اس کے آفس کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چند منٹ پہلے کی فوٹیج ریوائنڈ کی۔

اس کا رواں رواں آنکھ بن کے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ وہ بالآخر دیکھ لے گا کہ کون اسے یوں ڈرا رہا تھا۔ یقیناً یہ کوئی انسان ہے جو اس کو تنگ کر رہا ہے۔

فوٹیج میں ماہر فرید کام کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ یکدم اس نے دیکھا کہ وہ اٹھا ہے، جا کے دروازہ کھول کے باہر جھانکا ہے اور واپس میز تک آیا ہے۔

وہ سن رہ گیا۔ ششدر۔ ساکت۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے خود دیکھا تھا۔ دروازہ کسی نے کھولا تھا۔ آواز آئی تھی۔ لیکن کیمرے جھوٹ نہیں بولتے۔ کیمرے کہہ رہے تھے کہ دروازہ بند ہی تھا۔ اسے وہم ہوا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہو رہا تھا اس کے

ساتھ؟" اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

بک شیلف پہ رکھا سیاہ گھوڑے کی شکل کا بک ہولڈر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

(اور جو انسان خود پہ بھروسہ کرنا چھوڑ دے اس پہ کوئی دوسرا بھروسہ نہیں کرتا۔"

نگین بیگم نے مسکرا کے وقفہ دیا۔

"ہلال کیسی ہے؟"

سڑک کنارے چلتے شمس کا سانس رک سا گیا۔ اس نے تھوک نگلا۔

"مجھ سے ہلال کے بارے نہ پوچھا کریں سرکار۔" اس نے تلخی سے بات کاٹی۔ جواب میں ہلکی سی ہنسی گونجی۔ اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شمس کا چہرہ اب کے سفید پڑ رہا تھا۔)

☆☆☆

ظہیر اپنے آفس میں بیٹھا بہت سے کاموں میں الجھا ہوا تھا جب اس نے دھپ سے کچھ میز پہ رکھا۔ آواز سے وہ ایک دم چونکا۔ پرنٹ آؤٹس ہاتھ سے گر گئے۔ سر اٹھایا تو وہ سامنے کھڑی اس کو شکایتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ظہیر نے پہلے تعجب سے اس کے تاثرات دیکھے اور پھر میز پہ رکھے باکس کو۔ چند فائلز، فریز، ایک پودا اور سب سے اوپر ایک لفافہ جس پر جلی حروف میں استعفیٰ لکھا تھا۔

"یہ سب کیا ہے مالا؟"

"میں استعفیٰ دینا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" وہ حیران ہوا۔ پرنٹ آؤٹ سمیٹ کے پرے رکھے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم اوشن کو بیچ رہے ہو؟" وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ کیا تم اوشن کو بیچ رہے ہو؟" اس نے دبی دبی آواز میں سوال تلخی سے دہرایا۔ کٹے ہوئے بالوں میں چھپی پیشانی پہ بل وہ دیکھ سکتا تھا۔

"میں اوشن کو کیوں بیچوں گا؟"

"یہ بھی میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

ظہیر نے گہری سانس لی۔ پیچھے ہو کے بیٹھا اور کندھے اچکائے۔

"نہیں۔ ایک آدمی خریدنا چاہتا تھا لیکن پیچھے ہٹ گیا۔"

"یعنی تم اس کو بیچنے کے لیے تیار تھے؟"

"مجھے ڈیڈی کو پیسے لوٹانے ہیں اور اوشن اب تک نقصان میں جا رہا ہے۔ ہمیں کچھ ریٹرن نہیں آ رہا۔" اس نے شیو کھجائی اور بات شروع کی۔ "لیکن میں اس کو نہیں بیچ رہا۔"

"کیونکہ تمہارے پاس کوئی آفر نہیں ہے۔ آفر ہوتی تو بیچ دیتے۔ کبھی یہ سوچا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی؟ میں نے اس ریستوران کو ایک سال دیا ہے۔"

"اور وہ سال ضائع گیا ہے۔ ہم چاہیں تو ابھی بھی اس فیز سے نکل سکتے ہیں۔ میں کچھ بونس دے کر سب کو فارغ کر سکتا ہوں۔" وہ جیسے اب تھک چکا تھا۔ "مزید وقت ضائع کرنے سے بہتر نہیں ہے کہ ہم اس سے نکل جائیں؟"

"اگر تم نے اوشن کو بیچنا ہے تو ابھی فیصلہ کرو۔ میں استعفیٰ دے دیتی ہوں۔" اس نے لفافہ باکس سے نکال کے سامنے رکھا۔

"ابھی فوراً تو نہیں......" وہ گڑبڑا گیا۔ پھر لہجہ بدلا۔ "دیکھو ہم کچھ عرصہ اس کو چلا کے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر......"

"نہیں ظہیر۔ میں اپنا کیریئر مفروضوں پہ نہیں بنا سکتی۔ میرا ایک سال پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔ تم میرا استعفیٰ قبول کر کے میرا مزید وقت ضائع نہ کرواؤ۔ یا پھر تم اوشن کو بیچنے کا خیال ذہن سے نکال دو اور مجھے اس کو چلانے دو۔"

ظہیر نے ایک نظر اس کے باکس کو دیکھا۔

"کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ اوشن کامیاب ہوگا؟"

"اوشن ضرور کامیاب ہوگا اگر تم اس کو وقت

دو۔ ہر بزنس کو سیٹ ہونے میں وقت لگتا ہے۔" اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "اگر اس وقت تم اس کو بیچ دیتے ہو تو سمجھو ہمارا ایک سال ضائع گیا۔ میں اپنا سال ضائع نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کو کامیاب بناؤں گی۔ لیکن تم مجھ سے پوچھے بغیر اس کو نہیں بیچو گے۔"

"نہیں بیچوں گا یار۔ تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے۔" ظہیر نے آواز نرم کر کے بہت اپنائیت سے اسے دیکھا۔ "ہم لوگ اب تک ایک فیملی کی طرح کام کرتے آئے ہیں۔ میں کیوں تمہیں بتائے بغیر ریستوران بیچوں گا؟ ہرگز نہیں۔ کانٹریکٹ سائن کروالو بے شک۔ لیکن کاغذ کی وہ حیثیت نہیں ہے جو میرے الفاظ کی ہے۔"

"کانٹریکٹ کرنا ہوتا تو کر چکے ہوتے۔" اس کا لہجہ شکایتی تھا البتہ پیشانی کے بل نرم پڑ چکے تھے۔ "فی الحال مجھ پہ بھروسہ کر کے دیکھو۔ مجھے ایک سال دو۔ میں نہ صرف اس ریستوران کو کامیاب کر کے دکھاؤں گی بلکہ ہم ایک سال بعد توسیع کر رہے ہوں گے۔"

"توسیع؟" ظہیر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"کیسے؟"

"بیکری سے۔ ہم ریستوران میں ایک بوتیک بیکری کا اضافہ کریں گے۔ کیونکہ کیکس خاندانوں کو جوڑتے ہیں۔ لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیتے ہیں۔"

"بہت دلچسپ۔" وہ مسکرایا۔

"میں اپنا استعفیٰ واپس لے رہی ہوں لیکن اس وعدے پہ کہ تم اوشن کو نہیں بیچو گے اور مجھے ایک نئے بزنس پلان پہ کام کرنے دو گے۔ اگلے سال ہم بیکری بنائیں گے۔"

"میم یہ باکس پھینک دوں؟" صاعقہ اس کی چیزیں واپس میز پہ سیٹ کر چکی تو خالی باکس کو دیکھ کے سوال پوچھا۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھی کسی سوچ میں گم دکھائی دیتی تھی۔

"نہیں۔ اس کو میری کیبنٹ میں رکھ دو۔"

"اب تو آپ استعفیٰ نہیں دے رہیں۔ اب اس کی کیا ضرورت؟" وہ حیران ہوئی۔

مالا نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی۔ سرمئی باکس بھی اس کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

"ہونا چاہیے۔ باکس ہمیشہ ساتھ ہونا چاہیے۔" وہ زیرلب بڑبڑائی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب کشمالہ مبین کو احساس ہو چکا تھا کہ ایک دن ظہیر اس کو بتائے بغیر اوشن بیچ دے گا اور اسے اپنا سامان اسی باکس میں ڈال کے یہ جاب چھوڑنی پڑے گی۔

☆☆☆

لونگ روم کے وسط میں رکھی سینٹر ٹیبل پہ وہی کینڈل رکھی تھی جو اس روز ماہر نے اسے دی تھی۔ ہلال کہنیاں میز پہ ٹکائے خفگی سے اس کینڈل کو دیکھ رہی تھی۔ محسن پیچھے صوفے پہ براجمان مسکراتے ہوئے موبائل پہ لگا تھا۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور محظوظ سے انداز میں رابیل کو مخاطب کیا جو اسی وقت کچن سے کافی کا مگ اٹھائے آتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"ماہر آج کل کچھ اپ سیٹ لگ رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"ہلال کو آج اس کے آفس سے لینے گیا تو دیکھا۔ چڑچڑا سا۔ جیسے خوف زدہ ہو۔" اس نے مسکراہٹ دبا کے بظاہر چہرے پہ حیرت طاری کر لی۔

"کام کا اسٹریس ہوگا شاید۔" رابیل کے چہرے پہ ابھرنے والی حیرت اصلی تھی۔ اور پھر وہ فکرمندی میں بدل گئی۔

"میں اس سے ملنے جاؤں گی۔"

"تمہیں بتائے گا وہ؟ ہونہہ۔" محسن ہلکے سے ہنسا اور اٹھ گیا۔ اس کے انداز میں استہزا تھا۔ رابیل چپ ہو گئیں۔ سر جھکا لیا۔ پھر ایک دم چونکیں۔ ہلال مڑ کے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بال کمر پہ پھیلے تھے۔ اور آنکھوں میں اچنبھا تھا۔

"ماہر بھائی کو کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ دکھاؤ یہ کیا ہے؟" انہوں نے جلدی سے مسکرا کے تاثرات تبدیل کیے۔ ہلال کا چہرہ قدرے بجھ گیا۔

"ماہر بھائی ہمیشہ مجھے کینڈل گفٹ کرتا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے ہیں اتنی ساری کینڈلز۔" وہ خفا خفا سی تھی۔ رائیل مسکرا دیں۔

"پھر تمہیں کیا چاہیے؟"

ہلال کی آنکھوں میں ایک چمک سی عود آئی۔

"نیل پالش۔ ڈولز۔ جاکلیکس۔ یونی کورن۔ لاکٹ۔ رنگز۔ بینگلز۔" وہ ایک ہی سانس میں انگلیوں پہ گنتی جارہی تھی اور وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھے گئیں۔

"لیکن ماہر بھائی مجھے صرف کینڈلز دیتا ہے۔ میں کیا کروں ان کا؟"

"مجھے دکھاؤ۔" انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور مگ پرے رکھ دیا۔ ہلال نے بجھے دل کے ساتھ کینڈل ان کی طرف بڑھائی۔

انہوں نے ڈھکن کھولا تو موم کی خوشبو بنا چاپ کے باہر نکلی اور پھیلتی چلی گئی۔

رائیل نے ایک نظر اسے دیکھا اور دوسری نظر جار میں جمی موم کو جس کے اندر تین سیاہ دھاگے فاصلے فاصلے پہ لگے تھے۔

"کیا تم اب تک نہیں سمجھی ہو کہ وہ تمہیں صرف کینڈلز کیوں دیتا ہے؟"

ہلال کی آنکھیں ایک دم چمکیں۔ اس نے چونک کے ان کو دیکھا۔

"ہوں......" اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔

☆☆☆

حالیہ دن۔

زیاد کے والدین کا لاہور میں واقع گھر۔ قدرے پرانے طرز پر بنا بنگلہ تھا جس کو مرمت وغیرہ کروا کے کافی حد تک مین ٹین رکھا گیا تھا۔ وہ کار سے باہر نکلی اور ایک نظر اس بنگلے پہ ڈالی تو ایک عجیب پراسراریت کا احساس ہوا۔ کچھ تھا وہاں جو عام گھروں سے مختلف تھا۔

ثمینہ بیگم نے اسے بہت محبت سے گھر بلایا تھا۔ زیاد اسلام آباد گیا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ مالا ان کے ساتھ تھوڑی ہیلپ کروا دے۔ ثمینہ آنٹی ویسے بھی اتنی شفیق اور محبت کرنے والی تھیں کہ وہ ان کو ناں نہیں کہہ سکتی تھی' گو کہ زیاد سے اس کی بول چال بند تھی۔

اس گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ پرندوں کی آوازیں تک نہ تھیں۔ وہ پہلے ایک ہی دفعہ یہاں آئی تھی وہ بھی باہر ہی سے چلی گئی تھی۔ پہلی بار اندر آرہی تھی۔ کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

لان خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں درخت نہیں تھے نہ پودے۔ اس نے غور کیا تو احساس ہوا کہ گھاس بھی مصنوعی تھا۔ کوئی گملہ تک نہ تھا۔ صرف ایک درخت تھا جو سوکھ گیا تھا۔ جیسے کچھ تھا فضا میں جو اسے پھلنے پھولنے نہیں دیتا تھا۔

ظاہر ہے۔ وہ لوگ دبئی چلے جاتے ہیں۔ ثمینہ بیگم مہینے میں ایک چکر لگاتی ہیں۔ ایسے میں پودوں کا خیال کون رکھے گا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔

اس نے لکڑی کے مین ڈور پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ ایک دم کھل گیا۔ وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹی۔

سامنے سیاہ فام سی بنگالی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس کی گھورتی ہوئی نظریں اس کے وجود کے آرپار ہوئیں۔

"بی بی آپ کی منتظر ہیں۔" وہ اس کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ تھا اس کی نظروں میں جو کشمالہ سین کو غیر آرام دہ کرنے لگا۔ البتہ وہ عادتاً مسکرا دی۔

اندر آئی تو دیکھا لاؤنج میں تاریکی سی تھی۔ بتیاں بہت مدھم تھیں۔ اور کھڑکیوں کے آگے بھاری پردے تھے جنہوں نے روشنی کا راستہ روک رکھا تھا۔ ثمینہ آنٹی لاؤنج کے تخت پہ بیٹھی تھیں۔ بیمار' نحیف۔ ہمیشہ کی طرح باوقار سا سفید لباس پہنے۔ سر پہ سفید شال اوڑھے۔ ان کے قریب ہیٹر جل رہا تھا۔ شاید انورٹر بھی آن تھا کیونکہ وہ گھر اندر سے بہت گرم تھا۔ جیسے دہک رہا ہو۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میری بچی میرے گھر آئی ہے۔" وہ بدقت اٹھ کے اس سے ملیں۔ وہ مسکرا دی اور ان کے پاس وہیں تخت پہ بیٹھ گئی۔ پھر دائیں

بائیں دیکھا۔

"آپ نے لائٹس نہیں جلا رکھیں؟" آج باہر دھند نہیں تھی۔ میٹھی سی دھوپ نکلی تھی۔ لیکن اس گھر کے اندر نیم تاریک سا ماحول تھا۔ اندھیرا اور گرمائش۔

"جلا رکھی ہیں۔ مجھے ایسے ہی پسند ہے۔" وہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے بیٹھے مسکرائیں۔ وہ بھی مسکرا دی۔ البتہ کچھ تھا جو اسے غیر آرام دہ کر گیا تھا۔ شاید اسے ماں کی طرح روشنی کی عادت تھی۔ کمروں کو روشن اور ہوادار رکھنا۔ کھڑکیاں کھولنا۔ اور پودے۔ وہ چونکی۔ یہاں اندر بھی پودے نہیں تھے۔ اچھا خیر۔ اسے کیا۔

"زیاد سے بات ہوئی۔ اسے بتایا کہ آج کشمالہ آرہی ہے تو اندازہ ہوا کہ اسے معلوم نہیں۔" انہوں نے نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "کیا کوئی لڑائی ہوئی ہے تم دونوں کی؟"

"نہیں تو۔" وہ سنبھل کے مسکرائی۔ ہر نئے کپل کی طرح یہ اس کا ڈیفنس میکنزم تھا۔ کوئی دوسرا نہ جان پائے کہ دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے۔

"اس نے بھی یہی کہا۔" وہ دھیرے سے مسکرائیں۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں تھامے۔ کشمالہ نے ان کے ہاتھوں کو دیکھا۔ انہوں نے چاندی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جو پلین تھی۔ سادہ۔ بالکل سادہ۔

"زیاد کو سبرینہ.. اس کی پہلی منگیتر...... کی موت نے بہت ڈپریسڈ کر دیا تھا۔ اس کا تو جیسے دل ہی ٹوٹ گیا۔ بہت عرصے بعد وہ سنبھلا ہے اور زندگی کی طرف واپس آیا ہے۔ وہ بھی تمہاری وجہ سے کشمالہ۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے بہت اپنائیت سے کہہ رہی تھیں۔ مالا نے سنتے ہوئے سر ہلایا۔ اسے احساس ہوا کہ اندرانی نامی ملازمہ تخت کے کنارے پہ آ کھڑی ہوئی ہے اور اسے گھور رہی ہے۔

"صرف تمہاری وجہ سے اس کی زندگی کی رونق واپس آئی ہے۔ محبت یہ ہوتی ہے۔ جو ٹوٹے دل کو جوڑ دے۔ ایک اچھی عورت اپنی محبت سے اپنے شوہر کے دل کو جوڑ سکتی ہے۔ اس کو اس کے سب مسئلوں سے نکال سکتی ہے۔ اپنی محبت سے اس کی ذات کی ہر کمی کو پورا کر سکتی ہے۔"

اس نے پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک ان کے ہاتھوں میں تھا۔

"زیاد کی بھی کچھ بری عادات ہیں۔ غصے کا تیز ہے۔ کبھی کبھی تلخ ہو جاتا ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے۔ لیکن تم دیکھنا۔ شادی ہوتے ہی وہ اپنی اس کمی پہ بھی قابو پا لے گا۔ سمجھدار عورت بہت صبر سے اپنے شوہر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔"

کچھ غیر آرام دہ سا اندر سر اٹھانے لگا۔ اس نے لب کھولے۔ الفاظ ذہن میں جمع ہوئے۔ کیا عورت یہ سب کر سکتی ہے؟ کیا وہ کوئی بری عادات کے چھڑوانے کا اسکول ہے؟ لیکن وہ کہے جا رہی تھیں۔

"شروع شروع میں لڑکیوں کو ذرا صبر کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو اگنور کرنا پڑتا ہے اور پھر آگے بڑے بڑے سکھ مقدر کا حصہ بنتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی اپنی سمجھداری سے زیاد کو ہینڈل کر لوگی۔"

اس کے سارے اعتراض دم توڑ گئے۔ وہ درست کہہ رہی تھیں۔ عورت کو ہی گھر بنانا ہوتا ہے۔ عورت کو ہی گھر کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور نرمی سے مسکرائی۔

"میں سمجھ گئی ہوں۔" ذہن نے ایک ریمائنڈر اپنے اندر محفوظ کیا۔ آج وہ زیاد کے میسج کا جواب دے گی۔ اسے اب ناراضی ختم کر دینی چاہیے۔

اندرانی ابھی تک وہیں کھڑی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"میرے ساتھ اس کے کچھ ڈاکومنٹس سنبھال دو۔ اندرانی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے۔ جو چیز فالتو ہے اسے ہم پھینک دیں گے۔ اور کام کی چیز رکھ لیں گے۔"

بنگالی ملازمہ نے سہارا دے کر انہیں وہیل چیئر

بٹھایا اور وہ دونوں اب ایک لائبریری نما کمرے میں آ گئے۔ یہ زیاد سلطان کا اسٹڈی روم تھا۔ کتابوں کے دیوار گیر شیلف۔ فائلز کے ڈھیر۔

"زیاد دبئی میں اکیلا رہتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد تم دونوں ہمارے ساتھ رہو گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" بنگالی عورت خاموشی سے اس کو کاغذات پکڑا رہی تھی جنہیں وہ الگ الگ کیے جا رہی تھی جب نگینہ بیگم نے ایک دم سوال کیا۔

"ہرگز نہیں۔ بلکہ ہمیں تو آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ ورنہ آپ کا خیال کون رکھے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ایک فائل کو کھول کے سرسری سا دیکھا۔ "یہ کام کی ہے۔ پلاٹ کے کاغذات ہیں۔ اس کو اس طرف رکھ دیں نوا۔"

بنگالی عورت نے ایک خاموش گھورتی نظر اس پہ ڈالی اور فائل ایک ڈھیر میں رکھ دی۔ پھر اس نے ایک دوسری فائل اسے تھمائی۔ اور ایک نگینہ بیگم کو۔

"زیاد کو اکثر ڈاکومنٹس کا مسئلہ ہوتا رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ تمام اہم ڈاکومنٹس اپنے ساتھ دبئی لے جائے۔ اب میری صحت ایسی نہیں رہی کہ بار بار پاکستان آسکوں۔" وہ کپکپاتے ہاتھوں سے ایک فائل کھولے اب عینک سے پڑھ رہی تھیں۔

وہ جواب میں کچھ کہنے لگی۔ تب ہی ایک دم رکی۔ جس فائل کو اس نے اب کھولا تھا اس کے اندر چند کاغذات لگے تھے۔ سب سے اوپر ایک تصویر تھی۔ کسی لڑکی کی جس نے بالوں کی اونچی پونی باندھ رکھی تھی۔ اور اس کی آنکھ کے نیچے تل کا نشان تھا۔

اس نے دو انگلیوں سے تصویر نکال کے پلٹی۔

سبرینہ۔

اس کے اعصاب تن گئے۔ ایک ناپسندیدہ سا احساس اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

"یہ فائل کہاں سے آ گئی؟" نگینہ بیگم نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ "میں تو کبھی کی اسے عرصہ پہلے پھینک چکی ہوں۔" انہوں نے ماتھے کو چھوا۔ پھر کھانسیں۔ بنگالی عورت خاموشی سے مالا کو دیکھ رہی تھی جس کی نظریں فائل پہ جھکی تھیں۔

"یہ کس چیز کے کاغذات ہیں؟"

"یہ سبرینہ کی موت کے بعد اس کی فیملی نے ہمیں دیے تھے۔ دیکھ لو کوئی عدالتی کاغذ ہیں شاید۔" انہوں نے لاعلمی ظاہر کر دی۔

مالا کی نظریں کاغذ پہ دوڑ گئیں۔

وہ ایک انجکشن آرڈر (دور رہنے کا عدالتی حکم نامہ) تھا جو سبرینہ کی بہن اور ماں باپ نے عدالت سے حاصل کیا تھا۔

ایک ماہر علی فرید کے خلاف۔

ساری دنیا تھم گئی۔ اس کی پلکیں ساکت تھیں۔

ان الفاظ کی سیاہی ان مٹ تھی۔

ساتھ ہی ایک این سولہ اے فارم کی کاپی بھی لگی تھی جسے پر کر کے انہوں نے عدالت میں جمع کروا کے یہ حکم نامہ حاصل کیا تھا۔

"ماہر علی فرید۔" لب بڑبڑائے۔ اس نے چونک کے انہیں دیکھا۔

"سبرینہ کے والدین نے اس آدمی کے خلاف انجنکشن لی تھی؟"

"ارے میں نے تمہیں بتایا تھا نا پہلے بھی۔ جب سبرینہ کی موت ہوئی تو....." انہوں نے عینک اتاری اور اسے فولڈ کرنے لگیں۔ "اس ایکسیڈنٹ میں ایک امیر بوڑھا بھی مارا گیا تھا۔ اس کا ایک نفسیاتی سا بیٹا تھا۔ کچھ عرصہ کسی نفسیاتی امراض کے ہسپتال میں بھی رہا تھا۔ اندرانی میری چائے لے آؤ۔" ساتھ ہی ملازمہ کو عام سے انداز میں اشارہ کیا۔

"صبح سے چائے نہیں پی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔" پھر اس کا چہرہ دیکھ کے ماتھے کو چھوا۔

"میں بھی دیکھو بات درمیان میں بھول جاتی ہوں۔ کیا کہہ رہی تھی میں؟"

وہ سانس روکے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"وہ جو نفسیاتی آدمی تھا نا...... پتا نہیں کیا نام تھا۔ خیر..... فائل میں درج ہوگا......"

(ماہر علی فرید) اس کے لبوں نے بنا آواز کے حرکت کی۔

"وہ آدمی سبرینہ کے پیچھے پڑا تھا۔ کہتے ہیں ایکسیڈنٹ بھی اسی نے کروایا تھا اپنے سوتیلے باپ کو مارنے کے لیے۔ وہ کئی برس سے اپنے باپ کو قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دیتا آیا تھا۔ سبرینہ کی موت کے بعد وہ اس کی فیملی کے پیچھے پڑ گیا۔ ان کا تعاقب کرتا۔ ان کو ہراس کرتا۔ وہ لوگ اس سے سخت خوفزدہ تھے۔ اس لیے عدالت چلے گئے۔ اور یوں عدالت نے اس کے خلاف نوٹس دیا۔ تب بھی اس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بالآخر انہوں نے ملک ہی چھوڑ دیا۔"

"زیاد...... زیاد کو معلوم ہے یہ؟" اس کی آواز ہلکی تھی اور نظریں اس آرڈر پہ جمی تھیں۔

"ہاں۔ لیکن میں نے زیاد کو خود ہی روک دیا ان لوگوں کے مسئلوں میں پڑنے سے۔ ہمیں سبرینہ عزیز تھی لیکن اس کی موت کے بعد میں تو ڈر گئی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے اور ایسے نفسیاتی انسان کا بھروسا نہیں ہوتا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے بیٹے کے پیچھے نہ پڑ جائے یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔"

"کس نے مارا تھا اس کے باپ کو؟ کیا کبھی معلوم ہو سکا؟"

"نہیں بیٹا! ہم نے اس کیس کے بارے میں خبر رکھنا چھوڑ دی تھی۔ اس فائل کو بھی پھینک دو کشمالہ، زیاد دیکھے گا تو اس کا دل برا ہوگا۔"

لیکن اس نے فائل نہیں پھینکی۔ آہستہ سے اسے گھٹنے کے قریب رکھ لیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید تھا اور آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

(وہ سبرینہ کے پیچھے پڑا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے بیٹے کے پیچھے نہ پڑ جائے۔)

ایک فقرہ بار بار ذہن پہ دستک دے رہا تھا۔

☆☆☆

کیرہ ساداں کے آفس میں اس وقت ہیر بل فرید منہ پھلائے بیٹھا تھا۔ گاہے بگاہے وہ اپنے بھائی کو بھی گھور لیتا جو اپنا اور اپنے کام کا تعارف کروا رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور میز کے دوسری طرف کیرہ بیگم بیٹھی تھیں۔

"ان کا تعارف نہیں کروایا۔" انہوں نے مسکرا کے ہیر بل کو دیکھا۔

"میں......" ہیر بل نے لب کھولے ہی تھے کہ ......

"یہ میرا نزس ہے۔ کیئر ٹیکر نزس۔"

ہیر بل کا منہ کھل گیا۔ بے یقینی سے اسے دیکھا جو اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ پھر خفگی سے لب بھینچے اور پیچھے ہو کے سینے پہ بازو لپیٹ لیے۔

"اچھا لگا آپ سے مل کے ماہر! بتائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" انہوں نے کھنکھار کے بالآخر اس کی آمد کا مدعا پوچھا۔ ساتھ ہی وہ مسلسل گردن میں جھولتی سنہری زنجیر کو انگلی پہ لپیٹ رہی تھیں۔

"میں آپ کے پاس بزنس کے لیے نہیں آیا۔ کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں۔"

"مثلاً؟" کیرہ کے چہرے پہ تحیر ابھرا۔ قدرے پیچھے ہو کے بیٹھیں۔ پانی کا گلاس اٹھا کے لبوں سے لگایا۔

"پیٹر مسیح یاد ہے آپ کو؟"

کیرہ نے آہستہ سے گلاس نیچے رکھا۔ ٹشو پیپر ڈبے سے نکالا اور گلاس سے ہاتھوں پہ لگنے والی نمی صاف کی۔

"کون پیٹر مسیح؟"

ماہر فرید دھیرے سے مسکرایا۔ "میں آپ کو جج نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ پیٹر مسیح کی کلائنٹ رہی ہیں۔ میں یہ بات کئی ماہ سے جانتا ہوں لیکن میں نے آپ کو نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ مجھے لگا کہ آپ میں اور مجھ میں کچھ مشترک نہیں ہے۔"

وہ بالکل خاموشی سے اسے سن رہی تھیں۔ چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔ ہیر بل کو پہلی دفعہ گفتگو میں

دلچسپی محسوس ہوئی۔
"کون ہو تم؟" وہ آنکھیں چھوٹی کر کے اس کو گھور رہی تھیں۔
"میں ماہر فرید ہوں۔ ہلال کا بھائی۔" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تصویر نکال کے میز پہ رکھی۔ کبیرہ نے دو انگلیوں سے تصویر اٹھا کے دیکھی، پھر ماہر کا چہرہ۔
"یہ میری بہن ہے اور یہ دو سال پہلے کھو گئی تھی۔"
"پھر...... میں کیا کروں؟" انہوں نے تصویر میز پہ ڈال دی۔ اور ایک نیا ٹشو نکالا۔
"اس روز مجھے کسی نے احساس دلایا کہ ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کیسے۔" اس کی مسکراہٹ برقرار تھی۔
"آپ کا ایک بیٹا تھا۔ وہ مر گیا تھا۔ سارا خاندان جانتا ہے کہ وہ مر گیا تھا لیکن آپ کہتی ہیں کہ وہ زندہ ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی۔ "جیسے میں کہتا ہوں کہ میری بہن زندہ ہے۔"
بیرِبل فرید نے بری طرح چونک کے اسے دیکھا۔ اس کا سانس تک رک گیا۔
"میں سمجھتا تھا کہ آپ denial میں ہیں یا لوگوں کے سامنے اپنا مان رکھنے کے لیے اپنے بیٹے کو زندہ بتاتی ہیں۔ آپ نہیں چاہتیں کہ کوئی آپ پہ ترس کھائے۔ آپ سے ہمدردی کرے۔ لیکن اس روز مجھے احساس ہوا کہ......"
وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
"کیا معلوم آپ برسوں سے سچ کہہ رہی ہوں؟" وہ ہر لفظ توڑ توڑ کے کہہ رہا تھا اور وہ پلک نہیں جھپک پا رہی تھیں۔
"کیا معلوم آپ کا بیٹا بھی ویسے ہی کھویا ہو جیسے ہلال کھوئی تھی؟ اور جیسے کوئی میرا اعتبار نہیں کرتا، ویسے ہی آپ پہ اعتبار بھی نہیں کیا جاتا۔"
"تمہیں مجھ سے کیا چاہیے؟" ان کی آنکھوں میں تپش سی تھی۔ غصہ۔ بے بسی۔
"مجھے آپ کی طرف کی کہانی سننی ہے۔ کچھ ایسا جو ہلال کو ڈھونڈنے میں میری مدد کر سکے۔"
"اور میں تمہاری مدد کیوں کروں گی؟ میرا بیٹا مرا ہے یا نہیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"
ان کا انداز بے لچک تھا۔
ماہر نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور میز پہ رکھا۔
"میں اس ہوٹل کے روم نمبر ۵۵۵ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اگلے تین دن میں یہیں ہوں گا۔ آپ جب بھی جواب دینے کے لیے تیار ہوں، وہاں آ جایئے گا۔" اس نے بیرِبل کو اشارہ کیا جو فوراً سے اٹھا اور اس کی وہیل چیئر تھام لی۔ وہ جس طرح کی کھا جانے والی نظروں ان کو دیکھ رہی تھی، قوی امکان تھا کہ وہ جلد ہی کہہ دے، دروازہ اس طرف ہے۔
"یہ ٹشو پیپر سے ہاتھ کیوں صاف کر رہی تھی؟ کیا اس کو او سی ڈی ہے؟" لفٹ کی طرف جاتے ہوئے بیرِبل نے سوال کیا۔
"نہیں۔ یہ او سی ڈی نہیں ہے۔ وہ ظاہر کرتی ہے کہ اسے او سی ڈی ہے۔ درحقیقت انسان جب بہت سے لوگوں پہ جادو کروا چکا ہو تو اس کو خود پہ جادو ہونے سے خوف آنے لگتا ہے۔ وہ کسی کا دیا تحفہ قبول نہیں کرتا۔ کسی سے لے کر کچھ نہیں کھاتا۔ ہر چیز بار بار صاف کرتا ہے کہ کہیں کسی نے پھونک نہ ماری ہو۔ ایک بال بھی گر جائے تو اس کو خوف آتا ہے کہ کوئی اس پہ جادو کر دے گا۔ جادو کروانے والے ساری عمر اپنے اسی خوف میں رہتے ہیں۔"
"کیا وہ اپنی کہانی سنانے آئے گی؟" بیرِبل کو اچنبھا ہوا۔ اسے ماہر سے اتنی جلدی وہاں سے چلے آنے کی توقع نہیں تھی۔
"وہ ضرور آئے گی۔"
"تمہیں کیسے معلوم؟"
"کیونکہ آج تک ہر کوئی سمجھتا آیا ہے کہ کبیرہ اپنے بیٹے کے زندہ ہونے کے بارے میں جھوٹ بولتی ہے۔ میں وہ واحد انسان ہوں جس نے اس کی

بات پہ اعتبار کیا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔"

"اور تم بس اسی کے لیے اس شہر میں ٹھہرے ہوئے ہو؟ اور کوئی کام نہیں ہے تمہیں؟" وہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے ناراضی سے بولا تھا۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔

"کبیرہ بیگم سے ملنے میں سارے کام چھوڑ کے آیا تھا؟ ہونہہ۔" وہ زیرلب بڑبڑایا۔

"تم کام بھی کرتے ہو؟" وہاں سدا کی بے نیازی چھائی تھی اور اس لمحے ہیربل فرید نے تہیہ کیا کہ وہ اپنے بھائی سے مزید کلام نہیں کرے گا، بلکہ وہ ماہر کا بدلہ لے گا۔

اور اس وقت وہ اس سے صرف ایک طریقے سے بدلہ لے سکتا تھا۔ کچھ سوچ کے اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

واپسی پہ سارا راستہ ماہر خاموش تھا۔ البتہ ہیربل مسکراہٹ دبائے موبائل پہ جھکا تھا۔ اس نے انسٹاگرام کھول رکھا تھا۔ سامنے کشمالہ معین کی آئی ڈی کھلی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے میسج کا بٹن دبایا۔

"میرا بھائی اس وقت لاہور کے اس ہوٹل میں رہائش پذیر ہے۔" ہوٹل کا نام لکھ کے وہ ٹائپ کر رہا تھا۔" وہ آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہے۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کچھ دیر کے لیے اس کی بات سن لیں۔"

میسج بھیج کے اس نے اسکرین شاٹ لیا اور اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ وہ جانتا تھا کشمالہ اس کا میسج نہیں دیکھے گی۔ نہ اسے جواب دے گی۔ نہ وہ ماہر سے ملنے آئے گی۔ لیکن اس اسکرین شاٹ کو دیکھ کے ماہر کے تاثرات کیا ہوں گے۔ اسے سوچ کے مزہ آنے لگا۔ لیکن ابھی نہیں۔ وہ استنبول جا کے ہی اس کو یہ دکھائے گا تاکہ فوراً سے گھر سے غائب ہو سکے اور......

میسج ٹون نے اسے چونکایا۔ اسکرین کو دیکھا تو لب بے یقینی سے کھل گئے۔ وہاں کشمالہ معین لکھا نظر آرہا تھا۔ ہیربل کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اس کو اندازہ نہ تھا کہ وہ اس کی میسج ریکویسٹ اتنی جلدی دیکھ لے گی۔

"کیا تمہارا بھائی شام سات بجے کے بعد وہیں ہوگا؟"

اس نے گڑبڑا کے ماہر کو دیکھا جو بے خبر سا باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اسکرین کو۔

"یس۔" اب وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ بے اختیار ناخنوں سے دانت کترنے لگا۔

یہ اس نے کیا کیا؟ ماہر اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اوہ نو۔

☆☆☆

"آئی ایم سوری۔" زیاد کی آواز سماعتوں میں سنائی دی اور اس کا سارا غصہ دھیرے دھیرے غائب ہونے لگا۔ وہ نگینہ آنٹی کے گھر سے واپسی پہ ابھی ٹریفک کے رش میں تھی جب زیاد کا میسج آیا۔ بہت دنوں بعد وہ کھل کے مسکرائی۔ تب ہی اس کی کال بھی آنے لگی۔ اس نے کار فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

"مجھے تم پہ غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم چاکلیٹس نہیں کھاتیں۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔"

"مجھے بھی آپ کا تحفہ اتنی لاپرواہی سے کسی اور کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری ٹو۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ موڈ ایک دم بہتر ہو گیا تھا۔ اتنے دن سے جو واہمے دل کو ستانے لگے تھے وہ ایک دم سے غائب ہو گئے تھے۔

"ہم چند دن بعد ایک ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ ہمیں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پہ موڈ نہیں خراب کرنے چاہیے۔"

"آپ کو بھی چاہیے کہ آپ ہمیشہ مجھ سے عزت سے بات کریں۔ عزت محبت سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"

"محبت میں نہ کوئی انا، کوئی سیلف ریسپیکٹ، کوئی باؤنڈری نہیں ہوتی" کشمالہ امیاں

بیوی کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اہم یہ ہے کہ ہم ہر دفعہ ایک دوسرے کو منالیا کریں۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر فون وائبریٹ ہوا تو اس کی توجہ بٹی۔ موبائل اٹھا کے دیکھا تو ہیر بل فرید لکھا آرہا تھا۔

"میں آپ کو گھر پہنچ کے کال کرتی ہوں۔" اس نے کال بند کی۔ چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ وہ لب بھینچے شکن آلود پیشانی کے ساتھ تیز تیز ٹائپ کرنے لگی۔

☆☆☆

ہوٹل کی لابی سیاہ سفید ٹائلز سے مزین تھی۔ کچھ فاصلے پہ مخملیں صوفے رکھ کے چھوٹے چھوٹے سٹنگ ایریاز بنائے گئے تھے۔ اس شام وہاں اتنا رش نہ تھا۔ کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ اٹھ کے جا رہے تھے۔

ماہر بھی ایسے ہی ایک صوفے پہ براجمان تھا۔ سفید ڈریس شرٹ پہنے کف موڑے وہ پیر لمبے کر کے مخملیں اوٹومن پہ رکھے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں کتاب تھی جسے وہ اونچا اٹھائے پڑھنے میں مصروف تھا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ ہیر بل دائیں بائیں ٹہل رہا ہے۔ کبھی بیٹھ جاتا۔ کبھی اٹھ کے چلنے لگتا۔

"اتنے بے چین کیوں ہو؟" ماہر نے کتاب کا کونا موڑا اور ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔

"نہیں تو۔" وہ فوراً اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"پیسے چاہئیں؟" غور سے اسے دیکھا۔

"دنیا پیسے سے شروع ہو کے پیسے پہ ختم نہیں ہو جاتی ماہر بے" وہ چڑ گیا۔

"تمہاری ہو جاتی ہے۔" بے نیازی سے واپس کتاب پڑھنے لگا۔

اور یہ وہی لمحہ تھا جب ایک احساس نے دستک دی۔ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ دور سے۔ ماہر فرید نے کتاب نیچے کی۔

سیاہ سفید شطرنج کی بساط جیسے فرش پہ دور سے وہ چلی آرہی تھی۔

وہ جسے وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

کتاب خود بخود نیچے ہوتی ہوئی صوفے پہ جا ٹھہری۔ اس نے تیزی سے پیر نیچے کیے۔ بیساکھیاں قدموں میں رکھی تھیں۔ نامحسوس انداز میں ماہر نے پیر سے انہیں صوفے کے نیچے دھکیلا۔ اور بدقت اپنے قدموں پہ کھڑا ہوا۔ نگاہیں اس پہ جمی تھیں۔

وہ میرون لمبی قمیض پہ بھوری لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ گردن میں ڈال کے دونوں پلو سامنے گرائے ہوئے تھی۔ بال آدھے دائیں کندھے پہ اور باقی آدھے پیچھے گر رہے تھے۔

وہ اسی کو دیکھتی اس طرف آرہی تھی۔ کسی غلطی سے نہیں۔ اتفاق سے نہیں۔ اس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ اسی سے ملنے آئی ہے۔

مگر کیوں؟ کیسے؟

ماہر نے چونک کے ہیر بل کو دیکھا۔ ذہن نے دو جمع دو کیے۔

"کیا کیا ہے تم نے؟" وہ دبی آواز میں غرایا۔ ہیر بل مزید فاصلے پہ سرک گیا اور چہرہ ایسے موڑ لیا جیسے اسے پہچانتا تک نہ ہو۔

وہ اب تک قریب آچکی تھی۔

"کشمالہ......" اس نے تھوک نگلا۔

"کیف......" وہ سپاٹ سی لگ رہی تھی۔ اس کے عین مقابل آ کے رکی۔

"بیٹھو۔" اس نے سامنے رکھے سنگل صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ٹانگ پہ زور ڈالے ہوئے تکلیف شروع ہونے لگی تھی۔

"میں زیادہ دیر بیٹھنے نہیں......"

"بیٹھو۔" وہ قدرے زور سے بولا۔ ضبط سے مٹھی بھینچ لی۔ چہرے پہ تکلیف تھی۔ وہ زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور اس کے بیٹھنے سے پہلے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

"تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟" وہ سنجیدگی سے کہتی سامنے بیٹھی۔ ماہر نے واپس بیٹھتے ہوئے

فرصت سے بیرئل کو دیکھا۔

"یقیناً میرے بھائی نے......"

"اوہ میں اس کا بھائی نہیں ہوں۔ میں ایک کیئر ٹیکر نرس ہوں۔ صرف نرس۔" وہ طنز سے کہتا ایک دم اٹھا اور ہونہہ میں سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا۔ ماہر نے بہت ضبط سے اسے دور جاتے دیکھا۔ اس کی خبر وہ بعد میں لے گا۔ اب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

کہاں سے بات شروع کرے؟

بات ختم کہاں ہوئی تھی؟

"تمہاری امی کے لیے......" الفاظ ادھورے چھوڑ دیے۔ "آئی ایم سوری۔"

"شکریہ۔ تین ماہ ہو گئے اس بات کو۔" اس کے انداز میں کچھ جتاتا ہوا سا تھا۔

"میں آنا چاہتا تھا لیکن......" اس کی نظریں اپنے قدموں پہ جھکی۔ نامحسوس انداز میں بیساکھی مزید پیچھے دھکیلی۔ "لیکن کچھ کام میں پھنس گیا تھا۔"

"آنا چاہیے تھا۔ ماں سے اتنا تعلق تو تھا تمہارا۔" اس کی آواز میں گلہ تھا۔ غصہ بھی۔

ماہر نے استعجابیہ ابرو اٹھائے۔

"اوہ۔ یعنی تم نے میرا انتظار کیا۔"

"میں کیوں انتظار کروں گی؟ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن معید اور ماہی سے تو تمہارے اچھے تعلقات ہیں۔" اچھے پہ زور دیا۔

ماہر نے کندھے اچکائے۔

"کیونکہ وہ دونوں سینس ایبل ہیں۔ دل سے نہیں دماغ سے سوچتے ہیں۔ جلد معاف کر دیتے ہیں۔"

وہ چند لمحے اسے گھورتی رہی۔ آنکھیں چھوٹی کر کے جیسے اس کی روح کے اندر اترنا چاہ رہی ہو۔ کچھ تھا جو اس کے انداز میں نیا تھا۔ جیسے کسی بات کا نیا غصہ ہو۔

"میں نے بھی کوشش کی۔ تمہیں معاف کرنے کی۔ تمہارا یقین کرنے کی لیکن ہر دفعہ تمہارا ایک اور فریب سامنے آ جاتا ہے۔ ماہر فرید کی ذات کا ایک اور خفیہ پہلو۔ اور بس۔ سب ختم ہو جاتا ہے۔"

"ویری انٹرسٹنگ۔ یعنی تم میرا یقین کرنے کی کوشش کرتی ہو؟" اس نے گزرتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کیا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں صرف بات کرنے آئی ہوں۔" وہ فوراً سے بولی۔

"جانتا ہوں۔ اپنے لیے منگوا رہا ہوں۔" بے نیازی سے قریب آئے ویٹر کو دیکھا۔

"میری ریگولر کافی۔" اس کا انداز اب سپاٹ ہو چکا تھا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر کوئی نئی فرد جرم لے کر آئی ہے۔

"اس دفعہ کیا کیا ہے میں نے 'کشمالہ بی بی؟"

پیچھے کو ٹیک لگائی اور ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلا لیا۔ ایک ٹانگ دوسری پہ جمالی۔ یہ کم تکلیف دہ پوسچر تھا۔

"تم نے کہا تم اپنی بہن کو ڈھونڈنے کے لیے میری زندگی میں آئے تھے اور میں اس بات پہ یقین کرنے لگی تھی کہ......" اس نے ایک کاغذ جیکٹ کی جیب سے نکال کے اس کے سامنے کیا۔

ماہر نے ہاتھ بڑھا کے کاغذ لیا اور اس کی تہیں کھول کے دیکھا۔

"یاد ہے یہ کیا ہے؟"

"ان جنکشن" وہ ایک دم ہنس پڑا اور کندھے اچکائے۔ "ایک طرح کا ریسٹرینگ آرڈر۔ یہ جس زمانے کا ہے تب بہت سے لوگوں نے میرے خلاف ایسے کورٹ آرڈرز لیے تھے۔"

مگر وہ نہیں ہنسی۔ وہ اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ صبرینہ کی فیملی نے لیا ہے۔ وہ لڑکی جو تمہارے سوتیلے باپ کے ساتھ ایکسیڈنٹ میں ماری گئی تھی۔"

"ہاں۔ ان دنوں بہت سے لوگوں کو مجھ سے

خطرہ تھا۔‘‘ وہ پھر سے ہنس دیا۔ ’’کیا تم نہیں جانتیں؟ میں ایک سائیکو پیتھ مشہور ہوں۔ استنبول، دوہا، لندن...... جہاں جہاں میں رہا ہوں، وہاں سب جانتے ہیں۔‘‘ اس کے انداز میں ڈھٹائی تھی۔

’’تم اس لڑکی کے گھر والوں کو ہراس کر رہے تھے؟‘‘

’’ویل......‘‘ اس نے کندھے اچکائے۔ ’’میں اس کو ہراس منٹ نہیں کہوں گا۔ میں صرف..‘‘ کھنکھارا۔ ’’کچھ سوالات پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ ہراساں ہو گئے۔ کسی کے خلاف انجنکشن لینا لندن میں عام سی بات ہے۔‘‘ مسکرا کے کاغذ میز پہ رکھا۔

’’اس میں فریب کیا ہے؟‘‘

’’سبرینہ زیاد کی منگیتر تھی۔ اور تم اس کا تعاقب کر رہے تھے جیسے میرا تعاقب کرتے تھے۔‘‘

چند لمحے کے لیے وہ کچھ بول نہیں سکا۔ پھر ایک دم بازو نیچے کیا اور ٹانگ ٹانگ سے ہٹا کے سیدھا ہو بیٹھا۔ کاغذ دوبارہ کھول کے دیکھا۔ اس کی رنگت بدلنے لگی۔

’’تم کچھ بھی اپنی بہن کے لیے نہیں کر رہے تھے۔ تم یہ سب زیاد کی وجہ سے کر رہے تھے۔ تم ہمیشہ مجھے زیاد کے خلاف کرتے تھے۔ تمہیں اس سے شاید کوئی ذاتی مسئلہ ہے کیف! میں سمجھ ہی نہیں سکی۔ تم میری زندگی میں تب آئے جب زیاد میری زندگی میں آیا۔ تم زیاد سے جڑی ہر لڑکی کا پیچھا کرتے ہو۔ یہ ہے تمہارا اور میرا کنکشن جسے میں پہلے سمجھ نہیں سکی۔‘‘

وہ ابھی تک اس کاغذ کو پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے چونک جانے والے انداز میں چہرہ اٹھایا۔

’’نہیں۔‘‘

’’کیا تم......‘‘

’’نہیں۔ سبرینہ زیاد کی منگیتر نہیں تھی۔‘‘ وہ تیزی سے بولا۔

مالا نے گہری سانس لی اور پیچھے کو ہو کے بیٹھی۔ بازو سینے پہ لپیٹ لیے۔ آنکھوں میں بس افسوس تھا۔

’’ہر دفعہ یہی ہوتا ہے۔ تمہارا ایک نیا فریب کھلتا ہے اور میں اسے تمہارے سامنے رکھتی ہوں تو تم نہ جاننے کی اداکاری کرتے ہو۔ جیسے تم نے میرا ریستوران نہیں خریدا۔ جیسے تم نے کیف کو دھمکایا نہیں۔ جیسے تم جانتے ہی نہیں کہ سبرینہ زیاد کی منگیتر ہے۔‘‘

’’سبرینہ کی کسی سے منگنی نہیں ہوئی تھی۔ اگر زیاد اس کو اپنی منگیتر کہتا ہے تو وہ جھوٹ بول رہا ہے۔‘‘ اس کا انداز قطعی تھا۔

’’تم ہمیشہ مجھے زیاد کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم میری ماں کی موت پہ نہیں آئے لیکن تم زیاد اور میری شادی سے چند دن پہلے یہاں آ گئے ہو۔ تم زیاد سے کسی چیز کا انتقام لے رہے ہو شاید۔ کیا مسئلہ ہے تم دونوں کا؟‘‘

’’اوہ......‘‘ اس کے لب اوہ میں سکڑے۔ ایک افسوس بھری سانس خارج ہوئی۔

’’اسی لیے تم یہاں آئی ہو۔ تمہیں ڈر ہے کہ میں تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا۔ یا کوئی مسئلہ پیدا کروں گا۔‘‘ اب کے وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں اذیت تھی۔ اداسی تھی۔

’’تم واقعی مجھے نہیں جانتیں۔ چچ۔‘‘ افسوس سے سر نفی میں ہلایا۔

’’میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ......‘‘

’’اب تک میں تمہاری سنتا آیا ہوں۔ اب میری سنو۔‘‘ وہ آگے کو جھکا اور غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

’’میں نے تمہیں یہاں نہیں بلایا۔ تم خود آئی ہو۔ کیونکہ تم مجھ سے خوف زدہ ہو۔ حالانکہ تمہیں اس شخص سے خوف زدہ ہونا چاہیے جس سے تم شادی کرنے جا رہی ہو۔ وہ ایک نارسیسٹ، فریب کار اور جھوٹا انسان ہے۔ وہ تمہیں ہرٹ کرے گا، کشمالہ۔ اور وہ تمہیں بہت ہرٹ کرے گا......‘‘

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

"لیکن میں تمہیں اس سے شادی سے منع نہیں کروں گا۔ یہ تمہاری غلطی ہے تاتو میں تمہیں تمہارے حصے کی غلطی کرنے دوں گا۔ کیونکہ یہ میرا مقام نہیں ہے کہ میں کسی کے فیصلے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کروں۔ تم جس سے بھی شادی کرو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اور میں تمہیں سمجھاؤں گا بھی نہیں۔ کیونکہ ابھی تم کچھ نہیں سمجھو گی۔ تمہارے اوپر زیاد سلطان کا spell (جادو) چڑھا ہوا ہے۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔

"محبت جادو نہیں ہوتی۔" اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

" curse (بددعا) کہہ لو۔ اور یہ curse تمہیں کچھ سننے نہیں دے گی۔ اس لیے میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ لیکن......" اس نے مٹھی بند کی اور انگوٹھا نکال کے اوپر کیا۔

"پہلی بات...... سبرینہ زیاد کی منگیتر نہیں تھی۔ زیاد نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔"

"وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ سارا خاندان جانتا ہے وہ اس کی منگیتر تھی۔"

"دوسری بات......" اس نے زور دے کر کہا جیسے اس کی بات سنی نہ ہو۔ اور ایک انگلی مزید بند مٹھی سے نکالی۔

"میں تمہاری زندگی میں اپنی بہن کے لیے آیا تھا۔ غلط کیا۔ بہت غلط کیا اور یہی میری سزا ہے۔ لیکن میں اپنی بہن کے لیے ہی آیا تھا۔ اور گو کہ میں جانتا ہوں کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ بلکہ ماہ جبینہ کچھ جانتی ہے جو میری مدد کرے گی۔ اسے خود بھی نہیں معلوم کہ کیا...... لیکن وہ کچھ جانتی ہے۔ اور یہ الگ ہے۔ وہ میری مدد شاید کر سکے۔ شاید نہ کر سکے۔ لیکن......"

اس کی آواز مدھم ہوئی۔ ایک سرگوشی کے جیسی۔

"ایک بات میں جانتا ہوں۔ پہلے دن سے...... جب میں نے تمہاری نوکری کی تھی۔ اور میں نے آج تک کسی انسان کی نوکری نہیں کی کشمالہ۔ صرف تمہاری کی۔ میں نے کسی کی گاڑی کے دروازے نہیں کھولے۔ سوائے اپنے باپ کے۔ لیکن تمہارے لیے میں نے سب کچھ کیا۔"

"Mighty Mahir Farid" وہ بڑبڑائی۔

"کیونکہ میں پہلے دن سے جانتا تھا کہ تم میری بہن کو ڈھونڈ سکتی ہو۔ صرف تم۔ میں بھی انسانوں کے بارے میں غلط نہیں ہوتا۔ اس کو وائب کہو یا وجدان۔ میں تب بھی جانتا تھا اور اب بھی۔ تم میری بہن کو بچا سکتی ہو۔"

وہ جہاں تھی، وہیں ٹھہر گئی۔ آنکھیں حیرت سے چھوٹی ہوئیں۔ اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

"تم ہلال کو نہیں جانتیں۔ لیکن پھر بھی تم اس کو ڈھونڈ سکتی ہو۔ صرف تم۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ پہلی دفعہ اسے لگا ماہر کی بھوری آنکھوں میں کچھ گلابی سا ابھرا تھا۔

گلابی نمی۔

وہ پلک نہیں جھپکا سکی۔ ویٹر نے کپ کافی لا کے سامنے رکھی، ان دونوں کو علم نہ ہو سکا۔

"ہلال اس اکتوبر گیارہ سال کی ہوئی ہو گی۔ وہ بہت...... بہت پیاری ہے۔ بہت اسمارٹ۔"

وہ ابھی تک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ہاں وہ نمی تھی۔ اس کی آواز میں بھی وہی نمی تھی۔ گیلا سا کچھ۔

"تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ جانتا ہوں۔ کرتی رہو۔ ساری عمر کرتی رہو۔ لیکن تم ہلال کو نہیں جانتیں۔ وہ بہت پیاری ہے۔ وہ میری زندگی میں آنے والی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اور وہ مجھ سے کھو گئی ہے۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ میں نے خوف کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ تم نہیں جانتیں کشمالہ بین کہ وہ وقت کیسا ہوتا

ہے جب انسان کو وہ آوازیں سنائی دیں جو ہوتی نہیں ہیں۔ وہ چہرے دکھائی دیں جو وجود نہیں رکھتے۔"

مالا لمحے بھر کے لیے پلک جھپکنا بھول گئی۔

"وہ میری وجہ سے کھوئی تھی۔ لیکن وہ مری نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اور وہ کہیں چھپی ہوئی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ میں یہاں محسوس کر سکتا ہوں۔" اس نے سینے پہ انگلی رکھی۔ پانی ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھا۔

وہ پلک تک نہیں جھپک پا رہی تھی۔

"اس کو مدد چاہیے۔ میری مدد۔ تمہاری مدد۔ وہ اکیلی ہے۔ لیکن وہ خوف زدہ نہیں ہے۔ وہ بہت بہادر ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ہلال اور میں ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن......" اس نے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچی۔ "لیکن میں تم سے صرف ایک بات چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں منت تھی۔

وہ واقعی پلک تک نہیں جھپک پا رہی تھی۔

"صرف ایک بات۔ تمہیں جب بھی موقع ملے جب بھی......" اس نے زور دیا۔ پھر سے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچی۔ "تو تم ہلال کی مدد ضرور کرو گی۔ ہلال وہ فاختہ ہے جس میں میری جان ہے اور تم اس کو اس جادوگر کی قید سے ضرور نکالو گی۔ میرے کیے کی سزا تم ہلال کو نہیں دو گی۔ کیا تم میرے لیے صرف اتنا کر سکتی ہو؟"

وہ خاموش ہوا۔ پھر گہرے سانس لیتا دائیں طرف دیکھنے لگا۔ آنکھیں جھپکائیں جیسے نمی کو گرنے سے پہلے واپس اندر کھینچنا چاہتا ہو۔

"میں نے تمہارے کیے کی سزا تمہیں نہیں دی تو اس کو کیا دوں گی؟" اس نے خود کو کہتے سنا۔ وہ ابھی تک اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کیف کی آنکھوں کو ایسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"اگر تم مجھے ہلال سے ملا سکو تو میں بدلے میں تمہارے لیے وہ کروں گا جو تم چاہتی ہو۔"

مالا کے ابرو اچنبھے سے بھنچے۔ کوئی فسوں سا ٹوٹا۔

"مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔"

"ناں ناں کشمالہ بی بی۔ ناں۔" اس نے ایک دم ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ "ہم انسان ہیں۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی۔ زندگی میں تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے ہوگا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم جو کہو گی میں وہ کروں گا۔ کوئی بھی ایسا کام جو ممکن یا ناممکن ہو، پیسے سے ہو یا ہاتھوں کی کوشش سے، میں اسے کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی ہو۔"

"مجھے کبھی تمہاری ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ دھیرے سے کہتے ہوئے اٹھی۔ بیگ اٹھا کے کہنی پہ رکھ لیا۔ ایک آخری نظر اس پہ ڈالی۔

"میں زیاد کے ساتھ خوش ہوں۔ اور صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم مجھے سکون سے میری نئی زندگی شروع کرنے دو۔"

ماہر نے سر کو اثبات میں خم دیا۔ ملاقات ختم ہو چکی تھی۔ وہ پلٹی اور آگے بڑھ گئی۔ تبھی وہ پیچھے سے بولا۔

"سبرینہ زیاد کی منگیتر نہیں تھی۔ چاہو تو سبرینہ کی فیملی سے پوچھ لو۔" اس نے عقب سے پکارا اور کتاب اٹھا لی۔ مالا کے قدم لمحے بھر کے لیے زنجیر ہوئے لیکن پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ اسے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھنا تھا۔ وہ نمک کا مجسمہ بننے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی۔

لفٹ کے دروازے کھلے اور وہ اندر داخل ہی ہوئی تھی کہ کوئی اس کے ساتھ سوار ہوا۔ اس نے مال کے فلور کا بٹن دبایا اور گردن موڑی۔ ہیرمل فرید ساتھ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کے مسکرایا۔

"ہیلو۔"

اس نے سر کو اثبات میں خم دیا اور سینے پہ بازو لپیٹے سامنے دیکھنے لگی۔ دھاتی دروازوں میں ان دونوں کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

"ماہر نے آپ کو یہاں نہیں بلایا تھا۔ میں نے بلایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ لوگ مل کے بات

کرلیں۔"
"جانتی ہوں۔" اس نے کن انکھیوں سے اس کا عکس دیکھا۔ اس نے اس نوجوان کو کہیں دیکھ رکھا تھا۔ پچھلی دفعہ بھی یہی لگا تھا۔ شاید گزرے برسوں میں کہیں دیکھا ہو۔ اسے یاد نہ تھا۔
"آپ کو شادی مبارک ہو۔ اور ہماری پروا مت کریں۔ ہم دونوں بس اپنی بہن کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"
اس نے کچھ نہیں کہا۔ لفٹ اوپر جا رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی سے کٹے۔
"کیا وہ بیمار ہے؟"
ہیرِ مل چونکا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔
"بیمار؟"
"وہ تکلیف میں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ زخم کا نشان بھی تھا۔ کچھ ہوا ہے کیا؟"
اس کی آواز دھیمی تھی۔
"اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ آپ کی امی کی ڈیتھ کے دنوں میں۔ وہ پاکستان آنا چاہتا تھا لیکن آ نہیں سکا۔ اس کی ٹانگ بہت بری طرح ٹوٹ گئی ہے۔ اب بھی وہ ہلال کی وجہ سے یہاں آیا ہے۔ کسی...... کسی سے ملنا تھا ہمیں۔"
مالا نے بس سر ہلا دیا۔ کہا کچھ نہیں۔ لفٹ کے دروازے کھلے۔
"لیکن وہ تکلیف میں نہیں ہے۔" وہ باہر نکل رہی تھی جب ہیرِ مل پیچھے سے بولا۔
اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔
"کیونکہ تکلیف میں ہونے کے لیے انسان کے سینے میں دل کا ہونا ضروری ہے اور ماہر بے ایک روبوٹ ہے۔ دل وغیرہ نہیں ہے اس کا۔" ہیرِ مل نے مسکرا کے کندھے اچکائے۔
وہ ایک دم ہنس دی۔ پھر کچھ کہے بنا آگے بڑھ گئی۔
وہ اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔
اگلے چند گھنٹے کے لیے اسے غائب ہو جانا چاہیے تھا۔ فی الحال وہ ماہر کا سامنا کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر آئی تو خاموش خاموش سی تھی۔ طبیعت پہ عجیب سا بوجھل پن تھا۔
(وہ ایک نارسیسٹ ہے۔ فریب کار اور جھوٹا شخص۔ وہ آپ کو ہرٹ کرے گا اور وہ آپ کو بہت ہرٹ کرے گا۔)
(وہ ایک نفسیاتی مریض تھا جو سبرینہ کے پیچھے پڑا تھا۔)
(محبت میں کوئی سیلف ریسپیکٹ کوئی باؤنڈری نہیں ہوتی۔)
(ہلال وہ فاختہ ہے جس میں میری جان ہے۔ اور تم اسے اس جادوگر کی قید سے ضرور نکالو گی۔)
اس کے ذہن میں بہت سا شور تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں آئی اور اپنے کھلے ہوئے بیگز کے ساتھ بیٹھ گئی۔
"دو دن رہ گئے ہیں نکاح میں اور ابھی تک اتنا کچھ رہتا ہے سمیٹنے والا۔" ماہی بہت سے شاپنگ بیگز لیے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے یونہی بیٹھے دیکھ کے ٹھٹک گئی۔
"تمہیں کیا ہوا؟"
"ماہی! میں ٹھیک کر رہی ہوں؟ زیاد سے شادی کر کے؟" اس نے عجیب الجھن سے سوال کیا۔
"یار...... یہ نکاح سے پہلے کا ڈپریشن سب لڑکیوں کو ہوتا ہے۔ رونا بھی آتا ہے اور خوف بھی۔ تم بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔ خالہ کی باتوں کو بھول جاؤ۔ وہ امریکہ میں رہتی ہیں۔ ان کو کیا پتا۔" وہ بیڈ کے کنارے پہ بیٹھی اور سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "زیاد میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ویسے بھی جب بھی کسی کا کسی سے رشتہ ہو آدھا خاندان خلاف ہی ہوتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

مالا نے ایک نظر اپنے خالی بیڈ کو دیکھا۔
"ماں ہوتیں تو بتاتیں کہ کیا کرنا ہے۔"
ایک ہوک سی دل سے نکلی۔
"ماں ثمینہ آنٹی کو پسند کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں' وہ زیاد اور تمہارے رشتے پہ خوش تھیں۔ یاد ہے نا؟"
اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سر اثبات میں ہلا دیا۔
"ہاں۔ وہ خوش تھیں۔"
"پھر ماں پہ بھروسا کر کے شادی کرلو۔"
وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔
"چلو پیکنگ کرتے ہیں۔" اس کا دل ہلکا پھلکا سا ہو گیا۔ ساری کلفت' بوجھل پن' سب ہوا ہو گیا۔
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہت سلیقے سے تمام اشیاء بیگز اور کارٹن میں رکھتی نظر آرہی تھیں۔ تب ہی وہ ایک خیال کے تحت اٹھی اور الماری سے ایک باکس نکال کے لائی۔ ماہی نے حیرت سے اس سرمئی خالی باکس کو دیکھا۔
"خالی باکس کیوں رکھ رہی ہو؟"
کشمالہ بیبن نے آنکھیں اٹھا کے اپنی بہن کو دیکھا۔ پھر جب وہ بولی تو اس کی آواز میں بہت سے قصے دفن تھے۔
"ہونا چاہیے۔ خالی باکس ہمیشہ ساتھ ہونا چاہیے۔"
☆☆☆
ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں ناشتے کی خوشبو پھیلی تھی۔ سن روف سے آتی روشنی نے سارے کو منور کر رکھا تھا۔ کچھ فاصلے پہ رکھی میز کرسیوں پہ بیٹھے مہمان ناشتے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں بھی ایک میز پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ رات جب ڈھیر ساری آوارہ گردی کے بعد ہیزل واپس آیا' تو خلاف توقع ماہر نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ نہ کوئی سوال۔ نہ کوئی حساب۔
"کل اس کی شادی ہے۔" ہیزل اپنی پلیٹ پہ جھکا ڈھیرے سے بولا۔ "میں تمہاری جگہ ہوتا تو......"
ماہر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔
"کیا کرتے؟"
"جس لڑکی سے محبت کرتا' اس کی شادی رکنے کے لیے جنگ برپا کر دیتا۔"
"یعنی تمہیں ہر تیسرے مہینے ایک جنگ برپا کرنی پڑتی۔"
ہیزل نے خفگی سے نظریں اٹھائیں۔
"ابھی تک مجھے کسی سے ٹھیک سے محبت نہیں ہوئی۔ جب ہوگی تو سارے زمانے کو پتا چل جائے گا۔"
"جو محبتیں تمہیں ابھی تک ہوئی ہیں' ان کا پتا میرے بینک بیلنس کو لگ چکا ہے۔" ایک برہم نظر اس پہ ڈال کے وہ اپنی کافی میں دودھ انڈیلنے لگا۔ سفید دھار سیاہ مائع میں اتری جا رہی تھی۔ دھواں سا کپ کے اوپر اٹھ رہا تھا۔
"حیرت ہے تم مجھ سے خفا نہیں ہوئے۔" بالآخر وہ کہہ اٹھا۔ ماہر کل شام کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ اسے اب بے چینی ہونے لگی تھی۔
"تم آزاد انسان ہو۔ اپنے فیصلے خود لے سکتے ہو۔ تم نے اسے بلایا۔ تمہاری مرضی۔" اس نے بے نیازی سے کافی کا کپ لبوں سے لگایا۔ ہیزل نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اسی انداز میں کہہ رہا تھا۔
"اسی طرح میں بھی ایک آزاد انسان ہوں' ہیزل! میں اپنے فیصلے خود لے سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے ماہانہ الاؤنس (جیب خرچ) کا نصف حصہ چیریٹی میں جانا چاہیے۔" نگاہیں اٹھا کے اسے گھورا۔
"اس ٹیکو ای" اور ٹھک سے چینی دان میز پہ رکھا۔
ہیزل فرید کے ہاتھوں کے توتے ایک ہی جست میں اڑ گئے۔

Scanned with CamScanner

"نہیں نہیں۔ پلیز۔" اس کی رنگت فق ہوئی۔ "میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کے نہیں کیا۔ میں نے اسے بھی بتادیا تھا۔ سوری ماہر! پلیز۔" اسے ناشتہ کافی سب بھول گیا تھا۔

تب ہی موبائل بجنے لگا۔ اس نے بے زاری سے دیکھا۔

"تم نے اپنا موبائل آف کر رکھا ہے اور مالک صبح سے مجھے کالز کیے جارہا ہے۔ کن روبوٹس میں پھنس گیا ہوں میں؟"

"میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے اسے زیاد سلطان کے بارے میں معلومات لینے کے لیے کہا تھا۔ اگر وہ واقعی سبرینہ کا منگیتر تھا تو مالک کو معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے گھونٹ بھرنے لگا۔

"کیا ہے مالک؟" ہیرنل نے برا سا منہ بنا کے کال اٹھائی۔

اگلے ہی لمحے اس کے تاثرات بدلے۔ کانٹا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"کیا ہوا؟" ماہر نے چونک کے اسے دیکھا۔ کچھ تھا جو فضا میں ساکن ہو گیا تھا۔

ہیرنل نے دھیرے سے فون نیچے کیا۔

"ہمیں اسلام آباد جانا ہوگا۔" اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔

"کیوں؟"

"تمہیں یاد ہے...... اسلام آباد پولیس کے پاس ہلال کا کیس تھا پچھلے دو سال سے۔ انہیں کچھ ملا ہے۔"

"کیا؟" اس کا سانس رک گیا۔

"ہلال کی لاش۔"

ماہر فرید تیزی سے اٹھا۔ کافی کا کپ نیچے گرا۔ کانچ کے ٹکڑے اور گرم مائع دور تک بکھرتے گئے۔

☆☆☆

(ہر سانس کے ساتھ کھو جاتا ہے گزرا ہوا لمحہ)

سبز گھاس پہ ہر طرف سفید پھولوں کے ستون بنے تھے۔ ان کے درمیان چھوٹا سا اسٹیج تھا اور آس پاس کرسیوں کے پھول بچھے تھے۔ اسٹیج ابھی خالی تھا۔ ہر طرف مہمان نظر آرہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور سرما کی میٹھی دھوپ سارے میں پھیلی تھی۔ کام دار لباس میں مسکرا مسکرا کے چلتی ہوئی ماہی ہر ایک سے مل رہی تھی۔ مہمان آنا شروع ہو چکے تھے۔

(اور شروع ہوتا ہے ایک نیا لمحہ۔)

کاریڈور میں بیساکھی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ وہ سفید چہرے کے ساتھ لنگڑا کے چلتا آگے بڑھ رہا تھا۔ ہیرنل بھی شل سا اس کے ساتھ تھا۔ ساتھ موجود چلتا ہوا آفیسر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ ایک جلی ہوئی لاش تھی جو دو برس پہلے ملی تھی۔ انہی تاریخوں میں جب ہلال کھوئی تھی۔ ہم نے پہلے اس پہ نظر نہیں کی لیکن ایک آفیسر اس دن آرکائیوز میں کچھ تلاش کر رہا تھا جب اسے لاش کے ساتھ ملنے والی چیزیں دکھائی دیں۔ ہم ان کی تصاویر مالک صاحب کو بھیجیں تو انہوں نے ان کو پہچان لیا۔ بچی کی عمر نو سال کے لگ بھگ تھی۔"

"آج وہ گیارہ سال کی ہوتی۔" وہ بڑبڑایا۔

(ہم سانس اندر کھینچتے ہیں۔
اور اسے باہر خارج کر کے
ماضی کے لمحے کو چھوڑ دیتے ہیں)

اب وہ دونوں اسٹیج پہ بیٹھے تھے۔ اس نے سفید پشواز کے اوپر سفید کام دار دوپٹہ لے رکھا تھا۔ چوڑی دار آستینوں کے آگے ہاتھوں پہ مہندی لگی تھی۔ اس کے کانوں اور گردن میں نازک ہیرے پروئے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے ہیرے کی انگوٹھیوں سے سجے ہاتھ سے ایک کاغذ پہ دستخط کر رہی تھی۔ چہرے پہ اطمینان تھا۔ زیاد نے دستخط کیے اور ہر طرف مبارک بادیں گونجیں۔ دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھے۔

(اب وہ گزرا لمحہ ہمارے لیے فنا ہو چکا ہے۔)

"میں نہیں مانتا۔" ہیرنل دبا دبا سا چلایا تھا۔ وہ

تینوں اس وقت ایک آفس میں بیٹھے تھے۔

"جلی ہوئی لاش کا مطلب ہے کسی نے ہلال کے اغوا کو کور اپ کیا ہے۔ ہم قبر کی کھدوائی کروائیں گے۔ ڈی این کروائیں گے۔ وہ ہلال نہیں ہوگی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ہے نا ماہر؟" اس نے گردن موڑ کے اسے دیکھا جو سر جھکائے کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں زپ لاک بیگ پہ جمی تھیں جس میں مختلف اشیاء تھیں۔

"ہے نا ماہر؟"

"آئس ہر" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ نیرجل کا سانس رکنے لگا۔

(اور یہ کرتے ہوئے
ہم فنا کر دیتے ہیں
اس انسان کو
جو ہم ایک لمحہ پہلے تھے۔)

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ زیاد سلطان سیاہ لباس میں تھا اور وہ سفید میں۔ وہ دونوں کیمرا کو دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ سامنے کھڑی ماہی ان کی تصاویر کھینچ رہی تھی۔ ایک طرف وہیل چیئر پہ بیٹھی نگینہ بیگم بھی مسکرا کے ان کو دیکھ رہی تھیں۔ زیر لب وہ کچھ پڑھ بھی رہی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔

(ہم سانس اندر کھینچ کے
نئے لمحے میں سانس لے کر
اس شخص کا استقبال کرتے ہیں
جو ہم بننے جا رہے ہیں۔)

ماہر نے بے جان ہاتھوں سے زپ لاک بیگ اٹھایا۔ اس کے اندر کچھ چیزیں تھیں۔ دو سال پہلے ایوی ڈینس ملنے کی تاریخیں بھی لکھی تھیں۔ ان پہ گرد بھی تھی جیسے وہ پرانے باکس سے نکالی گئی ہوں۔ ایک بریسلیٹ۔ لباس کے جلے ہوئے ٹکڑے۔ ننھا سا پرس۔

اور ایک سینٹڈ کینڈل۔

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کینڈل کا جار نکالا۔ اسٹرابری۔

اس نے ڈھکن کھولا۔ ایک اداس سی خوشبو سفید موم سے نکل کے سارے میں پھیلنے لگی۔

"یہ ہلال ہے۔" اس کی آواز شکست خوردہ سی تھی۔

(اور یوں ہم تمام عمر
اسی عمل کو دہراتے رہتے ہیں۔)

زیاد اس کا ہاتھ تھامے اسے لاؤنج سے کمرے تک لا رہا تھا۔ لاؤنج میں آج پھر بہت ہلکی روشنی تھی۔ گھر میں کوئی بتیاں بھی نہیں جلائی گئی تھیں۔ اس نے مسکرا کے سر جھٹکا۔ اسے اس سب کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرہ اندر پھولوں سے سجا تھا۔

سفید اور سرخ پھول۔

ہر طرف خوب صورتی تھی اور ایک نئے مستقبل کا آغاز۔

(یہی مراقبہ ہے۔)

"آپ چاہیں تو ہم قبر کھدوا سکتے ہیں۔ لاش کے دانتوں سے ہم......"

"ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہلال ہے۔" اس نے کینڈل کا ڈھکن بند کیا۔

"یہ اسی کی چیزیں ہیں۔" اس نے چہرہ اٹھایا تو وہ برسوں کا بیمار لگتا تھا۔

"ماہر ہمیں ڈی این اے تو کروانا چاہیے۔" نیرجل نے بے بسی سے اس کی کہنی جھنجوڑی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ روم ۵۵۵ میں بھی ایسا بیمار نہیں لگا تھا جیسے آج لگ رہا تھا۔

ایسے جیسے شاک میں ہو۔

"ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کی قبر کے ساتھ یہ بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا۔ اٹھو۔ ہم استنبول واپس جا رہے ہیں۔" اس نے زپ لاک میں چیزیں واپس ڈالیں اور اسے اتنی سختی سے پکڑا کہ ہاتھ کی رگیں ابھر آئیں۔

"میری تلاش ختم ہوئی۔"
(یہی تجدید ہے۔)

وہ اس کے سامنے بیڈ کے کنارے پہ بیٹھا تھا۔

مالا نے مسکرا کے ہاتھ آگے کیا۔ اور اس نے مخملیں ڈبیا سے ایک انگوٹھی نکالی۔ چوکور چمکتا ہوا نگینہ چمکا۔

"یہ وہی ڈائمنڈ رنگ ہے۔ میں نے اسے آپ کے لیے خرید لیا تھا۔ کیونکہ یہ بہترین تھی۔"

اس نے انگوٹھی مالا کی انگلی میں پہنائی۔ مالا نے مسکرا کے ہاتھ اونچا کر کے روشنی میں انگوٹھی کو دیکھا۔

اگلے ہی لمحے کشمالہ مبین کی مسکراہٹ مدھم ہوئی۔ اس نے چونک کے زیاد کو دیکھا۔ پھر انگوٹھی کو۔ زیاد مسکرا کے کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ ایک نئی زندگی کے خواب۔ مستقبل کی باتیں۔ لیکن وہ صرف انگوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔

کمرے کی مدھم روشنیوں میں بھی وہ بتا سکتی تھی کہ......

یہ ہو بہو اس چوکور ہیرے جیسا نگینہ زرقون تھا۔

ہیرا نہیں۔

یہ انگوٹھی نقلی تھی۔

(یہی زندگی ہے۔)

☆☆☆

بیڈروم میں لگے پھولوں کی چتیاں مرجھا گئی تھیں اور خوشبو باسی ہو گئی تھی۔ دروازہ نیم وا تھا اور لاؤنج سے خوش گپیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ماہی کا قہقہہ سب سے اونچا تھا۔

عباد اور ماہی ان کا ناشتہ لائے تھے۔ معید کی حسب توقع کال تھی اور وہ شادی کے لیے اتنی چھٹی لے چکا تھا کہ اب اسے وارڈ میں واپس پہنچنے کی جلدی تھی۔ فی الحال وہی دونوں اس کے میکے کی نمائندگی کر رہے تھے۔ نگینہ بیگم بھی باہر ہی بیٹھی خوش گوار محفل کا حصہ بنی ہوئی تھیں۔ زیاد کی بھی ہنس کے کوئی قصہ سناتی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

صرف وہی تھی جو اندر تھی۔

سنگھار میز کے سامنے بیٹھی وہ آئینے میں جھلکتے اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کمرے میں کچھ لینے آئی تھی۔ پھر یہیں بیٹھ گئی۔ اس نے جھیل کے رنگ کی سبز کام دار لمبی قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھے پہ دوپٹہ تھا۔ کانوں میں سونے کے ننھے سے ٹاپس تھے۔ اور چہرے پہ ایسی سوچ تھی جس نے لباس کی چمک کو گہنا دیا تھا۔

"کیا اسے زیاد سے پوچھنا چاہیے؟" اس نے ہاتھ اٹھا کے اونچا کیا۔ تیز روشنیوں میں انگوٹھی کا نگینہ چمکا۔ ہیرے جیسا۔ لیکن وہ ہیرا نہیں تھا۔ وہ زرقون تھا۔ اس کی چمک ہوا لگتے ہی ماند پڑنے لگی تھی۔

"شاید زیاد کے ساتھ کوئی دھوکہ ہو گیا؟ شاید کسی دوسرے جیولر نے اس سے ڈائمنڈ کی قیمت لے کر زرقون بیچ دیا ہو؟ اونہوں۔" اس نے سر جھٹکا۔ اس کے جیولر سے زیاد نے جتنے سوالات پوچھے تھے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے بنا سرٹیفکیٹ کے ڈائمنڈ خرید لیا ہو۔ وہ بھی اتنا مہنگا؟

"کہاں رہ گئی ہو؟" ماہی مسکراتی ہوئی چوکھٹ میں آئی تو وہ چونکی۔ پھر جلدی سے مسکراہٹ چہرے پہ طاری کی اور برش اٹھا لیا۔

"بس آ رہی ہوں۔" آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ برش جلدی جلدی پھیرنے لگی۔ حالانکہ بال پہلے ہی بلوڈرائی سے سیٹ تھے۔

"ارے واہ۔ یہ زیاد نے دی ہے انگوٹھی؟" نگینے کا سائز دور سے ہی ماہی کی آنکھوں میں چمکا۔ وہ چہک کے قریب آئی۔ مالا نے بجلی کی تیزی سے ہاتھ نیچے کیا لیکن ماہی لپک کے آئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چونک کے مالا کو دیکھا۔

"یہ تو زرقون ہے۔" وہ الجھ گئی۔ "ڈائمنڈ رنگ نہیں دی؟ تم لوگوں نے تو کوئی ون کیرٹ پسند کیا تھا۔ نہیں؟"

مالا نے تیزی سے ہاتھ چھڑایا۔

"ہاں لیکن میں اتنی مہنگی انگوٹھی کے حق میں نہیں تھی۔ میں نے خود زیاد سے کہا کہ زرقون لے لیں۔ ڈائمنڈ یا اتنے پیسے کون خرچ کرے۔"

"مگر ویڈنگ رنگ روز روز تو نہیں بنتی۔ اور نگینہ آنٹی نے خالہ کو بھی سیٹ دیا ہے سونے کا اور مجھے ٹاپس۔ وہاں پیسے خرچ نہ کرتے۔ انگوٹھی تو ڈائمنڈ کی لے لیتے۔" ماہی خود سے بول رہی تھی جیسے اسے کچھ اچھا نہ لگا ہو۔ پھر ایک دم اسے دیکھا۔ جیسے چونکی ہو۔

"زیاد نے تمہیں بتا کے ہی زرقون رنگ دی ہے نا؟ کہیں ڈائمنڈ کہہ کے زرقون تو نہیں تھما دیا؟"

برش کرتا اس کا ہاتھ سست ہوا۔

(زیاد سلطان مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔) ایک آواز کانوں میں گونجی۔

"آف کورس۔ ہم نے خود پسند کی تھی نا۔" اس نے جی کڑا کے کہا۔ اسے اپنے شوہر کا دفاع کرنا تھا۔ ہر قیمت پر۔

"اچھا میرا گفٹ کھول کے دیکھا؟" ماہی نے بغور اسے دیکھتے ہوئے بات بدل دی۔

"اتنے گفٹس دیے ہیں تم نے۔ کون کون سا کھولوں؟"

"آخری والا سب سے بیسٹ تھا۔ وائٹ اور بلیک باکس میں۔ آرام سے کھول لینا۔ آجاؤ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس کے جانے کے بعد مالا نے چہرے پہ مسکراہٹ سجائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شادی کے بعد اسے بہت سی مسکراہٹیں چہرے پہ زبردستی سجانی پڑیں گی۔

گھڑیال بارہ بجانے کے قریب تھا اور کوئی سحر تھا جو ٹوٹنے والا تھا۔ اسے اپنے کانچ کے جوتے سنبھالنے تھے۔

(شاید زیاد کے پاس پیسے نہ ہوں۔ میں اس سے پوچھ کچھ کروں تو اس کو برا لگے۔ اس کا دل دکھے۔ اونہوں۔)

"انکل کہاں ہیں؟"

جب وہ لوگ ماہی اور عباد کو چھوڑنے دروازے تک آئے تو ماہی نے پھر سے پوچھا۔ وہ یہ سوال کئی دفعہ پوچھ چکی تھی۔

"ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ لیٹے ہوئے ہیں۔"

"وہ فنکشن میں بھی تھوڑی دیر کے لیے آئے پھر چلے گئے۔" اس نے اب کے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔

زیاد اور مالا ڈرائیو وے میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ دھوپ ان کے اوپر سیدھی پڑ رہی تھی۔ مالا مسکرا رہی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ میں کچھ تھا۔ کچھ غیر آرام دہ سا۔ وہ البتہ مطمئن اور اچھے موڈ میں نظر آرہا تھا۔

"ان کی نیچر ہی ایسی ہے۔ زیادہ گھلتے ملتے نہیں ہیں۔" زیاد سلطان نے اسی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس کے سکون میں ذرا فرق نہیں آیا۔

بنگالی ملازمہ خاموشی سے ان کی کار میں سوئیٹس اور چاکلیٹس رکھوا رہی تھی۔ ماہی بظاہر مسکراتے ہوئے کار میں بیٹھی۔ عباد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار ریورس کرنے لگا۔ مالا اور زیاد ان کے جانے تک وہیں کھڑے رہے۔

جیسے ہی کار سڑک پہ نکلی ماہی کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اس کے چہرے ایک پر سوچ جنم لینے لگی۔

"ایک چاکلیٹ پکڑانا۔ لمبی ڈرائیو ہے گھر تک۔" عباد نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھامے دوسرا ہاتھ پیچھے رکھے سوئیٹس کے تھال کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ماہی نے زور سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔

"ایک چاکلیٹ ہی مانگی ہے یار!"

"رہنے دو۔ نری کیلوریز ہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے ڈبہ بیک سیٹ پہ مزید پرے دھکیل دیا۔ اب وہ عباد کی پہنچ سے باہر تھا۔

"عجیب جیلس عورت ہو تم۔" عباد بڑبڑا کے رہ گیا جیسے حیرت ہوئی ہو۔
مانیا نے جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پہ بل تھے۔

☆☆☆

وہ دونوں واپس لاؤنج میں آئے تو بنگالی ملازمہ نے بتیاں ایک دفعہ پھر سے ہلکی کردیں۔ مالا نے سب کے آنے پہ بتیاں تیز کی تھیں۔ پردے کھولے تھے۔ لیکن پل بھر میں ملازمہ نے سب واپس پہلے جیسا کردیا تھا۔ اندھیرا اور خاموشی۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ بیٹھنے سے پہلے سوئچ پہ ہاتھ مارا اور بتیاں روشن کردیں۔
نگینہ بیگم اپنے تخت پہ نیم دراز تھیں۔ کمبل اوڑھے۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے۔ تیز روشنی پہ چونک کے اسے دیکھا۔
وہ بس مسکرا کے اپنی کرسی تک آئی۔ زیاد اور وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ بتی ایک دم ہلکی ہوگئی۔
مالا نے بے یقینی سے گردن موڑی۔ بنگالی ملازمہ سوئچ کے ساتھ کھڑی جتاتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً سے ان دونوں کو دیکھا لیکن وہ اس طرف دانستہ طور پہ متوجہ نہیں تھے۔ شاید انہیں بھی اندھیروں میں رہنے کی عادت تھی اور وہ روشنیوں سے آکی لڑکی تھی۔
اس نے پہلو بدلا۔ کہا کچھ نہیں۔
"بس اب تو میں منتظر ہوں کہ کب ہم سب واپس دبئی جائیں اور ایک گھر میں ایک ساتھ رہیں۔"
نگینہ بیگم محبت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ مالا بھی مسکرادی۔ کلفت دور ہونے لگی۔
"ہم آپ کے ساتھ نہیں رہیں گے۔"
زیاد ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا بہت سنجیدگی سے بولا۔
جہاں نگینہ بیگم چونکیں وہاں مالا نے بھی تعجب سے اسے دیکھا۔

"لیکن نگینہ آنٹی کا خیال کون رکھے گا؟"
"اندرانی ہے نا۔ وہ رکھ لے گی۔"
نگینہ بیگم سانس روکے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں جیسے یقین نہیں آیا تھا۔
"ن۔۔۔۔ زیاد! تم نے کہا تھا کہ ہم ساتھ رہیں گے۔"
"ہاں اور اب میں کہہ رہا ہوں کہ ہم ساتھ نہیں رہیں گے۔" وہ بس اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ دوٹوک قطعی انداز۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا۔
"لیکن زیاد...... ایک شہر میں رہتے ہوئے ہم الگ رہیں؟ اچھا لگتا ہے کیا؟" اس نے نرمی سے کہنا چاہا۔
"کس نے کہا ہم ایک شہر میں رہیں گے؟"
اس نے پہلے بیوی اور پھر ماں کو دیکھا۔ انداز بالکل پرسکون تھا۔
"کیا مطلب؟"
"میں اور کشمالہ مکہ شفٹ ہو رہے ہیں۔ آپ ذہنی طور پہ خود کو تیار کرلیں۔"
نگینہ بیگم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبالیا۔
"مکہ؟" وہ حیران رہ گئی۔ "مکہ کہاں سے آگیا؟ آپ نے تو کہا تھا کہ ہم......"
اور اس لمحے اسے احساس ہوا کہ زیاد سلطان نے ہمیشہ ایک نئے شہر جاکے نئی زندگی شروع کرنے کی بات کہی تھی۔ اس نے کبھی اس شہر کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی رہی کہ وہ دبئی میں جاب ڈھونڈ رہی ہے دبئی میں یہ اور یہ کرے گی۔ وہ آگے سے ہوں ہاں کرتا رہتا تھا۔
"لیکن زیاد! میں مکہ میں کیا کروں گی؟ مجھے دبئی میں جاب مل گئی ہے۔ اور آنٹی کو چھوڑ کے ہم......" اسے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ بات مکمل ہی نہیں ہوپائی۔
"زیاد...... ایسے کیسے بیٹا!" نگینہ بیگم ہنوز بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"مجھے آفس نے مکہ ٹرانسفر کردیا ہے۔ میں وہیں سے کام کروں گا اور تم وہاں کوئی جاب ڈھونڈ لینا۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ فون بجنے لگا۔ خالہ کی کال آرہی تھی۔ وہ ماہی اور عماد کا پوچھنا چاہتی ہوں گی۔ وہ ایکسکیوزمی کہہ کے اٹھ گئی۔ کچھ مشتعل کچھ غائب دماغ سی وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

زیاد نے اسے جاتے دیکھا۔ جب وہ باہر نکل گئی تو وہ ماں کی طرف مڑا۔

وہ ابھی تک بے یقینی سے جیسے دل تھام کے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"تم مجھ سے دور چلے جاؤ گے؟"

"پھر کیا کروں؟ اس کو آپ کے ساتھ ایک گھر میں رکھوں تاکہ ابو اس کو دو دن میں آپ کی اصلیت بتادیں؟" وہ قریب ہو کے دبا دبا سا غرایا۔

"میں سنبھال لیتی۔"

"ہرگز نہیں۔ میں اپنی شادی قائم رکھنا چاہتا ہوں اور میں آپ کے قریب نہیں رہنا چاہتا۔"

"تمہاری شادی میں نے کروائی ہے۔ میں نے۔" انہوں نے کپکپاتی بوڑھی انگلی اپنے سینے پہ رکھی۔ آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"اور میں آپ کا شکرگزار ہوں لیکن میں اسے آپ کے قریب نہیں رکھوں گا۔"

"مکہ؟ مکہ کیوں؟" وہ اسے دیکھ کے رہ گئیں۔ انگلی نیچے گر گئی۔

"میری اپنی وجوہات ہیں۔" وہ پیچھے ہو کے بیٹھ گیا۔

اس نے خالہ سے بدقت بات کی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ نقلی انگوٹھی انگلی کاٹ رہی تھی۔ پھر وہ کمرے سے نکلی۔ زیاد لاؤنج میں نہیں تھا۔ نگینہ بیگم گم صم سی اپنی جگہ بیٹھی تھیں۔ وہ اس وقت ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابھی واپس پلٹنے ہی لگی تھی کہ......

پپی برتھ ڈے ٹو یو......

موسیقی کی دھن ساعتوں میں گونجنے لگی۔ وہ جہاں تھی وہیں سن رہ گئی۔ پھر بے اختیار آواز کی سمت دیکھا۔ وہ راہداری کے سرے پہ نصب ایک دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ اسے اتنا معلوم تھا کہ یہ دروازہ بیسمنٹ کی طرف کھلتا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

پپی برتھ ڈے ٹو یو......

موسیقی کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اپارٹمنٹ کے دروازے کے باہر فرید لار کی تختی لگی تھی۔ آج اس تختی نے خاموشی سے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے اندر آتے دیکھا۔ ہیربل بالکل نڈھال تھا اور ماہر خاموش جیسے شل ہو۔ کسی اور دنیا میں گم ہو۔ وہ بیساکھی سے چل رہا تھا۔ وہیل چیئر نہ جانے کہاں رہ گئی تھی۔

ہیربل اندر آیا اور جوتوں سمیت آگے بڑھتا گیا۔ لونگ روم خالی تھا۔ فیضی خانم کو اس نے واپس آنے کی اطلاع نہیں کی تھی۔ شاید ماہر نے بھی نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ گھر نہیں تھیں۔ ماہر نے سارا راستہ اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ویٹنگ لاؤنج۔ ایئرپورٹ۔ فلائٹ۔ ایگزٹ۔ وہ خاموش رہا تھا۔ جیسے ابھی تک شاک میں ہو۔

سیاہ سفید لونگ روم خاموش پڑا تھا۔ ہیربل آگے بڑھا اور آہستہ سے ایل شیپ سیاہ صوفے پہ گر سا گیا۔ ایک بازو نیچے جھول گیا۔ انگلیاں قالین کو چھونے لگیں اور نظریں چھت کے فانوس پہ تھیں۔

ماہر نے دھیرے سے دروازہ بند کیا۔ زیرلب اعوذ باللہ پڑھا۔ لاک کرنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے جھک کے جوتے اتارے۔ پھر بیساکھی کی ٹک ٹک سنائی دی۔

وہ لنگڑا کے قدم قدم چلتا سامنے آیا۔ بیساکھی ہاتھ سے پھسل گئی۔ اس نے جھک کے میز پہ

اسٹرابری والی کینڈل کا جار رکھا۔ وہ سارا راستہ اسے تھامے رہا تھا۔

"دو سال سے تم کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ ہے اور آج دیکھو۔"

بیرنل چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز گیلی تھی۔ آنکھیں نم تھیں۔ غصہ، گلہ۔ کیا نہیں تھا اس کی آواز میں۔

اس کی امید ٹوٹی تھی۔ وہ جھوٹی امید جو ماہر نے اسے تھمائی تھی۔

"ہاں۔" اس نے اعتراف کیا۔ بیرنل کو اس کی امید نہیں تھی۔ لیکن وہ شاک میں لگتا تھا۔

"ہاں۔ دو سال سے میں کہہ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اور آج دیکھو۔"

وہ جھکا اور بیساکھی اٹھائی۔ پھر لنگڑاتا ہوا آتش دان کی طرف بڑھنے لگا۔

"میں نے کہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ سب کہتے تھے باز آجاؤ۔ لیکن میں تمہیں اور بالک کو لیے ایک ملک سے دوسرے ملک پھرتا رہا۔ میں نے دو سال تک تم لوگوں کو امید دلائی۔ کیونکہ میرا دل کہتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔"

آتش دان تک وہ رکا اور لائٹر اٹھایا۔ بیساکھی پھر سے لڑھک گئی۔ ماہر نے تکلیف سے اسے دیکھا۔ پھر بیرنل کو۔ وہ دور تھا۔ قریب ہوتا' تب بھی آج وہ بیساکھی اٹھانے نہ کھڑا ہوتا۔

"کوئی میرا یقین نہیں کرتا تھا اور میں کہتا تھا کہ میں تم سب کو ثابت کر کے دکھاؤں گا۔" وہ خود سے بول رہا تھا۔ لائٹر لیے اس نے چلنے کی کوشش کی۔ میز تک کافی فاصلہ تھا۔ ٹانگ پہ زور دے کر ایک قدم اٹھایا۔ دوسرا۔ اور تیسرے سے پہلے وہ ایک دم لڑھک کے گرا۔

"تمہارا جنون..... جھوٹی امید کے سوا کچھ نہیں تھا۔" بیرنل نے بس ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ پہلو کے بل قالین پہ گرا تھا۔ شاید کراہا بھی تھا۔ لیکن بیرنل نہیں اٹھا۔ اس نے اسے گرے رہنے دیا۔

"میں نے تم سب کا بہت وقت لیا۔ اور اپنا بھی۔ کیونکہ......"

وہ ہتھیلیوں کے بل سیدھا ہوا۔ پھر سے کراہا۔ صوفے کا سہارا لے کر سیدھا ہوا اور خود کو گویا گھسیٹتے ہوئے میز تک لایا۔

"کیونکہ میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اور دیکھو......"

وہ نڈھال سا وہیں میز کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹانگ میں درد کی شدید لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

"اور دیکھو۔ آج تم غلط نکلے۔" بیرنل نے بے بسی بھرے غصے سے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

ماہر فرید نے لائٹر کے لیور پہ انگوٹھا زور سے رگڑا۔ شعلہ جل اٹھا۔

"میں یہ نہیں کہنے جا رہا تھا۔"

اس نے شعلہ موم بتی کے قریب کیا۔ وہ اس کے جلے ہوئے دھاگوں سے ذرا دور تھا۔

"میں کہنے جا رہا تھا کہ...... دیکھو...... آج میں درست ثابت ہوا۔"

اس نے شعلہ دھاگے سے ٹکرایا۔ اس نے فوراً سے آگ پکڑ لی۔

بیرنل فرید تیزی سے سیدھا ہوا۔ ایک الارم سا اس کے کانوں میں بجنے لگا تھا۔

"کیسے؟"

"ہلال کی تمام چیزوں پہ گرد تھی۔ زپ لاک کھلے ہوئے تھے۔ گرد کا ہونا فطری بات ہے۔ لیکن...... ۔" اس نے اسٹرابری کینڈل کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی موم سفید اور صاف تھی۔ خوشبو بھی برقرار ہے جب کہ اس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ دو سال تک کینڈل ڈھکن کے بغیر رہے تو اس کی خوشبو ضائع ہو جاتی ہے۔"

وہ قالین پہ بیٹھا جلتے ہوئے شعلے کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟"

☆☆☆

"کیا تم اب تک نہیں سمجھی ہو کہ ماہر تمہیں کینڈلز کیوں دیتا ہے؟"

ہلال کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے تیزی سے کینڈل اٹھا کے دیکھی۔

اس کے دھاگے سیاہ تھے۔

وہ ایک دم کمرے میں بھاگی۔ رابیل مسکرا کے اسے دیکھنے لگیں۔

وہ واپس آئی تو اس کے بازوؤں میں بہت سی چھوٹی بڑی کینڈلز تھیں۔ اس نے سارے جارز جلدی جلدی میز پہ سیٹ کیے۔

"سب کے دھاگے جلے ہوئے ہیں۔ لیکن موم کم نہیں ہے۔ یعنی ماہر بھائی گفٹ دینے سے پہلے نئی کینڈل کو ایک دفعہ ضرور جلاتا ہے۔ لیکن کیوں؟" وہ جوش سے ماں کو سمجھا رہی تھی۔

پھر اس نے لائٹر لیا اور باری باری موم بتیوں کے دھاگے جلانے لگی۔ دھیرے دھیرے ساری موم بتیاں آگ پکڑنے لگیں۔

"بہت دیر سے سمجھ میں آیا تمہیں۔"

رابیل مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ بہت خوشی سے جلتی کینڈلز کو۔

پہلی کینڈل کی موم پگھلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ پوری پگھل گئی۔ ہلال نے دھڑکتے دل سے ٹوئیزر اٹھایا اور اسے پگھلی موم کے اندر ڈالا۔ جب اسے واپس اوپر نکالا تو اس کے دانتوں میں ایک سنہری لاکٹ تھا۔

"ماما ماما....." اس نے جوش سے چیخ ماری۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"ماہر بھائی مجھے کینڈل میں گفٹ چھپا کے دیتا تھا۔"

موم پگھل رہی تھی۔ خوشبوئیں ایک دوسرے میں مکس ہو کے سارے کو معطر کر رہی تھیں۔ اور وہ ایک کے بعد ایک موم بتی سے کچھ نکال رہی تھی۔ نیل پالش۔ ہیئر پن۔ کینڈی بار۔ کچھ پلاسٹک میں لپٹا تھا اور کچھ بغیر پلاسٹک کے۔

"اتنی دیر لگی تمہیں اپنے بھائی کو سمجھنے میں۔" رابیل مسکرا کے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ میز موم سے لتھڑی چیزوں سے بھر گئی تھی جن کا موم باہر آتے ہی جمنے لگا تھا۔ وہ اب ہنستے ہوئے اپنے ناخنوں پہ جمی موم ناخنوں سے کھرچ رہی تھی۔

☆☆☆

اسٹرابری کی مہک والی کینڈل پگھل رہی تھی اور ہیر بل فرید سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یعنی ہماری بہن زندہ ہے۔ اور....."

ماہر نے سر جھکا کے موم بتی کے جار کے اندر جھانکا۔

اس کے چہرے پہ بالآخر ایک مسکراہٹ ابھری۔ ایک مکمل مسکراہٹ۔

"اور اس نے مجھے ایک پیغام بھیجا ہے۔" اس نے ٹوئیزر اٹھایا اور پگھلی موم میں ڈال دیا۔ ہیر بل بنا پلک جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

ٹوئیزر موم کے اندر ڈوب گیا۔

اور جب ماہر کی انگلیوں نے اسے باہر نکالا تو اس کے دانتوں میں کچھ تھا۔

"اسمارٹ کڈ۔ از اٹ شی؟" وہ موم میں لتھڑی شے کو دیکھ کے فخر سے مسکرایا۔

باب دوم

"سکہ"

انسان ہوتے ہیں
سیپ میں بند کیڑوں کے جیسے
اگر تم ڈالو چند ایک سیپ
کھولتے پانی کے برتن میں
تو بہت سے سیپ
ایک دم پھٹ کے
کھل جائیں گے۔
اور چند ایک
تیرتے رہیں گے کچھ دیر
گرم پانی کی سطح پہ

اور پھر وہ دھیرے دھیرے
اپنے آپ کو کھول دیں گے۔
لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں
جو کبھی نہیں کھلتے
چاہے وہ کیسے ہی گرم پانیوں کا
شکار کیوں نہ ہو جائیں۔
رابن بے مارٹن

سیاہ سفید اپارٹمنٹ میں اسٹرابری کی مہک پھیلی تھی اور اونچے در و دیوار خاموشی سے لونگ روم میں بیٹھے دو نفوس کو دیکھ رہے تھے۔ ہیریل سانس روکے ماہر کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا جو احتیاط سے ٹوئیزر کی مدد سے کینڈل جار کے اندر سے کچھ نکال رہے تھے۔

ٹوئیزر اوپر اٹھا۔ ہیریل کی نظریں بھی اوپر کو اٹھیں۔

ایک موم میں لتھڑی شے برآمد ہوئی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ میز پہ جھکا۔

"ہاتھ نہیں لگانا۔" ماہر نے ایک دم روکا تو وہ جیسے منجمد ہو گیا۔ پھر نا سمجھی سے اس شے کو دیکھا جس کی گرم موم میز پہ رکھتے ہی جمنے لگی تھی۔

ماہر ٹوئیزر کی نوک سے اس کسی شے کے اوپر سے موم ہٹانے لگا۔ موم کے دانے دانے الگ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ صاف ہو گئی۔

وہ ایک موٹے کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ آدھے انگوٹھے جتنا۔ جو ایک طرف سے بھورا اور دوسری طرف سے سرخ تھا۔ ٹکڑا تکون صورت تھا۔ ایسے کہ دو اطراف بالکل برابر تھیں اور تیسری قدرے ٹیڑھی تھی۔ جیسے کسی نے ہاتھ سے پھاڑی ہو۔ بھوری سائیڈ تو گتے جیسی تھی اور سرخ سائیڈ پر تحفظ تھی۔ سرخ تکون کے اوپر ایک ڈیزائن بنا تھا۔ جیسے پیلے، سبز اور نیلے رنگ کے ایک پھول کی پتی ہو۔ وہ پھول کی پتی کا ٹکڑا تھا جیسے باقی آدھا پھاڑنے کی وجہ سے کٹ گیا ہو۔

"یہ کسی اپنے سے بڑے کاغذ کا حصہ ہے جس کو کسی نے ہاتھ سے پھاڑا ہے۔" ماہر اس کو ٹوئیزر سے اٹھائے الٹ پلٹ کے بغور دیکھ رہا تھا۔ "اس کاغذ کا دوسرا حصہ بھی ہونا چاہیے تھا۔" قدرے الجھ کے اس نے کینڈل جار میں جھانکا۔ موم پگھل کے شفاف نظر آ رہی تھی۔ سرے سے پیندے تک دوسری کوئی شے وہاں موجود نہ تھی۔

"یہ تو ایک ننھا سا کاغذ کا ٹکڑا ہے جو کسی نے غلطی سے پھاڑ کے موم بتی میں گرا دیا ہے۔ اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ہلال زندہ ہے؟" ہیریل کے کندھے ڈھیلے ہوئے۔ وہ پیچھے ہو کے بیٹھا۔

"ہلال زندہ ہے اور یہ اسی نے ڈالا ہے۔ مجھے کچن سے ایک زپ لاک بیگ لا کر دو۔" تحکم سے اشارہ کیا۔

ہیریل نے ایک نظر اس کی گری ہوئی پیسا کمی کو دیکھا۔ پھر منہ میں کچھ بڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچن میں جا کے دو تین کیبنٹس کھولیں۔ ایک ننھا زپ لاک بیگ نکالا اور کیبنٹ کے دروازے بند کیے بنا واپس آیا۔ انداز ناراض ناراض سا تھا۔

"بالفرض یہ ہلال کی طرف سے ہے اور وہ زندہ ہے۔ تب بھی تم نے یہ بات مجھے پاکستان میں کیوں نہیں بتائی؟ ہم واپس کیوں آ گئے؟" وہ واپس صوفے پہ بیٹھے ہوئے قدرے جھنجھلا گیا تھا۔

ماہر جواب دیے بنا ٹوئیزر سے اس کاغذ کے ٹکڑے کو شفاف زپ لاک بیگ میں مقید کرنے لگا۔ اس نے ابھی تک اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

"کیونکہ سرکار نے ہلال کی نقلی موت کا ثبوت مجھے بہت جلدی میں بھجوایا ہے۔ وہ مجھے لاہور سے بھیجنا چاہتا تھا۔ اسے کسی چیز کی جلدی تھی۔" اس نے چہرہ کینڈل پہ جھکا کے آنکھیں بند کیں۔ پھر ایک سانس اندر کھینچی۔ وہ جیسے ہلال کی خوشبو تھی۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ گال میں گڑھا سا بنا۔

"ہم ہلال کو ڈھونڈے بنا واپس کیوں آ گئے ماہر؟"

"کیونکہ وہ زندہ ہے اور وہ ٹھیک ہے۔"

"تم اتنے پر یقین کیسے ہو؟" وہ اب اکتا گیا

تھا۔

"ہلال زندہ ہے۔ اور وہ سرکار کے پاس ہے۔" اب وہ زپ لاک بیگ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "سرکار نے اگر اس کو مار دیا ہوتا تو وہ اتنے جوکھم کر کے اس کی نقلی موت ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ اسے ہلال زندہ چاہیے۔ اس نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ لیکن برے حال میں نہیں۔ اچھے حال میں۔" وہ جیسے سوچ سوچ کے بول رہا تھا۔

"اور یہ تمہیں کیسے معلوم؟"

"کیونکہ ہلال کی جو چیزیں پولیس نے ہمیں دی ہیں اس کا بیگ وغیرہ وہ بہت تھوڑی سی چیزیں ہیں۔ اس کی گمشدگی کے وقت اس کے پاس بہت سی چیزیں تھیں جو کبھی نہیں ملیں۔ اس کی بہت سی کینڈلز۔ کتابیں۔ اسکیچ بکس۔ رنگین پنسلز۔ بوتل۔ کپڑے۔ ہلال کے ساتھ اس کی چیزیں بھی کھو گئی تھیں۔ کوئی اس کی چیزیں کیوں چرائے گا؟"

"تاکہ وہ چیزیں اس کو مہیا کر کے اس کو خوش رکھ سکے۔" ہیرل کا ذہن کام کرنے لگ گیا۔ ماہر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بالکل۔ اس نے ہلال کو کہیں بہت آرام سے رکھا ہوا ہے۔ اس کے پاس اس کی تمام چیزیں ہیں۔ لیکن اس کی نقلی موت دکھانے کے لیے سرکار نے ہلال کی کچھ چیزیں اس سے لے لی ہوں گی۔"

"اور ہلال کو اندازہ ہوگا کہ یہ ہم تک پہنچائی جائیں گی اس لیے اس نے کاغذ کا ٹکڑا کینڈل میں ڈال دیا۔ سرکار کو اس کا علم نہیں ہو سکا ہوگا۔" ہیرل نے سمجھ کے سر ہلایا۔ پھر رک گیا۔ "لیکن ہلال نے خالی کاغذ کیوں بھیجا؟ یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے؟"

"شاید وہ خود نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔" وہ دور خلا میں دیکھ رہا تھا۔

"ہمیں وہاں رہ کے اسے ڈھونڈنا چاہیے تھا۔" ہیرل شدید بے زار ہوا۔

"سرکار میرے ساتھ عرصے سے ایک گیم کھیل رہا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے دو قدم آگے رہتا ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر پاتا کیونکہ میں اس کی بنائی ہوئی گیم کھیل رہا ہوں۔" زمین پہ بیٹھے ماہر فرید کے چہرے پہ یہ کہتے ہوئے زمانے بھر کا اطمینان تھا۔

"کیا مطلب؟"

"وہ ہمیشہ جیتتا رہے گا اور میں اس کی لاحاصل تلاش میں ہمیشہ ناکام رہوں گا کیونکہ یہ کھیل اس کا بنایا ہوا ہے۔ لیکن میں اب اس کا کھیل نہیں کھیلوں گا۔ میں سرکار کو نہیں ڈھونڈوں گا۔ اس طرح مجھے ہلال کبھی نہیں ملے گی۔"

"پھر کیسے ملے گی؟"

"اب میں اپنا کھیل ترتیب دوں گا۔ ہم واپس اس لیے آگئے تاکہ وہ یہ یقین کر لے کہ میں ہلال کی موت کو تسلیم کر چکا ہوں اور وہ ریلیکس ہو جائے۔ جب وہ ریلیکس ہوگا تو وہ کوئی غلطی کرے گا۔"

"اور اگر اس کے جنات نے اس کو بتا دیا؟"

ہیرل نے آنکھیں گھمائیں۔

ماہر دھیرے سے مسکرایا۔

"کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ میں نے گھر کا دروازہ بند کرتے ہوئے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھا تھا؟"

"تاکہ یہاں کی جانے والی باتیں جنات آگے نہ بتا سکیں؟" وہ چونکا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ویسے بھی جنات سب کچھ نہیں جانتے۔ نہ سب کچھ بتا سکتے ہیں۔ اسی لیے وہ چھپی چیزوں کی لوکیشن کبھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتے۔ بہرحال ہم دوبارہ اس بات کا ذکر نہیں کریں گے۔ ہم یہی ظاہر کریں گے کہ ہلال مر چکی ہے۔ مالک، چنگیز، شبنم سب کے سامنے۔ تب تک میں یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ اس کاغذ کا کیا مطلب ہے۔" وہ زپ لاک بیگ میں مقید سرخ کاغذ کو دیکھ رہا تھا۔

"اور اگر اس نے ہلال کو نقصان پہنچایا؟"

"نہیں۔ اس نے کسی وجہ سے ہلال کو زندہ رکھا

ہوا ہے۔اگر مارنا ہوتا تو اس کی اصلی لاش بھیج دیتا۔"

"سرکار۔کتنا عجیب نام ہے یہ۔" بیربل ماتھے پہ بل ڈالے بڑبڑایا۔"نہ جانے وہ خود کیسا ہوگا۔"

"وہ بوڑھا ہے۔اور اس کے سفید بال ہیں۔یہ میں جانتا ہوں۔عمر یقیناً پچاس سے ساٹھ برس کے درمیان ہوگی۔" وہ موم بتی کے جلتے شعلے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

(زیاد اور مالا ابھی ابھی سامنے سے ہٹے تھے اور نگینہ بیگم اسی طرح شل سی تخت پہ بیٹھی تھیں۔ان کا زرد چہرہ کمزور تھا اور آنکھوں تلے حلقے تھے۔پلکیں گیلی تھیں اور جھریوں زدہ بوڑھے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔)

"چونکہ وہ بہت سخت جادو کرتا ہے'اس لیے اس نے اپنی صحت کا خاص دھیان رکھا ہوگا۔اس عمر میں بھی وہ فٹ ہوگا۔ورزش کرتا ہوگا۔اچھی غذا کھاتا ہوگا۔کالا جادو بہت سی جسمانی توانائی مانگتا ہے۔"

(آنسو نگینہ بیگم کی آنکھوں سے بہنے لگے۔بے اختیار کھانسی آئی۔اگال دان پہ چہرہ جھکایا تو خون کے قطرے تھوک کے ساتھ نکلے۔)

"اس کی کوئی فیملی نہیں ہوگی کیونکہ ایسے انسان کا دل سخت ہوتا ہے۔جو دوسروں کے بچوں اور ماؤں کو مار سکتا ہے'اس کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔کسی سائیکو پیتھ سیریل کلر کی طرح وہ اکیلا رہتا ہوگا۔"

(وہ کھانس کے سیدھی ہوئیں۔نڈھال چہرے سے لاؤنج کے دروازے کو دیکھا جہاں سے زیاد گیا تھا۔آنسو تواتر سے بہنے لگے۔)

"اس کے پاس بہت پیسہ ہے۔اس کے کلائنٹ اس کے مرید ہیں اور اعلا عہدوں پہ ہیں۔یقیناً اس نے کہیں نہ کہیں کوئی بڑا سا آستانہ بنا رکھا ہوگا جہاں اس کے آگے پیچھے ملازم پھرتے ہوں گے۔"

("اندرانی...اندرانی..." نگینہ بیگم کمزور آواز میں پکارنے لگیں۔ان کو سانس چڑھ رہا تھا۔)

"اس نے اپنے قریبی انسانوں کو اپنے تابع کر رکھا ہوگا۔وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے ہوں گے۔اس کا جادو ان پہ مکمل طور پہ چھایا ہوگا۔"

(وہ کھانس کھانس کے دوہری ہو رہی تھیں۔زیاد کے کمرے کے دروازے سے کھانسنے کی آواز اندر جا رہی تھی لیکن کوئی باہر نہیں نکلا۔سیڑھیوں کے اوپر ریلنگ سے سلطان صاحب نے جھانکا۔نیچے تخت پہ بیٹھی نگینہ بیگم کا کھانسی سے برا حال تھا۔انہوں نے ہونہہ میں سر جھٹکا اور واپس اندر چلے گئے۔)

"یقیناً اس کا بچپن اور جوانی بہت مشکل گزری ہوگی جس نے اس کے دل کو پتھر جیسا کر دیا ہوگا۔اس کے اندر جذبات نہیں ہوں گے۔نہ اسے کسی سے محبت ہوگی۔کیونکہ اتنا ظلم کوئی ایسا انسان ہی کر سکتا ہے جس کو صرف پیسے کی ہوس ہو یا جادو کی طاقت کا نشہ۔"

"تمہارا تجزیہ اچھا ہے۔سیریل کلرز بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔اکیلے'سائیکو پیتھ'پتھر دل۔" بیربل کھنکھارا۔"لیکن شاید اس کی کوئی فیملی ہو۔ہر ولن کی فیملی ہوتی ہے'ماہر۔"

ماہر نے "ٹک" کی آواز کے ساتھ سر جھٹکا نفی میں ہلایا۔جیسے اس کی بات رد کی ہو۔بیربل نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کا فون بجنے لگا۔اس نے جلتی بجھتی اسکرین دیکھی تو لبوں پہ مسکراہٹ در آئی۔

اس کی یہ مسکراہٹ ماہر فرید نے غور سے دیکھی۔

"کون ہے؟" ابرو اٹھایا۔

"لاہور کے اس ہوٹل کی خوب صورت مینیجر جہاں ہم ٹھہرے تھے۔" اسے جیسے مزہ آ رہا تھا۔"جاتے ہوئے اس نے میرا پرسنل نمبر لیا تھا۔وہ مجھے پسند کرتی ہے۔"

"فون اٹھاؤ۔"

"ایسے کیسے؟ دو تین دن فون کرنے دو پھر میسج کروں گا کہ...."

"اٹھاؤ۔" وہ دبا دبا سا غرایا۔ بیربل کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا۔ جلدی سے اسے کان سے لگایا۔

"ہیلو۔" ساتھ ہی خفگی سے گھور کے ماہر کو دیکھا۔ اس کا بھائی اس کی لولائف کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

"جی جی۔ میں پہچان گیا۔ اچھا... واقعی؟" مسکراہٹ غائب ہوئی۔ قدرے چونکا۔

"ہمارے جانے کے بعد کبیرہ سادان ہوٹل آئی تھیں۔ تم سے ملنے۔" فون رکھتے ہی وہ بے یقینی سے بولا۔

"کہا تھا نا وہ آئے گی۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "واللہ ماہر فرید کبھی غلط نہیں ہوتا۔"

بیربل نے خفگی سے آنکھیں گھما کے ابرو اچکا دیے۔ ماہر اب صوفے کا سہارا لیے خود کو گھسیٹتے ہوئے بیساکھی کی طرف جا رہا تھا۔ اسے کبیرہ سادان کو کال ملانی تھی۔ اسے اپنے ایک واہمے کی تصدیق چاہیے تھی۔

☆☆☆

ہیپی برتھ ڈے ٹو یو....

ہیپی برتھ ڈے ٹو یو....

دھن اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کسی سحر کے زیر اثر وہ کھنچتی ہوئی بیسمنٹ کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" آواز پہ کوئی فسوں سا ٹوٹا۔ کشمالہ مبین چونک کے مڑی۔

پیچھے اندرانی کھڑی تھی۔ اس کی گھورتی نگاہیں ہمیشہ خاموش مگر کچھ کہتی ہوئی ہوتی تھیں۔ کشمالہ کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے ابرو اٹھا کے پوچھا۔ انداز سخت تھا۔

موسیقی کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔

"بیسمنٹ سے کیا چاہیے آپ کو؟" اندرانی گھوم کے سامنے آئی اور دروازے کے سامنے جم کے کھڑی ہو گئی۔

"تم کچن میں جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

مگر اندرانی نہیں ہلی۔ ڈھٹائی سے دیوار بن کے کھڑی رہی۔

"جاؤ۔" اس کی آواز بلند ہوئی۔

"کشمالہ...." زیاد نے راہداری کے دوسرے سرے سے اس کو پکارا۔

"زیاد ادھر آئیں۔" اس نے بنا مڑے آواز دی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے کندھے کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"میں بیسمنٹ دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ راستہ روک کے کھڑی ہو گئی ہے۔ کیا یہ نہیں جانتی کہ میں اس گھر کی بہو ہوں؟" وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی بہت سکون سے زیاد سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ کشمالہ اس گھر کی بہو ہے؟" زیاد نے گھور کے اسے دیکھا۔ اندرانی کے کندھے ڈھیلے ہوئے۔

"میں ان سے پوچھ رہی تھی کہ...."

"جیسا وہ کہہ رہی ہیں ویسے کرو۔" وہ برہمی سے بولا تو اندرانی نے سر کو خم دیا۔ پھر اسے گھورتے ہوئے سامنے سے ہٹ گئی۔

"بیسمنٹ میں کاٹھ کباڑ رکھا ہوتا ہے یا پرانا سامان۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ سیڑھیاں اترنے لگے۔

"آپ نے اتنا بڑا فیصلہ مجھے اعتماد میں لیے بغیر کیسے کر لیا؟" وہ جھنجھلائی ہوئی نہیں تھی۔ بس کچھ خفا خفا سی تھی۔

"تم اسی کی وجہ سے یہ کہہ رہی ہو؟" زیاد نے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا تو مدھم بتیاں جل اٹھیں۔ نیچے ایک لونگ روم تھا۔ اور سامنے چند کمرے۔ کچھ پرانا فرنیچر رکھا تھا جو کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہر طرف گرد کی مہک تھی۔

"اور اپنی وجہ سے بھی۔ مجھے دبئی میں جاب مل

گئی ہے۔ پھر آپ کی امی بیمار ہیں۔ کینسر کے آخری اسٹیج پہ ہیں۔ آپ ان کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟"

رہ رہ کے ہسپتال کے وہ دن یاد آنے لگے جو معید اور اس نے بڑی مشکل سے کاٹے تھے۔ ماں کے سرہانے سے ایک پل کے لیے نہیں ہٹتے تھے۔

"میں امی کو اکیلا نہیں چھوڑ رہا ان کے پاس نرسنگ اسٹاف ہوگا۔ ابو ہوں گے۔ ملازمائیں ہوں گی۔" وہ نرمی سے کہتے ہوئے دروازے کھول کھول کے اسے کمرے دکھا رہا تھا۔ نیچے بھی اوپر جیسا ایک پورشن بنا تھا جو خالی تھا۔ سوائے لاؤنج کے فرنیچر کے اس میں کچھ خاص نہ تھا۔

"آپ کو ڈر نہیں لگتا کہ آنکھ ذرا اوجھل ہوا اور وہ مر جائیں؟"

"امی اپنا خیال رکھ سکتی ہیں۔ رہی تمہاری بات تو تمہیں ویسے بھی ایک نئے شہر جا کے آباد ہونا ہی ہے۔ کیا دبئی اور کیا مکہ۔ اور ہم دبئی آتے جاتے رہیں گے۔ ساتھ ہی تو ہے۔"

"لیکن آپ نے فیصلہ لینے سے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

اس نے آگے جاتے زیاد کی کہنی تھام کے اسے روکا۔ وہ گہری سانس لے کر اس کی طرف مڑا۔ اب وہ دونوں گرد سے اَٹے لاؤنج میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"کچھ فیصلے گھر کے مرد نے لینے ہوتے ہیں کشمالہ۔ کیونکہ مرد گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ مجھے ہی لینا تھا۔"

"نہیں زیاد۔ شادی شدہ لوگ فیصلے مل کر لیتے ہیں۔ ایک ساتھ۔"

زیاد نے دھیرے سے اس کے ہاتھ تھامے اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ میں خوف زدہ تھا کہ تم انکار نہ کر دو۔ لیکن میں تمہیں مکہ میں بہت خوش رکھوں گا۔ تم پریشان نہ ہو۔"

"لیکن مکہ ہی کیوں؟ وہاں اتنا اہم کیا ہے؟"

وہ الجھ کے اس کو دیکھ رہی تھی۔

زیاد سلطان نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"میں ایک گناہگار انسان ہوں کشمالہ۔ میں نے زندگی میں بہت سے ایسے گناہ کیے ہیں جو میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن وہ میرے اور میرے اللہ کے درمیان ہیں۔ (بہت سا پانی اس کے حلق میں جمع ہونے لگا۔ اس نے بدقت تھوک نگلا۔) اور جب میں نے تم سے شادی کرنے کا سوچا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ تم مجھے قبول نہیں کرو گی کیونکہ میں تمہارے قابل نہیں تھا۔ تب میں نے امی سے کہا تھا کہ... (پھر سے تھوک نگلا) کہ وہ دعا مانگیں۔ اور ان کی دعا سے تم مجھے ملی ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور میں نے خود سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر تم میری زندگی میں شامل ہو گئیں تو میں اپنے آپ کو بہتر بناؤں گا۔ میں نیک نہیں ہوں لیکن گناہگار بھی نہیں رہوں گا۔ اس لیے میں مکہ جا کے اپنی نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں اللہ کا گھر ہے۔ میں چاہتا ہوں میں وہاں جا کے اللہ تعالیٰ سے زندگی میں کیے تمام گناہوں کی معافی مانگوں اور ہم کورے کاغذ جیسی نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑ چکے تھے۔ اس نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ زیاد نے ابھی تک اس کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ اس کا انگوٹھا زرقون کی رنگ کو چھو رہا تھا۔ مالا نے چہرہ جھکا کے چمکتے ہوئے زرقون کو دیکھا۔ اور پھر اس کو۔

اب وہ وقت تھا بات کرنے کا۔ اب نہیں تو کبھی نہیں۔

"یہ رنگ کہاں سے لی تھی آپ نے؟" غور سے اس کو دیکھا۔

زیاد خاموش ہو گیا۔ پھر سر جھکا دیا۔

"مجھے ایک اور بات بھی بتانی تھی تمہیں۔ یہ رنگ ڈائمنڈ کی نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں پشیمانی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

کتابوں سے دل لگائے بیٹھے ہیں
یعنی کہ سب گنوائے بیٹھے ہیں

وہ بھی بلا کے انا پرست اور
ہم بھی کشتیاں جلائے بیٹھے ہیں

بے سبب لبوں پہ مسکان بھی ہے
کچھ تو ہے جو چھپائے بیٹھے ہیں

تم کو ہے بارش میں بھیگنے کا ڈر
ہم سمندر میں گھر بنائے بیٹھے ہیں

اک منزل کو چل رہے ہیں آپ
جیسے [illegible] بیٹھے ہیں

یہ آئینہ صرف صورت دکھاتا ہے
آپ کیوں منہ چھپائے بیٹھے ہیں

اس بار بھی بات ادھوری رہے گی
وہ پھر نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

فقط عادت ہے اب ضرورت نہیں
کشکول الٹا اٹھائے بیٹھے ہیں

ویسے تو یاد نہیں ہے آپ سے مگر
یہ آستین میں کیا چھپائے بیٹھے ہیں

ہم شاعروں کی محفل میں لوگ ماہی
آ تو گئے ہیں پر اب اکتائے بیٹھے ہیں

مہرین ماہی

رت جگوں کے عذاب اترے ہیں
مری آنکھوں میں خواب اترے ہیں

تیری یادوں میں بھیگنے کو آج
دیکھو کتنے سحاب اترے ہیں

لوگ یک دم کہاں ہوئے ظاہر
رفتہ رفتہ نقاب اترے ہیں

اک ترے واسطے بریں سے ہم
بارہا بے حساب اترے ہیں

خدایا! تیری بستی میں ہر سو
پھر سے [illegible] اترے ہیں

تم کہو تو یہ مان لیتے ہیں
آسماں سے جناب اترے ہیں

چاند شرما کے چھپ گیا ہے کہیں
تارے سب بے حجاب اترے ہیں

انعم جمیل

Scanned with CamScanner

بے بس شام

ایک ڈھلتی بے بس سی شام میں
میں یونہی تنہا ڈھلتے آفتاب کی
مدھم ہوتی کرنوں کو
دیکھتے ہوئے سوچتی ہوں
جستجوئے منزل کی راہوں پر اور کتنا
چلنا ہوگا
رنج والم کتنا سہنا ہوگا
تھکے تھکے نڈھال پنچھیوں سے پوچھتی ہوں
کہ اک آشیانے کا کب ملنا ہوگا
میں جو تنہا ہوں
خود سے جدا ہوں
اس دوری کا کب ملنا ہوگا
کب ملنا ہوگا؟

ماریہ خان

کوئی سلسلہ نہیں جاوداں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی
میں تو ہر طرح سے ہوں رائیگاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

میں یہ چاہتا ہوں کہ عمر بھر رہے تشنگی مرے عشق میں
کوئی جستجو رہے درمیاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

مرے ہم نفس تو چراغ تھا تجھے کیا خبر مرے حال کی
کہ جیا میں کیسے دھواں دھواں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

نہ ترا وصال وصال تھا نہ تری جدائی جدائی ہے
وہی حالت دل بدگماں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

مرے نقش پا تجھے دیکھ کر یہ جو چل رہے ہیں انہیں بتا
ہے مرا سراغ نہ مرا نشاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

اظہر فراغ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

• اس منبر کے پاس جو بھی بندہ یا بندی گناہ والی (جھوٹی) قسم کھائے گا، خواہ تازہ مسواک کے لیے کھائے، اس کے لیے جہنم واجب ہو جائے گی۔"

(مسند احمد)

فوائد و مسائل۔

• باہمی اختلاف اور جھگڑے کے فیصلے کے لیے قسم لینا اور قسم کھانا جائز ہے، بشرطیکہ یہی قسم ہو۔ گناہ صرف جھوٹی قسم کھانے میں ہے۔

• کسی عام جگہ گناہ کرنے کی نسبت احترام والی جگہ گناہ کرنا زیادہ بڑا ہے اور اس کی سزا بھی زیادہ سخت ہوگی۔

• مسجد دوسرے مقامات سے زیادہ احترام کی جگہ ہے۔

• تمام مساجد میں سے سب سے زیادہ احترام والی مسجدیں تین ہیں۔ مسجد حرام جس میں کعبہ شریف ہے۔ مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔

• مسجد میں منبر کے قریب کی جگہ زیادہ تقدس کی حامل ہے۔ خصوصاً مسجد نبوی کے قریب کی جگہ تو جنت کا باغیچہ فرمایا گیا ہے۔

• ارشاد نبوی ہے۔ "میرے گھر (حجرہ عائشہ رض) اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

اس مقام پر جھوٹی قسم کھانا انتہائی بری حرکت اور بہت بڑا گناہ کیوں نہ ہے۔ خاص طور پر جب کہ قسم کسی معمولی چیز کے لیے ہو تو اور بھی بری بات ہے۔

تقدیر کے بارے میں باتیں،

حضرت عبدالرحمن بن اجری رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کسی آدمی نے آکر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا کہ کچھ لوگ تقدیر کے بارے میں غلط باتیں کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رض نے کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔

• اے لوگو! تم سے پہلی امتیں تقدیر کے بارے میں غلط باتیں کر کے ہی ہلاک ہوئی ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں عمر کی جان ہے۔ اگر دو آدمیوں کے بارے میں، میں نے یہ سنا کہ یہ تقدیر کے بارے میں (اپنی عقل سے) باتیں کرتے ہیں تو میں دونوں کی گردن اڑا دوں گا۔"

راوی کہتے ہیں حضرت عمر رض کا یہ اعلان سن کر تمام لوگوں نے تقدیر کے بارے میں بات کرنی چھوڑ دی۔ پھر حجاج کے زمانے میں شام میں ایک جماعت ظاہر ہوئی جس نے سب سے پہلے تقدیر کے بارے میں بحث کرنا شروع کی۔

گالیاں،

گالیاں دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا ذخیرۂ الفاظ محدود ہے۔ ہمیں اپنے اوپر قابو نہیں ہے اور ہم ڈسپلن کو نہیں مانتے۔

جدوجہد،

تاریخ بتاتی ہے کہ مشہور ترین لوگوں کو کامیابی سے پہلے دل توڑ دینے والی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس وجہ سے جیت جاتے ہیں کہ وہ اپنی ناکامیوں کے باوجود حوصلہ نہیں ہارتے۔

(بی سی۔ فوربس)

محنت،

مشہور مصور مائیکل اینجلو کہتا ہے۔
"اگر لوگ جان سکتے کہ میں نے فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے کتنی محنت کی ہے تو انہیں میرا فن حیران کن نہیں لگے گا۔"

خطرہ مول لینا،

صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہ کرنا ایک بیماری ہوتی ہے لوگ اس کی وجہ سے بے شمار مواقع کھو بیٹھتے ہیں۔
کامیابی کے لیے خطرہ مول لینا پڑتا ہے لیکن خطرہ مول لینے اور جوا کھیلنے میں بڑا فرق ہے۔ خطرہ مول لینے والے لوگ آنکھیں کھول کر آگے بڑھتے ہیں جبکہ جواری اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔
ایک بار ایک شخص نے ایک کسان سے پوچھا۔
"کیا اس بار تم نے گندم بوئی ہے؟"
کسان نے کہا: "نہیں، مجھے ڈر ہے کہ اس بار بارش نہیں ہوگی۔"
اس شخص نے پوچھا: "تو کیا مکئی بوئی ہے؟"
کسان نے کہا: "نہیں، مجھے ڈر ہے کہ کیڑے فصل کھا جائیں گے۔"
اس شخص نے پوچھا: "تو پھر تم نے کیا بویا ہے؟"
کسان نے کہا: "کچھ بھی نہیں۔ میں خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔"

تربیت،

بچپن میں ایک بار اپنے والد کے ساتھ سرکس کا شو دیکھنے گیا۔ ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے قطار میں کھڑے تھے۔ ہم سے آگے ایک فیملی تھی جس میں چھ بچے اور ان کے والدین تھے، یہ لوگ دیکھنے میں خستہ حال تھے۔ ان کے بدن پر پرانے مگر صاف ستھرے کپڑے تھے۔ بچے بہت خوش تھے اور سرکس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ان کا نمبر آیا اور ان کا باپ ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور ٹکٹ کے دام پوچھے۔ جب اسے ٹکٹ کے دام بتائے تو وہ ہکلاتے ہوئے پیچھے کو ہٹا اور اپنی بیوی کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے چہرے سے اضطراب عیاں تھا۔ تب ہی میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ انہوں نے اپنی جیب سے بیس ڈالر کا نوٹ نکالا، اسے زمین پر پھینکا پھر جھک کر اسے اٹھایا اور اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"جناب! آپ کے پیسے گر گئے ہیں، لے لیں!"
اشک آلود آنکھوں سے اس شخص نے میرے والد کو دیکھا اور کہا۔
"شکریہ محترم!"
جب وہ فیملی اندر داخل ہو گئی تو میرے والد نے میرا ہاتھ پکڑ کر قطار سے باہر کھینچ لیا اور ہم واپس لوٹ گئے۔ کیونکہ میرے والد کے پاس وہی بیس ڈالر تھے۔ جو انہوں نے اس شخص کو دے دیے تھے۔
اس دن سے مجھے اپنے والد پر فخر ہے۔ وہ منظر میری زندگی کا سب سے خوب صورت شو تھا۔ اس شو سے بھی زیادہ جو ہم اس دن سرکس میں نہیں دیکھ سکے۔ اور تب ہی سے یہ میرا ماننا ہے کہ تربیت کا تعلق عملی نمونے سے ہے، محض کتابی نظریات سے نہیں۔

سچی باتیں،

- تم وہاں سکون چاہتے ہو جہاں آدم کو سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا۔
- عقل کی کروڑوں دلیلیں اللہ تعالیٰ سے ایک گناہ بھی معاف نہیں کرا سکتیں لیکن ندامت کا ایک آنسو زندگی بھر کے گناہ معاف کرا سکتا ہے۔
- اگر دو سروں کو گرانے میں آپ کو جیت لگے تو سمجھ لیں کہ آپ خود ایک گرے ہوئے انسان ہیں۔
- جو انسان یہ کہتا ہے کہ اللہ جو کرتا ہے، وہ ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے، وہ کمال کا ایمان رکھتا ہے۔
- طوفانی رات میں جب گھونسلے تباہ ہو جاتے ہیں اور پرندے ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں پھر بھی وہ شکایت کرنے کی بجائے صبح اللہ کے ذکر میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ناہید اسماعیل ۔ کراچی

جیت

جیت جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

وکیل

ہر خاندان میں "غصے کے تیز" بندے کا ایک وکیل موجود ہوتا ہے۔ جو سب کو بتاتا ہے "یہ غصے کا تیز ضرور ہے لیکن دل کا برا نہیں ہے۔"

آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں

ریسرچ کے مطابق آج کل ذہنی دباؤ کی ایک بڑی وجہ اپنے اردگرد کے کم عقلوں سے نمٹنا ہے۔
ایک دانا شخص سے کسی نے پوچھا: "آپ اتنے خوش کیسے رہتے ہیں؟"
اس نے کہا: "میں بے وقوف لوگوں سے بحث نہیں کرتا۔"
پوچھا: "پھر کیا کہتے ہو؟"
دانا شخص بولا: "انہیں جواب دیتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"
پوچھنے والے نے کہا: "یہ معمولی بات یا اپنا موقف منوانے کے لیے اسے قائل کرنے کے لیے آپ کو کوئی دلیل، کوئی ثبوت تو دینا چاہیے۔"
اس پر اس دانا شخص نے پوچھنے والے کو تاریخی جواب دیا۔
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

سرپرائز

برسوں بعد آج اس کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ ابھی خود کی سیلری سے اس نے آج ایک نئی کار لی۔ سوچا آج گھر جا کر بیوی کو سرپرائز دوں گا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے بیوی کو آواز دی۔
"ارے سنتی ہو، دیکھو تمہارے اتنے سالوں کا خواب آج پورا ہو گیا۔"
بیوی کچن سے گھبرا کر دوڑتی ہوئی آئی اور اپنا سر پیٹتے ہوئے چلا کر کہنے لگی۔
"ہائے اللہ! ساسو ماں کو کیا ہو گیا۔ صبح تو اچھی خاصی تھیں۔"

بڑھیا کی حیرانی

بڑھیا کو لوگوں نے بتایا کہ یہی خلیفہ کا مکان ہے تو وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی۔
دروازے پر۔۔۔ اسے کسی دربان نے روکا بلکہ اسے کوئی دربان نظر ہی نہ آیا تو اس نے سوچا کہ شاید کسی نے اس کے ساتھ دلچسپ مذاق کیا ہے۔
گھر بے سروسامان تھا۔ ضرورت کی چیزیں موجود تھیں لیکن شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔
بڑھیا نے خاتون خانہ کو دیکھا تو اس کی طرف بڑھی۔
"بیٹی! مجھے تو یہ گھر کچھ اجڑا اجڑا سا لگتا ہے۔"
خاتون خانہ نے مسکراتے ہوئے کہا: "ماں! یہ گھر اس لیے اجڑا ہوا نظر آتا ہے کہ اس کے ذریعے اجڑے ہوئے گھر بسائے جاتے ہیں۔"
بڑھیا نے خاتون خانہ کے لہجے میں ایک ایسا اطمینان محسوس کیا جو کسی کے ہاں نہیں دیکھا تھا۔

چند باتیں آپ کے لیے

- آنکھ والا وہ ہے جو اپنے آپ کو دیکھے۔
(کنفیوشس)
- عزیز چیزوں کے بندھن سے لگاؤ ہے اسے جب ہے خوف، کیونکہ عزیز چیزوں سے غم پیدا ہوتا ہے اور عزیز چیزوں سے ہی خوف۔
(گوتم بدھ)
- خاموشی اظہار نفرت کا بہترین طریقہ ہے۔
(برنارڈ شا)
- پہلے گناہ پر لطف معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ آسان ہو جاتا ہے، پھر اس سے مسرت ہونے لگتی ہے۔ پھر بار بار کیا جاتا ہے، پھر وہ عادت بن جاتا ہے۔ پھر آدمی گستاخ بن جاتا ہے اور پھر وہ تباہ ہو جاتا ہے۔
(جان ملٹن)
- اچھی سیرت برائیوں سے بچنے کا نام نہیں بلکہ ذہن میں برائی نہ کرنے کی خواہش پیدا ہونے کا
(برنارڈ شا)

خواتین کی ڈائری

ترتیب: امت الصبوح

نائلہ سہیل — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سیدکامی شاہ کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

خوب جھگڑا کریں، خوب گریہ کریں
آؤ مل جل کے پھر اک تماشا کریں

وہ جو سب کچھ اب وہ نہیں ہے کہیں
اب کسی اور کی کیا تمنا کریں

ٹوٹنا دل کا کوئی نئی بات ہے
بات بھی ہو کوئی جس کا چرچا کریں

آگہی کا سفر یوں کہ دشوار ہے
جو نہیں چل رہا اس کو چلتا کریں

دل نہیں لگ رہا ہے کہیں بھی مرا
اس اذیت میں تھوڑا اضافہ کریں

اس کی آنکھوں میں ڈوبیں، کنارے لگیں
ایک ہی عشق ہو اور ایسا کریں

تقساء احمد — کی ڈائری سے

زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرتی منظر وارثی کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے، آپ سب کی نذر۔

وہ نہ آئے تو ہوا بھی نہیں آیا کرتی
اس کی خوشبو بھی اکیلی نہیں آیا کرتی

ہم تو آنسو ہیں ہمیں خاک میں مل جانا ہے
میتوں کے لیے ڈولی نہیں آیا کرتی

بستر ہجر پہ سویا نہیں جاتا اکثر
نیند آتی تو ہے گہری نہیں آیا کرتی

مل الاعلان کیا کرتا ہوں سچی باتیں
چور دروازے سے آندھی نہیں آیا کرتی

صرف رنگوں سے کبھی رس نہیں ٹپکا کرتا
کاغذی پھول پہ تتلی نہیں آیا کرتی

عشق کرتے ہو تو آلودہ شکوہ کیوں ہو
شہد کے لہجے میں تلخی نہیں آیا کرتی

موت نے یاد کیا ہے کہ، منظر اس نے
اپنی مرضی سے تو ہچکی نہیں آیا کرتی

ناہید اسماعیل — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ڈاکٹر راحت اندوری کی یہ غزل معاشرے کی کیا خوب عکاسی کرتی ہے آپ سب کی نذر۔

انصاف ظالموں کی حمایت میں جائے گا
یہ حال ہے تو کون عدالت میں جائے گا

دستار نوچ نوچ کے احباب لے اڑے
سر بچ گیا ہے یہ بھی شرافت میں جائے گا

دوزخ کے انتظام میں الجھا ہے رات دن
دعویٰ یہ کر رہا ہے کہ جنت میں جائے گا

خوش نصیبوں کی بھیڑ میں تو بھول کیوں گیا
پہلے مرے گا بعد میں جنت میں جائے گا

واقف ہے خوب جھوٹ کے فن سے یہ آدمی
یہ آدمی مزید سیاست میں جائے گا

شائستہ نسرین کی ڈائری سے

موجودہ دور میں دوستوں اور رشتہ داروں کے رویوں کو بیان کرتی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ منیر نیازی کی خوبصورت غزل آپ کے لیے۔

ہم زباں میرے تھے ان کے دل مگر اچھے نہ تھے
منزلیں اچھی تھیں میرے ہم سفر اچھے نہ تھے

جو خبر پہنچی یہاں تک اصل صورت میں نہ تھی
تھی خبر اچھی، مگر اہل خبر اچھے نہ تھے

بستیوں کی زندگی میں بے بسی کا ظلم تھا
رنگ اچھے تھے وہاں کے، اہل دنیا اچھے نہ تھے

ہم کو خوباں میں نظر آتی رہیں کتنی خوبیاں
جس قدر اچھے لگے، اس قدر اچھے نہ تھے

اس سلیقے سے نہیں گھر میں محبت کی ادا
اس محبت کی ادا کے، منتظر اچھے نہ تھے

اک خیال خام ہی مرشد تھا ان کا منیر
یعنی اپنے شہر میں اہل نظر اچھے نہ تھے

حنا سلیم اللہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر پروین شاکر کی یہ غزل یقیناً قارئین کو پسند آئے گی

بعد مدت اسے دیکھا، لوگو
وہ ذرا بھی نہیں بدلا، لوگو

خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا، لوگو

اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا، لوگو

اجنبی بن کے جو گزرا ہے ابھی
تھا کسی وقت میں اپنا، لوگو

رات وہ درد مرے دل میں اٹھا
صبح تک چین نہ آیا، لوگو

پیاس صحراؤں کی پھر تیز ہوئی
ابر پھر ٹوٹ کے برسا، لوگو

انیقہ کی ڈائری سے

اس میں کوئی شک نہیں کہ جان سے عزیز زبان اردو کا دامن غزل کے دلکش بیش بہا خزانوں سے بھرا ہے حالانکہ بعد میں غزل کے لہجے میں خوب تبدیلیاں آئیں مگر میر، مومن، مرزا کی کلاسیکی شاعری ہے اس کی بات ہی الگ ہے نا۔ زبان کی چاشنی، الفاظ کا ترنم اور سلاست دیکھیے۔ ایسی ہی ایک غزل مرزا داغ دہلوی کے کلام سے

(میری پسندیدہ)

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

نہ مزا ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں
کوئی غیر غیر ہوتا، کوئی یار، یار ہوتا

یہ مزہ تھا دل لگی کا، کہ برابر آگ لگتی
نہ تمہیں قرار ہوتا نہ ہمیں قرار ہوتا

ترے وعدے پر ستم گر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

فرحانہ ——— گوجرہ

دشمنی رسم جہاں ہے، دوستی حرف غلط
آدمی تنہا کھڑا ہے ظالموں کے سامنے

حسینہ علی ——— مانسہرہ

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
وہ اسی زندگی پہ مرتے ہیں
جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی

شازیہ گلزار ——— منڈی ٹاؤن بھکر

وہ عجیب شام تھی، آج تک مرے دل میں اس کا ملال ہے
مری طرح جو تری منتظر، ترے راستے میں کھڑی رہی
ہوئی اس سے جب مری بات بھی، شریک درد وہ ذات بھی
تو نجانے کون سی چیز کی، مری زندگی میں کمی رہی

تحریم ——— کراچی

یہ کیا سفر تھا کہ جب لوگ لوٹ کر آئے
تو بس غبار ندامت ہی دامنوں میں تھا

عباسی ——— ہری پور

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کہ تھک بھی چکے اور ہار بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

عائشہ ——— بہاولپور

دوست بھی راہ کی دیوار سمجھتے ہیں مجھے
میں سمجھتا تھا مرے یار سمجھتے ہیں مجھے
میں بدلتے ہوئے حالات میں ڈھل جاتا ہوں
دیکھنے والے اداکار سمجھتے ہیں مجھے

عابدہ ——— لاہور

وقت کٹھن تو تھا مگر اپنا جنوں بھی کم نہ تھا
ہجر کے دن بھی کٹ گئے روز حساب کی طرح

نمرہ اقرا ——— کراچی

جانے والا یادوں کے دو عکس ادھورے چھوڑ گیا
اک تصویر جدائی کی، اک منظر حیرانی کا
ہانک رہے ہیں، باندھ رہے ہیں، کھول رہے ہیں کشتی کو
اس نے کام ہمیں سونپا ہے فکر کی نگرانی کا

اقرا ——— خانیوال

شبنم کے آنسو پھول پر یہ تو وہی قصہ ہوا
آنکھیں مری بھیگی ہوئی، چہرہ ترا اترا ہوا
برسات میں دیوار و در کی ساری تحریریں مٹیں
دھویا بہت، مٹتا نہیں تقدیر کا لکھا ہوا

ھذا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— گلستان جوہر

فلسفہ عشق میں پیش آئے سوالوں کی طرح
ہم پریشاں ہی رہے اپنے خیالوں کی طرح
ذکر جب ہوگا محبت میں تباہی کا کہیں
یاد ہم آئیں گے دنیا کو حوالوں کی طرح

عفت ——— ٹوبہ ٹیک سنگھ

مجھ کو درپیش ہے ہم سفر ایسا سفر درپیش ہے
راستہ کٹ بھی گیا تو فاصلہ رہ جائے گا

فرحت ——— واہ کینٹ

کیسی رہیں رونقیں کوئی ذرا بتائے بھی
میرے کمال کے بغیر، اس کے جمال کے سوا

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

وہ مکان، وہ گلی، وہ لوگ تو ہیں
کوئی اپنا، وہاں نہیں ہے تو کیا
جو مرے روز و شب کا قصہ ہے
وہ تری داستاں نہیں ہے تو کیا

فوزیہ ——— گجرات

کافی ہے میرے دل کی تسلی کو یہی بات
آپ آ نہ سکے، آپ کا پیغام تو آیا
اپنوں نے نظر پھیری تو دل نے دیا ساتھ
دنیا میں کوئی دوست مرے کام تو آیا

خبریں گربیں

واصفہ سہیل

سخت ضابطہ اخلاق بنانا چاہیے تاکہ بڑھتے ہوئے منفی رجحان کو روکا جا سکے۔

دکھاوا

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ فنکاروں کی زندگی کے معاملات بھی سدھرتے چلے جاتے ہیں۔
ایک انٹرویو میں بہروز سبزواری نے کہا کہ "وہ اب سمجھ دار ہو چکے ہیں اور عوام کے سامنے لڑتے جھگڑتے نہیں (یعنی پہلے لڑتے تھے؟) انہوں نے کہا کہ آج کل کے جوڑے (شوبز کے) عوام کے سامنے جتنا دکھاوے کا پیار کرتے ہیں اتنا ہی ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔
بہروز سبزواری کے مطابق نوجوان عوام کے سامنے جعلی پیار کرتے ہیں۔ مگر گھر میں حد سے زیادہ لڑتے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔
اپنی شادی کے متعلق بات کرتے ہوئے انہوں

شکایت

اداکارہ بشریٰ انصاری نے کہا ہے کہ سوشل میڈیا پر دلیل کے بجائے اپنے نظریات تھوپنے اور ذاتیات پر حملے کرنے کا رجحان انتہائی خطرناک ہے۔ جسے روکنے کی اشد ضرورت ہے۔
بشریٰ انصاری نے مزید کہا کہ سوشل میڈیا پر جس کی چاہے پگڑی اچھالی جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگوں کو گرفت میں لانے کے لیے کوئی ضابطہ اور قانون موجود نہیں۔ سوشل میڈیا پر جس طرح کے کمنٹس آتے ہیں، وہ ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔
میں نوجوان نسل سے کہوں گی کہ وہ اپنے اندر قوت برداشت پیدا کریں اور کسی پر تنقید کرنی ہے تو دلائل سے بات کریں۔ کسی کی ذاتیات پر حملہ کرنے کے بجائے تنقید برائے اصلاح کریں۔ انہوں نے متعلقہ اداروں کو بھی کہا کہ نہیں سوشل میڈیا کے حوالے سے

نے کہا کہ شادی سے قبل جاوید شیخ کے ہمراہ سفینہ کے لیے آنے والے رشتے دیکھا کرتا تھا کئی مسترد بھی کیے۔ (اپنی نظر جو تھی) ۔۔۔

پہچان

حنا دل پذیر کا نام آتے ہی ذہن میں قدوسی صاحب کی بیوہ، برنس روڈ کی نیلوفر، محبت بھاڑ میں جائے اور بلبلے کی مومو یاد آجاتی ہے انہوں نے لاتعداد یادگار کردار کیے ہیں۔

حنا دل پذیر کا کہنا ہے کہ حقیقی شہرت اور مقام کو برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ بے شمار ایسے فنکار ہیں جنہوں نے ٹی وی پر کم کام کیا لیکن اپنی بہترین اداکاری کی وجہ سے آج بھی پہچانے جاتے ہیں (جیسے شہناز شیخ) میں نے مختصر عرصے میں جتنی کامیابیاں سمیٹی ہیں اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کی ذات کا کرم ہے۔

میں اپنے تمام سینئرز کی عزت کرتی ہوں وہ میرے لیے قابل احترام ہیں اور میں سب کو پسند کرتی ہوں۔ (کن سب کو؟) اچھی اداکاری کے ساتھ خوب صورتی کی بھی قائل ہوں۔

☆☆

بقیہ خط آپ کے

جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ شجاع اور رخشی کا ساتھ بنا بنایا، کیسے ٹوٹتا لیکن یہ ثبت تھا کہ شجاع بھی بیوی کے ساتھ خوش رہے اور رخشندہ کو بھی ڈھیروں پیار ملا وہ بھی مطمئن زندگی گزارتی رہیں۔ فرق میں سکندر کے خیالات گاؤں والوں کے متعلق جان کر برا لگا۔ من مست مگن بہت پیاری کہانی تھی کچھ کچھ میری زندگی سے ملتی جلتی تھی۔ میں بھی ایک افسر کی بیٹی تھی۔ ایک کسان کی بہو بنی۔ اپنے عالی شان کے مکان چھوڑ کر کچے مکان اور صحن میں پہنچ گئی جہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ میں نے جون جولائی کے روزے وہاں گزارے اور صبر و شکر سے گزارا کیا۔ چھ سال کے بعد شہر میں گھر بنوایا۔ من مست مگن رہی۔ کبھی شکوہ نہ کیا۔

ج: زرینہ لغاری! اس بار بھی آپ کا خط لیٹ ملا۔ ستمبر کے شمارے پر تبصرہ اس ماہ شامل اشاعت ہے آپ کبھی کبھی اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے جو چند سطریں لکھ دیتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ شجاع کے سلسلے جب تم سے ناتا جوڑا ہے کے سلسلے میں اپنے تجربات لکھ کر بھجوائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہوں گے۔

بھرپور تبصرے کے لیے شکریہ

فریحہ اشتیاق، لائبہ منظور...... گوجرانوالہ

نا مکمل اچھا نہیں، بلکہ بہت اچھا تھا۔ عندلیب زہرا سے ملاقات اچھی لگی اور میری فیورٹ رائٹر سائرہ رضا کی ایک بات دل میں گڑ گئی ہے ہمیشہ کے لیے۔ کہ نئے لکھنے والے کی ہر تحریر پڑھتی ہوں اور کوئی پڑھے یا نہ پڑھے سائرہ رضا ضرور پڑھتی ہے آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں یہ الفاظ مجھ پر کیسا اثر کر گئے بہت شکریہ۔ مالا، کیا کہوں، نمرہ جی پڑھنے والے کی بولتی بند کر دیتی ہیں۔ میری پسندیدہ ترین نمرہ جی شکریہ، ہمارے لیے ایک اور یادگار اور لاجواب ناول لکھنے کے لیے ہنک ہام کو ابھی سمجھنے کی کوششوں میں ہوں ویسے میرا احمد کی ہر تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ اب آتی ہوں، کچھ گلے شکووں کی طرف۔ جب فون کروں اصل صاحبہ میرا فون اٹھانا گوارہ ہی نہیں کرتیں کیوں؟

ج: پیاری فریحہ! آپ کے خط شائع نہیں ہوئے یہ محض اتفاق ہے۔ آپ ہماری قاری ہی نہیں مصنفہ بھی ہیں۔ ہم آپ کا خط بھلا کیوں نہیں شائع کریں گے۔

آپ کی کچھ تحریریں غیر معمولی طوالت کی بنا پر شامل نہ ہو سکیں۔ کیونکہ پرچے میں پہلے ہی قسط وار تحریریں چل رہی ہیں۔ ہمیں کچھ تحریریں مکمل بھی دینا ہوتی ہیں اور ایک ہی قسط میں دیں تو دوسری تحریروں کی گنجائش نہیں نکلے گی۔

ماہ نور جمال...... اورنگی ٹاؤن کراچی

مجھے پڑھنے کا بے حد شوق ہے اور سچ بتاؤں میں جلدی کسی سے متاثر نہیں ہوتی مگر میرا احمد کے الفاظ لگتا ہے جادو ہیں۔ مجھ پر بہت اثر کیا ہے۔ اپنی لکھی ہوئی کہانی بھیج رہی ہوں اگر یہ قابل اشاعت نہیں تو میری اصلاح کی جائے اور اگر قابل اشاعت ہے تو شائع کیا جائے اور میری ہمت اور حوصلہ بڑھایا۔ میں چھٹی کلاس کی طالبہ ہوں اور مجھے خود شاعری کا شوق ہے جو کہ میں کرتی بھی ہوں اور کہانیاں بھی لکھتی ہوں اور اپنی اس صلاحیت کو منظر عام پر لانا چاہتی ہوں، مجھے لگتا تھا۔ میں بے حس ہوں مگر پھر احساس ہوا کہ مجھ پر الفاظ اثر کرتے ہیں اور یہ احساس

تصحیح

عمیرہ احمد ہمارے قارئین کی پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ ایک انٹرویو میں کچھ جملے ایسے کہے گئے، جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ عمیرہ احمد کی کسی تحریر میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ عمیرہ کی تحریروں کو ایڈٹ نہیں کیا گیا۔ ان کی تحریریں جوں کی توں شائع کی جاتی رہی ہیں۔

خوش کن ہے میں بہت حساس واقع ہوئی ہوں۔

ج: پیاری ماہ نور! حساس ہونا اچھی بات ہے حساس لوگ عموماً ذہین ہوتے ہیں۔

چھٹی کلاس کے لحاظ سے آپ کی لکھائی بہت اچھی ہے۔ آپ کی لکھائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذہین ہیں بلکہ لکھ سکتی ہیں لیکن فی الحال آپ اپنی تعلیم پہ توجہ دیں۔

ندا رفیق ...... چک جھمرہ شی

نمرہ احمد کا ناول مالا بہت انٹرسٹنگ جا رہا ہے۔ دانہ پانی بھی کافی اچھا ہے عمیرہ احمد کے ناول کی ایک خاص بات ہے ان کے ناولز میں سچائی ہوتی ہے اور محبت آسمان سے اترتی ہے۔ (جیسے موتیا کی ذات ماشکی ہے) (ہماری ذات بھی ادھر گاؤں میں یہی ہے) اب دیکھیں مراد کو موتیا اینڈ پہ ملتی ہے یا نہیں...... مشک بام کافی تاریخی ہے۔ ویلڈن سمیرا حمید جی! نایاب جیلانی سے ملاقات کر کے بہت اچھا لگا۔ سونیا ربانی اور عندلیب زہرا کے افسانے بہت اچھے لگے۔

ج: پیاری ندا! آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ اطمینان رکھیں قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہو گا۔ آپ نے اچھا کیا کہ اپنے فون نمبرز لکھ دیے۔ اگر کوئی بہتری کی گنجائش ہوئی تو ہم آپ کو فون پر اطلاع دیں گے۔ ذات پات انسانوں کی بنائی تفریق ہے۔ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر وہ ہے جو نیک اعمال کرتا ہے۔ کتنی بڑی بے وقوفی ہے انسان اس چیز پر فخر کرتا ہے جس پر اسے اختیار ہی نہیں۔ نہ اپنے پیدا ہونے پر نہ اس دنیا سے رخصت ہونے پر۔ باقی رہنے والے تو صرف اعمال صالحہ ہیں۔

رمشا روشن ...... الہ آباد

میں نے نومبر 2021ء سے خواتین باقاعدہ پڑھنا شروع کیا۔ پہلے صرف شعاع کو پڑھتی تھی۔ نمرہ احمد، سمیرا حمید اور عمیرہ احمد کی موجودگی نے خواتین کو چار چاند لگا رکھے ہیں۔ نمرہ احمد کے کس رخ کی تعریف کروں۔ مالا مجھے بالکل اپنی طرح لگتی ہے فوراً ہر کسی کی بات پر یقین کر لیتی ہے۔ ایسا کام جو اس نے کیا بھی نہ ہو اس پر بھی گلٹ فیل کرتی ہے جیسے شکور کی جاب جانے کی وجہ وہ خود کو کہتی ہے۔

سمیرا حمید کی چنچل چراغ اور اس سے بھی بڑا بے حس شمس اف...... ہم دونوں بہنوں کا فیورٹ ناول "مشک بام" ہے، حویلی کے دالانوں اور ستونوں کی اوٹ سے چراغ کی شرارتیں دیکھنا (تصور کی آنکھ سے) ہمارا مشغلہ ہے۔ اب تو وہ آگئی ہیں ہے میری بہن کہتی ہے۔ سمیرا آپی سے کہو، اب شادی ہو جانی چاہیے پاک دامن کی۔ سارے زمانے کی گالیاں سن چکی ہے اب تو چراغ اور پھر اسے محبت بھی اتنی ہی ملتی ہے (رشک آتا ہے ہمیں)

دانہ پانی مراد اور موتیا کا ایسا پیار اور پھر شک؟ اف کہانی اچھی تو لگتی ہے پر یہ اتنی یونیک سی ہے محبت کی کہانی ہے۔ کچھ میچ آیا ہے اب۔ دیکھیں اب ماہ نور کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ خط لکھنے کی وجہ ہے میرے افسانے ارمان کی پسندیدگی کا اظہار۔ ناہید اسماعیل کی تعریف اگرچہ ایک جملے پر مشتمل تھی پھر بھی دل بہت خوش ہوا۔ تھینکس آلاٹ ناہید اسماعیل۔ گوشی جمال آپ کو میرا افسانہ پسند آیا بہت بہت شکریہ آپ کا۔

اور صدف ناصر جب آپ میرا ذکر کرتی ہیں اپنی دعاؤں میں اپنے سلام میں تو میری ہارٹ بیٹ مس ہو جاتی ہے۔ (قسم سے) میری آپ سے دوستی ہو چکی ہے (یک طرفہ ہی سہی) اقم وجاہت اور صفیہ مہر کے لیے اولاد کی دعائیں۔

ج: پیاری رمشا واہ بھئی۔ آپ واحد ہیں جن کو چراغ چنچل لگی ورنہ اس کی حرکتوں پر ہماری قارئین نے اسے بے حس کے خطاب دیے۔ انہوں نے چراغ کی شرارتوں کو بدتمیزی قرار دیا جبکہ شمس سے سب ہی کو ہمدردی ہے۔ اب یہ جان کر خوشی ہوئی کہ چراغ کا بھی کوئی ہمدرد ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

عتیقہ منیر خواجہ

س: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں پسند ناپسند، غذائیت، گھر والوں کی صحت؟

ج: غذا اور صحت لازم و ملزوم ہیں۔ غذا کے پکانے اور کھانے میں احتیاط ضروری ہے چنانچہ ہم بھی غذائیت کو اولیت دیتے ہیں۔

س: اچانک مہمان آگئے کھانے کا وقت ہے کسی ایسی ڈش کا نام جو فوری تیار کر کے مہمانوں کو کھلا سکیں؟

ج: اچانک آجانے والے مہمانوں کے لیے بہت سی جھٹ پٹ ڈشز بنائی جا سکتی ہیں۔ مگر میں اچار گوشت بناؤں گی۔ کیونکہ یہ جلد بن جاتی ہے نہایت لذیذ بھی ہے اور میرے خاوند کی من پسند ڈش ہے۔ ترکیب درج ذیل ہے۔

اچار گوشت

اجزاء:

مرغی کا گوشت	آدھا کلو
تیل یا گھی	آدھا کپ
دہی	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چار عدد
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
میتھرے	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ

1۔ پیاز کو تیل میں سنہری کر کے گوشت، لہسن ادرک ڈال کر اتنا بھونیں کہ گوشت کا پانی خشک ہوجائے۔

2۔ دہی میں نمک مرچ ڈال کر پھینٹ لیں اور گوشت میں ڈال کر پکنے دیں۔ جب دہی تقریباً خشک ہونے کو ہو تو سونف، میتھرے، زیرہ اور ہری مرچیں ڈال کر دس منٹ ہلکی آنچ پر دم دیں اور تندوری روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا اہتمام کرتی ہیں؟

ج: کچن کی صفائی عمومی اور خصوصی دونوں اہتمام کی متقاضی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے روزانہ ہی وقت دینا پڑتا ہے۔

س: صبح کا ناشتا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ کوئی خصوصی ترکیب؟

ج: روزانہ سب کا ناشتا مختلف ہوتا ہے۔ زیادہ تر ناشتا میں پراٹھا، آملیٹ بنتا ہے۔ آملیٹ میں تھوڑا سا بیسن ملا کر فرائی کریں اور ایک نیا ذائقہ پائیں۔

س: گھر سے باہر کھانا فیشن بنتا جارہا ہے آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: جب بھی کوئی باہر لے جائے تو میں فوراً تیار ہوجاتی ہوں۔ اچھے ریسٹورنٹس کی مختلف ڈشز ٹرائی کرنا اچھا لگتا ہے۔

س: کھانا پکاتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

ج: موسم یقیناً اثر انداز ہوتا ہے۔ میاں صاحب کو سردی کی بارش میں بیسن کا حلوہ اور ساسو ماں کو گرمی چاہیے۔ بچوں کو چپس اور مجھے چائے۔ موسم کو دیکھتے ہی پسند بدل جاتی ہے۔

س: اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج: اچھا کھانا پکانا فن ہے اور ہر فن، محنت کا متقاضی ہوتا ہے۔ محنت کے بغیر اچھا کھانا میرے خیال میں نہیں بن سکتا۔ وقت دینا پڑتا ہے۔ سخت گرمی میں پسینہ بہانا پڑتا ہے۔ تب جا کے کھانا ذائقہ دار ہوتا ہے۔

س: کچن کی کوئی ٹپ؟

ج: فرائیڈ رائس بنانے کے لیے چاول ابال کر بالکل ٹھنڈے کرلیں اگر ڈنر کے لیے بنا رہی ہیں تو ناشتا کے بعد چاول ابال کر رکھ لیں بلکہ کچھ دیر فریج میں رکھ دیں۔

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

وائٹ بریانی

اجزا:۔

مرغی کا گوشت	ایک کلو
چاول	ایک کلو
پیاز	دو عدد
پیاز	ایک پیالی
ہری مرچیں	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
آلو بخارا	حسب پسند
ہرا دھنیا/پودینا	ایک ایک گٹھی
ثابت ہری مرچیں	چھ عدد
کیوڑہ	چند قطرے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک پیالی

چاول کے اجزا:

پانی	ابالنے کے لیے
نمک	دو کھانے کے چمچے
ثابت گرم مسالا	حسب ضرورت

ترکیب: دیگچی میں آدھا تیل گرم کرکے پیاز سنہری کریں۔ پھر لہسن ادرک اور پسی ہوئی ہری مرچیں ملا کر بھونیں۔ اس میں گوشت، دہی، زیرہ، ہری مرچیں، آدھا گرم مسالا اور نمک شامل کرکے گوشت گلنے تک پکائیں۔ اس میں آلو بخارے، ہرا دھنیا، پودینہ، تلی ہوئی پیاز اور کیوڑہ ملا لیں۔ چاولوں میں پانی ثابت گرم مسالا اور نمک ملا کر ایک کنی تک پکا کر چھان لیں۔ چاولوں کو دیگچی میں گوشت کے اوپر ڈالیں اس پر باقی تیل ڈال کر دم پر رکھ دیں۔

ساگ گوشت

اجزا:

سرسوں کا ساگ	تین پاؤ
گوشت	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
ادرک	دو کھانے کے چمچے
دودھ	ایک پیالی
بتھوے کا ساگ	ایک چھوٹی گٹھی
ہلدی	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
مرچ	حسب ذائقہ
ہری مرچ	چھ عدد
تیل	پکانے کے لیے

ترکیب: سرسوں اور بتھوے کا ساگ دھو کر باریک کاٹ لیں۔ سرسوں کے ساگ کی موٹی ڈنڈیاں چھیل لیں اور ان کو بھی باریک کاٹ لیں۔ دونوں ساگ ملا کر پانی میں گلا لیں اور پھر ان کو ٹھنڈا کر کے گھوٹ لیں — گوشت میں نمک مرچ اور ہلدی ڈال کر گلا لیں۔ گوشت گل جائے تو اس میں تیل ڈالیں پیاز اور ہری مرچ باریک کاٹ کر شامل کریں۔ دونوں چیزوں کو اچھی طرح بھون لیں۔ ادرک شامل کریں اور مزید دو تین منٹ بھونیں۔ باقی آدھی ہری مرچیں ڈالیں اور ایک منٹ بھونیں پھر اس میں ساگ ڈالیں اور ساتھ ہی دہی ڈال کر اچھی طرح بھونیں تاکہ ساگ کا پانی بالکل خشک ہو جائے۔ دودھ شامل کریں اور دو منٹ بعد آنچ بند کر دیں۔

ہانڈی نہاری

اجزا:۔

گائے کا گوشت	آدھا کلو
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ

Scanned with CamScanner

لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
الائچی	آدھا چائے کا چمچہ
جائفل جاوتری	چوتھائی چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	ایک کپ
پیاز	ایک عدد (بڑی)
بادیان کے پھول	دو عدد
سونف	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
آٹا	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
لیموں، ادرک	گارنشنگ کے لیے
ہرا دھنیا	گارنشنگ کے لیے

ترکیب: ایک ہانڈی میں گوشت نمک، لال مرچ، ہلدی، پیاز، پیا ہوا لہسن ادرک، تیل، پسی الائچی، گرم مسالہ، پسی جائفل جاوتری، بادیان، زیرہ، سونف پیس کر ڈال دیں اور پانی ڈال کر پکنے رکھ دیں۔

جب گوشت اچھی طرح گل جائے تو بھون لیں اور تھوڑا سا تیل ہانڈی سے نکال لیں۔ ہانڈی میں ڈھائی گلاس پانی شامل کرلیں۔ جب پانی میں ابال آجائے تو ایک کپ پانی میں آٹا گھول کر ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ کے لیے پکائیں سرونگ ڈش میں نکال کر ادرک، ہرا دھنیا اور لیموں کے ساتھ پیش کریں۔

چکن ویجی ٹیبل کٹلٹس

اجزا:

مرغی	ایک پاؤ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا	چوتھائی چائے کا چمچہ
کالی مرچ	چوتھائی چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
آلو	ایک کلو
انڈے	دو عدد
تیل	دو کپ
ادرک لہسن	آدھا چائے کا چمچہ
گاجر	آدھا کپ
ہری پیاز	چوتھائی کپ
ہری مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	تین عدد

ترکیب: آلو کو ابال لیں۔ اس میں لال مرچ، نمک، گرم مسالا، کالی مرچ زیرہ، ادرک لہسن کٹی مرچ، پسی ہری مرچ کے ملا کر یک جان کرلیں۔ مرغی میں سفید مرچ، نمک، گاجر، ہری پیاز مکس کر کے دس منٹ پکائیں۔ آلوؤں کو کٹلٹس کی شکل دے کر اس میں مرغی کی فلنگ بھردیں۔ تیل گرم کریں۔ کٹلٹس کو انڈے اور بریڈ کرمز میں رول کر کے تل لیں سنہری ہو جائیں تو نکال لیں۔

سوئٹ شیلز

اجزاء:

میدہ	ایک کپ
گھی	چوتھائی کپ
دودھ	آدھا کپ

سیرپ کے اجزاء

چینی	آدھا کپ
پانی	ڈیڑھ کپ
بیکنگ سوڈا	چٹکی بھر

ترکیب: میدہ اور گھی کو یک جان کرکے دودھ سے گوندھ لیں۔ اب ان کی گولیاں بنا کر انگوٹھے سے دبا کر شیل کی شکل دے کر گھی میں ڈیپ فرائی کرلیں۔

چینی اور پانی پکا کر تین تار کا شیرہ تیار کرلیں۔

پھر چولہے سے اتار کر شیرے میں بیکنگ سوڈا شامل کرلیں اور تلی ہوئی گولیاں اس شیرے میں ڈال دیں۔ مزے دار سوئٹ شیلز تیار ہیں۔

☆☆

میرے پاس بہت سی بہنوں کے خط آتے ہیں۔ جن میں بہنیں اپنی مصیبتوں، پریشانیوں اور خرابی، حالات کا ذکر کرتی ہیں۔ اکثر بہنوں کے حالات اتنے المناک ہوتے ہیں کہ انہیں پڑھ کر میں خود بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہوں۔ حالات بدلنا کس حد تک انسان کے اختیار میں ہے اور کس حد تک مقدر پر منحصر ہے۔ اس بحث سے قطع نظر میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر برے حالات میں ہمت ہار دی جائے تو حالات زیادہ برے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بھی زیادہ مشکلات میں گرفتار کر سکتا ہے۔ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو ہر چیز کا نتیجہ بہتر ہی ہوگا۔ پھر ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تمام ماہرین علم اور ماہرین نفسیات محسوس کرنے لگے ہیں کہ نماز اور مستحکم مذہبی عقیدہ، پریشانی، ڈر، خوف اور اعصابی کشمکش کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے جو کہ ہماری نصف سے زیادہ بیماریوں کے ذمہ دار ہیں۔

ایک ممتاز رہنما ڈاکٹر اے۔ اے برل کہتے ہیں۔

"جو شخص صحیح معنوں میں مذہب کا پابند ہوتا ہے، کبھی اعصابی اور ذہنی امراض کا شکار نہیں ہوتا۔"

ایک اور ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ "پریشانیوں کا شافی علاج مذہب ہے۔" اور ہمارے خیالات و تصورات ہماری شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔ اگر ہم خوشی اور مسرت کے خیالات رکھیں تو ہم خوش اور مسرور رہ سکتے ہیں، لیکن اگر اپنے خیالات کو بیمار بنائیں۔ یعنی خیالات کا انداز ایسا ہو جس میں ناکامی، بزدلی، یاسیت اور قنوطیت ہو تو یقینی طور پر ہماری کیفیت بھی ایسی ہی ہو جائے گی۔

جہاں تک مسائل کا معاملہ ہے، ہمیں اپنے مسائل پر دھیان تو ضرور دینا چاہیے، لیکن پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر کارل الیکس نوبل پرائز کے انعام یافتہ کہتے ہیں۔

"انسان دعا سے زیادہ طاقت ور چیز کوئی نہیں پیدا کر سکتا۔"

نوشین افضل، سیالکوٹ

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ والد دوبئی میں ہوتے تھے۔ وہاں سے جاب چھوٹی تو پاکستان واپس آ گئے۔ جاب کے دوران وہ بھی پاکستان آتے رہتے تھے۔ ان کا رویہ بہت زیادہ گرم جوشی اور محبت کا تو نہیں ہوتا تھا لیکن سخت بھی نہیں تھا۔ زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ اب جب سے پاکستان آئے ہیں۔ عجیب ہی حال ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ امی پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ بہت بے دردی سے مارتے ہیں۔ امی کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی ہے۔ ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا۔ مہینہ بھر پلاسٹر رہا۔ اللہ کا شکر ٹھیک ہو گیا۔ اب انہوں نے مجھ پر بھی ہاتھ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ کئی بار مارا۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ سوچتی ہوں گھر چھوڑ کر کسی ہاسٹل میں چلی جاؤں لیکن امی نہیں مانتیں۔ مالی پریشانی کوئی نہیں ہے۔ میں خود جاب کرتی ہوں۔ کئی مکان اور دکانیں ہیں جن کا کرایہ آتا ہے۔

ج۔ گھر چھوڑ نا مسئلے کا حل نہیں ہے جبکہ آپ کی امی بھی آپ کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ گھر چھوڑ کر جائیں گی تو لوگ باتیں بنائیں گے، آپ پر کوئی الزام بھی لگا سکتے ہیں۔ درحقیقت آپ کے والد ذہنی طور پر ڈسٹرب ہیں۔ یہ صورت حال مزید بگڑ سکتی ہے۔ فوری طور پر کسی سائیکاٹرسٹ سے ان کا علاج کرانے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں ذہنی مریضوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ذہنی مریض تو خود کو بیمار سمجھتا ہی نہیں

بلکہ اس کے گھر والے اور دیگر افراد بھی اسے ذہنی مریض نہیں سمجھتے۔ اسے اس کی عادت کی خرابی پر محمول کرتے ہیں والد کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا یا اس بات پر قائل کرنا کہ انہیں علاج کی ضرورت ہے کافی مشکل مرحلہ ہوگا۔ پہلے آپ کو خود کسی ڈاکٹر سے ٹائم لے کر ملنا ہوگا۔ اس کو اپنے والد کی کیفیت بتا کر کچھ دوا میں لینا ہوں گی۔ ان دواؤں کے استعمال سے آپ خود محسوس کریں گی کہ ان میں کافی بہتری آ گئی ہے۔ پھر آپ انہیں مکمل علاج کی طرف راغب کر سکتی ہیں۔

رابعہ۔ لاہور

عدنان بھائی......! میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ بات ایسی ہے کہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی۔ چپ رہتی ہوں تو خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں۔ آپ بتایئے کیا کروں۔

میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم دو بہن بھائی ہیں۔ بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ بھائی مجھ سے دس سال بڑے ہیں۔ بھائی کا رویہ مجھ سے بہت مشفقانہ ہے۔ پہلے بھی محبت کرتے تھے لیکن ابو کی وفات کے بعد تو وہ مجھے بہن سے زیادہ بیٹی سمجھتے ہیں۔

بھابھی کا رویہ بھی دوستانہ ہے لیکن وہ بہت کم گو ہیں زیادہ تر اپنے خیالوں میں گم رہتی ہیں۔ میں میڈیکل کی طالبہ ہوں۔ ایم بی بی ایس کر چکی ہوں۔ آج کل ہاؤس جاب کر رہی ہوں۔ ایک دن میں ہاسپٹل سے جلد گھر آ گئی دوپہر کا وقت تھا۔ گھر کی چابی میرے پاس ہوتی ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو گھر میں کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا، بھابھی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا تو جو کچھ دیکھا کاش نہ دیکھتی، میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بھابھی سے کچھ کہتی۔ کچھ دیر بعد بھابھی کمرے سے نکلیں۔ ان کے ساتھ ایک درمیانی عمر کا مرد تھا۔ دونوں نے لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پی۔ یک دم بھابھی کی نظر میرے جوتوں پر پڑی تو وہ گھبرا گئیں۔ اٹھ کر میرے کمرے میں آ گئیں۔ کہنے لگیں۔ میرے کزن ہیں آئے ہیں، امریکہ میں ہوتے ہیں تمہارے بھائی سے ملنے آئے تھے۔ میں خاموشی سے بھابھی کو دیکھتی رہی۔ تو وہ گھبرا کر واپس چلی گئیں۔ لیکن اس کے بعد میں نے بھابھی پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بھابھی فون پر بھی اس شخص سے باتیں کرتی ہیں اور وہ گھر پر بھی آتا ہے۔

اب میری سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں۔ بھائی کو بتا دوں تو ڈر ہے کہ بھابھی جواب میں مجھ پر ہی کوئی الزام نہ لگا دیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ بھائی غصہ میں کچھ نہ کر بیٹھیں یا مجھ پہ ہی یقین نہ کریں۔ بہت کشمکش میں ہوں۔ بھائی کی ابھی کوئی اولاد نہیں ہے۔ آگے جا کر بچے ہو گئے تو ان کے پیروں میں زنجیر پڑ جائے گی۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ پڑوسیوں نے کئی بار اشاروں میں مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جو میں سمجھ ہی نہ سکی۔

ج۔ اچھی بہن......! آپ کا مسئلہ اتنا حساس ہے کہ پہلی بار خود کو بے بس پا رہا ہوں، رشتوں کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ لیکن جو کچھ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کو نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے۔ جبکہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ آپ یہ سوچیں کہ اگر خاموش رہتی ہیں تو کب تک یہ بات چھپی رہے گی۔ ایک نہ ایک دن ضرور سامنے آئے گی کیونکہ برائی خواہ سات پردوں میں چھپا کر کی جائے کبھی چھپتی نہیں۔ جیسا کہ آپ نے کہا کہ پڑوسی مشکوک ہو رہے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی کو بتا دیں لیکن حکمت عملی کے ساتھ، پوری بات نہیں صرف اتنی کہ وہ بھابھی پر نظر رکھیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے کہ بھائی بھی کچھ نہ کچھ مشکوک ضرور ہوں گے۔ میاں بیوی کے درمیان کوئی تیسرا آ جائے تو دونوں فریقوں کو کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے بھائی کا ردعمل دیکھ کر فیصلہ کریں کہ انہیں پوری بات بتانا ہے یا نہیں۔ اگر وہ اشتعال میں آ کر آپ کو جھٹلاتے ہیں تو فی الحال خاموشی اختیار کر لیں۔

☆☆

امت صبور

نوشابہ فرید...... بہاولپور

س: کیل مہاسے اور چہرے کے داغ دھبوں کے لیے کوئی گھریلو ٹوٹکا بتا دیں؟

ج: بیکنگ سوڈا مہاسوں اور بلیک ہیڈز کے لیے بہترین علاج ہے۔ یہ چہرے کی مردہ جلد کو اور کھلے مساموں کو صاف کرنے میں مدد کرتا ہے۔
بیکنگ سوڈے میں اینٹی بیکٹریل خصوصیات بھی ہوتی ہیں جو مزید کیل مہاسوں کو نکلنے سے روکتی ہیں۔

ایک چمچہ لیموں کا رس اور ایک چمچہ بیکنگ سوڈا لیں اور اچھی طرح مکس کرلیں۔ جب پیسٹ سا بن جائے تو ایک طرف رکھ دیں۔ اپنے چہرے اور ہاتھوں کو صابن سے اچھے طرح دھولیں۔ کپڑے سے صاف کرتے ہوئے ہلکی سی نمی چہرے پر رہنے دیں۔ چہرے پر ہلکے ہاتھ سے اس پیسٹ سے ایک سے دو منٹ تک مساج کریں اور ایک منٹ چہرے پر لگا رہنے دیں۔ چہرے کو گرم پانی سے دھولیں۔ دوسری مرتبہ ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھوئیں اور تولیہ سے صاف کرلیں۔ آخر میں موئسچرائزر ضرور استعمال کریں سوڈے کے استعمال کے آپ کی جلد خشک بھی ہوسکتی ہے۔

بیکنگ سوڈے اور لیموں کے رس میں بلیچنگ خصوصیات ہوتی ہیں۔ جو داغوں کو ہلکا کرنے اور مٹانے میں مدد کرتا ہے۔ یہ جلد کو رنگت کو بھی یکساں ہموار کرتا ہے۔ آدھا چمچہ بیکنگ سوڈے میں ایک چمچہ لیموں کا رس ڈال کر مکس کرلیں۔ ایک سے دو منٹ تک چہرے پر لگائیں اور ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

ماریہ سلطان...... کراچی

س: میری آنکھوں کے گرد جھریاں پڑ رہی ہیں میری دوست نے مجھے آئی کریم لگانے کا مشورہ دیا ہے کیا یہ ٹھیک ہے؟ میری عمر اٹھائیس سال ہے۔ کیا ان جھریوں کو کم کیا جاسکتا ہے۔

آنکھوں کے نیچے والی جلد جسم کا وہ حساس حصہ ہے جو سب سے پہلے جھریوں اور لکیروں سے متاثر ہوتا ہے۔ جب ہم ہنستے یا مسکراتے ہیں تو آنکھوں کے گرد لائنیں سی پڑ جاتی ہیں۔ یہ لائنیں کچھ عرصے میں جھریوں کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ ان لائنوں کی وجہ خشکی تیز دھوپ، نیند کی کمی، غیر متوازن غذا وغیرہ ہوسکتی ہیں۔

آپ بازار سے ایسی آئی کریم خرید لیں۔ جس میں کیفین، وٹامن سی، وٹامن اے، سلیکون اور اینٹی اکسیڈنٹ جیسے اجزا ضرور ہوں۔

آئی کریم لگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تھوڑی سی مقدار انگلی پر نکالیں اور نقطوں کی صورت میں پہلے آنکھوں کے نچلے حصے میں اور پھر پلکوں کے اوپر لگائیں۔ اس دوران آنکھوں کو رگڑنے سے گریز کریں۔ آئی کریم کی زیادہ مقدار لگانے سے بھی پرہیز کریں۔ آئی کریم لگانے کے بعد فریج میں رکھیں فریج میں رکھی ہوئی کریم آنکھوں کی سوجن اور تھکاوٹ کم کرنے میں زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔

سامیہ منیر...... منڈی بہاؤالدین

س: سردیاں شروع ہونے والی ہیں۔ لیکن میری ایڑیاں ابھی سے پھٹنے لگی ہیں۔ کوئی آسان گھریلو ٹوٹکا بتا دیں۔

آپ ایلوویرا لیں اس کا گودا اچھی طرح پھینٹ لیں۔ چوتھائی کپ کیسٹر آئل اور ہم وزن تل کا تیل اچھی طرح مکس کرکے رکھ لیں۔ اس کو روزانہ رات سوتے وقت لگائیں۔ صبح پاؤں دھولیں۔

☆☆

Scanned with CamScanner